بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

بندگی صرف اللہ کی

تم کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ (انعام 6:162)

اور ہر نماز کے وقت اپنے منہ سیدھے کرو (یعنی قبلہ کی طرف اور سچے دل سے متوجہ ہو کر) اور خالص اس کے بندے ہو کر اس کو پکارو جیسا تم کو پہلے پیدا کیا ہے دوسری بار بھی پیدا کرے گا (مرنے کے بعد) (اعراف 7:29)

رسول ﷺ کا فرمان

عبادت میں جبر نہیں

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: درست طریقہ یہ ہے کہ جب تک جی لگے بہ تازگی ہوش و حواس نماز پڑھیں اور جب تھک جائیں تو بیٹھ کر آرام کریں۔" (اور تھکاوٹ دور ہونے کے بعد نماز ادا کریں)۔

(صحیح بخاری کتاب 19۔ باب 18 مسلم کتاب صلاۃ۔ باب 31)

ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے سامنے میں نے ایک عورت کی تعریف کی (کہ سوتی نہیں نماز پڑھتی رہتی ہے۔) آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کوئی خوبی نہیں ہے، صرف ایسے عملوں کی ذمہ داری اپنے اوپر ڈالو جن کو پورا کرنے کی طاقت رکھتے ہو۔"

(صحیح بخاری کتاب 2۔ باب 32 مسلم کتاب صلاۃ۔ باب 31)

اردو ڈائجسٹ
www.urdudigest.pk

اپریل 2013ء
جمادی الثانی 1434ھ
جلد نمبر 53 شمارہ نمبر 4

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر اختر عباس
مجلس تحریر حافظ فروغ حسن، سید عاصم محمود، صفیہ ہاشمی
نویداسلام صدیقی، سلمٰی اعوان
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی **انچارج کمپیوٹیشن** افنان کامران قریشی
تحقیق و ترتیب محمد شہباز، محمد تنویر، رانا احمد رضا **کمپوزر** اشرف سکندر
پروف خوان کلیم اللہ فاروقی **معاونین** غلام سجاد، عطا انور

مارکیٹنگ/اشتہارات
advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ	زکی اعجاز قریشی	0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ	احمد فیاض	0322-7474010
لاہور	محمد حامد	0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ	احسان اللہ بٹ	0300-9620294

سالانہ خریداری
subscription@urdu-digest.com فون: +92-42-37589957

اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

330 روپے کی بچت

پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
بیرون ملک 50 امریکی ڈالر

URDU DIGEST Current A/C No. 600380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت 90 روپے

مینیجنگ ایڈیٹر نوٹ

محترم قارئین ——— آداب

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس ماہ حروف کا سائز (فونٹ) اور سطروں کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا گیا ہے نیز لے آؤٹ ڈیزائن میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ہمارے کچھ قارئین پچھلے چند ماہ سے ان تبدیلیوں کا مشورہ دے رہے تھے۔ ان کو بصارت کی کمزوری یا فونٹ سائز چھوٹا ہونے کی وجہ سے پڑھنے میں دقت آرہی تھی۔

آپ کو یہ تبدیلیاں کیسی لگیں، ہمیں ای میل، فیس بک یا خطوط کے ذریعے ضرور آگاہ کریں تاکہ ہم ان کو جاری رکھتے ہوئے مزید بہتری لاسکیں۔

ہم اردو ڈائجسٹ کو متنوع اور بلند تر معیار پر رکھنے کا عزم رکھتے ہیں اس سلسلے میں ہمیں آپ کا مستقل تعاون درکار ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ ہمیں تجویز کریں کہ موجودہ موضوعات کے علاوہ آپ کی دلچسپی کے کون سے موضوعات کو اردو ڈائجسٹ کے صفحات کی زینت بننا چاہیے۔

آپ کو یاد ہوگا ہم نے اردو ڈائجسٹ کو انٹرنیٹ کے ذریعے قارئین تک پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری محنت رنگ لائی اور اب 45 ملکوں میں موجود لاکھوں اردو پڑھنے والے قارئین اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ کو انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے کمپیوٹروں پر باقاعدگی سے پڑھ رہے ہیں اور اپنی مادری زبان سے جڑے ہوئے ہیں۔

urdudigest.pk پر پچھلے کئی ماہ کے میگزین ای لائبریری میں موجود ہیں تاکہ نئے پڑھنے والے ان سے استفادہ کرسکیں۔ ہم نے مضامین کو آپ کی سہولت کے لیے مختلف کیٹیگریز میں بھی تقسیم کر دیا ہے۔

آپ اپنے پسندیدہ شعرا کا کلام بھی ہمارے پورٹل کے ذریعے پڑھ سکتے ہیں۔ نئی نسل کو اردو زبان کے قریب لانے، اپنے کلچر اور مذہبی اقدار سے روشناس کرانے کے لیے ہم دن رات مصروف ہیں اور ہم اپنی پوری توانائی اردو ڈائجسٹ کے پرنٹ میڈیا ان صفحات اور ڈیجیٹل (انٹرنیٹ اور فیس بک) دونوں ذریعوں پر صرف کر رہے ہیں تاکہ انھیں بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

اس ماہ کے لیے میرا انتخاب

- افضل گرو کی پھانسی
- آئی جی پولیس کا مفرور بیٹا
- نایاب دھاتیں (Rare Earth)

پچھلے دنوں ہندوستان گیا تو وہاں کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر دو موضوعات کی یلغار تھی۔ ایک افضل گرو کی پھانسی جس سے وہاں کی عدالتوں کا مسلمانوں سے متعصب رویہ ظاہر ہو رہا تھا اور دوسرا ایک طاقتور آئی جی کے مفرور بیٹے کو قانون کی گرفت میں لا کر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا تھا۔ ہمیں انتظار ہے کہ شاہ زیب کے قاتل کب اپنے انجام کو پہنچیں گے اور طاقتور اور غریب سے مساوی سلوک ہو گا۔ دونوں مضامین بہت اہم اور ہمارے قارئین کے لیے دلچسپ اور معلومات میں اضافہ کا باعث بنیں گے۔

تیسرا مضمون قارئین کے لیے یقیناً حیرت لیے ہوئے ہے۔ ہم اب تک سونا، ہیرے، آئل وغیرہ کو ہی قیمتی سمجھتے تھے لیکن رب تعالیٰ نے ان سے بھی زیادہ قیمتی خزانے کائنات میں رکھے ہوئے ہیں۔

طیب اعجاز قریشی
tayyab.aijaz@urdu-digest.com

فہرست

فہرست

اپریل 2013

نگران وزیر اعظم کا خوش آئند انتخاب

پاکستان الیکشن کمیشن کی طرف سے نگران وزیر اعظم کے طور پر جناب جسٹس (ر) میر ہزار خاں کھوسو کا نوٹیفکیشن جاری ہونے سے بیک وقت ہماری انتخابات کی تاریخ میں ایک عظیم الشان باب کا اضافہ اور قومی یک جہتی کی شاہراہ پر ایک روشن سنگِ میل تعمیر ہوا ہے۔ ماضی میں نگران وزیر اعظم کا تقرر صدرِ مملکت کرتے آئے ہیں، مگر بیسویں دستوری ترمیم نے یہ اختیار پہلے مرحلے میں وزیر اعظم اور اپوزیشن لیڈر، دوسرے میں آٹھ رکنی پارلیمانی کمیٹی اور آخری مرحلے میں پاکستان الیکشن کمیشن کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ پہلے دو مرحلوں میں سیاست دان کسی ایک نام پر متفق نہ ہو سکے، تو الیکشن کمیشن نے دیے ہوئے چار ناموں پر پارلیمانی پارٹی کی تین روزہ کارروائی کی روشنی میں فاضل جسٹس (ر) میر ہزار خاں کھوسو کے حق میں اکثریتی فیصلہ سنایا جن کے بارے میں سب سے کم اعتراضات ریکارڈ پر تھے۔ ایک معزز رکن نے اکثریتی فیصلے کے خلاف اختلافی نوٹ قلم بند کیا اور یوں پورا پراسس شفاف طریقے سے تکمیل پذیر ہوا۔ اس فیصلے سے ایک طرف ان عناصر کو شکست ہوئی جو سیاسی جماعتوں کے مابین عدم اتفاق سے اس تاثر کو ہوا دے رہے تھے کہ اب انتخابات دو تین سال کے لیے مؤخر ہو جائیں گے، تو دوسری طرف نگران وزیر اعظم کے لیے ایک ایسی مضبوط شخصیت کا چناؤ کیا گیا جو پاکستان سے لازوال وابستگی کے ساتھ ساتھ قوم پرست جماعتوں سے بھی سماجی تعلقات کی شہرت رکھتی ہے۔ ہم بجا طور پر امید کر سکتے ہیں کہ وہ سردار اختر مینگل سمیت تمام قوم پرست زعماء کو مذاکرات کے ذریعے انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ کر لیں گے اور یوں بلوچستان قومی دھارے میں شامل ہو جائے گا۔

اس ضمن میں سب سے اطمینان بخش امر یہ ہے کہ نگران وزیر اعظم کے انتخاب کا تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے خیر مقدم کیا ہے اور جناب نواز شریف کا کردار اس اعتبار سے بہت قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے الیکشن کمیشن کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا حالانکہ فاضل جسٹس کھوسو کا نام پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں نے پیش کیا تھا۔ آئین کی اس زبردست پاسداری اور سیاسی وسعتِ قلبی نے قوم کو بڑا حوصلہ دیا ہے اور یہ توقع پیدا ہوئی ہے کہ آنے والے مراحل بھی خوش اسلوبی سے طے پا جائیں گے اور ہمارے نگران وزیر اعظم کابینہ کی تشکیل، ایگزیکٹو اختیارات کے استعمال میں غیر جانب داری اور میانہ روی کی روایت قائم کریں گے اور اپنی تمام تر توجہ شفاف انتخابات کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے پر مرتکز رکھیں گے۔ ہم گزشتہ کئی ماہ سے لکھتے آئے ہیں کہ نگران وزیر اعظم کا انتخاب صوبۂ بلوچستان سے ہونا چاہیے کہ وہ حقیقی بلوچ قیادت سے محروم چلے آنے کے باعث شدید احساسِ محرومی اور غیر ملکی طاقتوں کی سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

ہم الیکشن کمیشن کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ اس نے ہمارے قومی جذبات کا احترام کرتے ہوئے بلوچستان سے نگران وزیر اعظم کا انتخاب کیا اور صدرِ مملکت کو ایڈوائس دینے کے بجائے نگران وزیر اعظم کے تقرر کا خود نوٹیفکیشن جاری کر کے نئی آئینی منزل کا واضح تعین کر دیا ہے۔

الطاف حسن قریشی

کڑی دھوپ میں گیارہ مئی کا سفر

شفاف اور آزادانہ انتخابات ہماری سیاسی شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔
ماضی کے تجربات کی روشنی میں نگران حکومتوں‘ سیاسی جماعتوں اور فوجی رہنماؤں کو
ان غلطیوں اور زیرِ زمین بارودی سرنگوں سے محفوظ رہنا ہو گا جو قومی تباہی کا باعث بن سکتی ہیں۔
شفاف انتخابات کے لیے ایک فول پروف روڈ میپ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

انتخابات کی تاریخ اور شیڈول کا اعلان ہو چکا ہے‘ نگران وزیراعظم کا تقرر بھی ہو گیا ہے‘ جناب راجہ پرویز اشرف وزیراعظم ہاؤس سے رخصت ہو چکے ہیں‘ مگر کچھ حلقے بدستور انتخابات کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ نگران وزیراعظم کی ذات میں طرح طرح کے کیڑے نکال رہے ہیں اور یہ تاثر دے رہے ہیں کہ آنے والے ہفتوں میں بہت خون خرابہ ہونے والا ہے‘ جس کی ہولناکیوں میں انتخابات بھسم ہو جائیں گے اور تیسری طاقت کو حرکت میں آنا پڑے گا۔ بعض سیاسی نجومی جنرل (ر) پرویز مشرف کی آمد میں ایک سے زائد خطرے ڈھونڈ رہے ہیں اور اس خیال تک پہنچے ہیں کہ وہ ایم کیو ایم کے ذریعے ایک طوفان اٹھانے کی ریہرسل کرتے آئے ہیں جس نے پانچ برس گزرنے سے ذرا پہلے حکومت سے کنارہ کشی ایک طے شدہ منصوبے کے تحت اختیار کی۔ اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں سندھ کے اندر جو نگران وزیراعلیٰ چنے گئے ہیں‘ وہ پاور پالیٹکس میں ٹائم بم ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ جو داخلی اور خارجی قوتیں پاکستان میں عدم استحکام دیکھنا چاہتی ہیں ان کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ پُرامن انتقالِ اقتدار نہ ہونے پائے اور سیاسی جماعتوں کے مابین دشمنیوں اور نفرتوں کو اس قدر ہوا دی جائے کہ وہ انتخابات کے میدان میں اپنے ہی ہاتھوں ڈھیر ہو جائیں۔ اس حوالے سے الیکشن کمیشن کے خلاف اٹھنے والی آوازیں بھی تشویش کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے چودھری شجاعت حسین نے اس قومی ادارے پر عدم اعتماد کا اظہار کیا‘ پھر شیخ الاسلام نے ”سک مکا“ کا ہنگامہ اٹھایا اور اب ایم کیو ایم کراچی میں حلقوں کی نئی حد بندیوں کے خلاف عدم اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی راہ پر چل نکلی ہے۔

ممکن ہے کہ الیکشن کمیشن کی ماضی میں کارکردگی بہت مثالی نہ رہی ہو اور نگران وزیراعظم اپنی پیرانہ سالی کے سبب موضوعِ گفتگو بنے ہوں‘ مگر یہ وقت مسائل کو اُلجھانے کے بجائے انہیں سلجھانے کا ہے۔ قوم نے انتخابات کا پل صراط عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے‘ تمام سیاسی جماعتیں عوام کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں اور امیدواروں کو ٹکٹ جاری کر رہی ہیں۔ عدلیہ‘ میڈیا اور فوج کے اہم ادارے بروقت انتخابات کے انعقاد میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہیں۔ الیکشن کمیشن اور نادرا نے انتخابی فہرستوں کی تیاری میں قابلِ قدر کام کیا ہے‘ البتہ اہلِ کراچی ان میں بیشتر خامیوں کی نشان دہی کرتے آئے ہیں اور حلقوں کی نئی حد بندیوں سے بھی غیر مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ تجربات کی روشنی میں اور سیاسی شعور کی تربیت کے ساتھ ساتھ معاملات میں بہتری آتی جائے گی اور ہمارے اجتماعی رویوں میں نظم و ضبط قائم ہو گا۔ اب صاف نظر آ رہا ہے کہ حالات میں پیچیدگی اور ان کی سنگینی کے باوجود انتخابات وقت پر اور ماضی کے مقابلے میں بڑی حد تک شفاف اور منصفانہ ہوں گے۔

☆☆☆

دراصل ہماری تاریخ میں دیانت دارانہ اور منصفانہ انتخابات کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں‘ اس لیے ہمارا اجتماعی ضمیر یہ مان لینے کے لیے آسانی سے آمادہ نہیں ہو رہا کہ اس بار واقعی وہ شفاف ہوں گے۔ ہمارے ہاں پہلے عام انتخابات دسمبر 1970ء میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خاں کے دورِ حکومت میں ہوئے جن کے بارے میں یہ تاثر پھیلایا گیا کہ وہ انتہائی آزادانہ اور منصفانہ تھے جبکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے اپنے سیاسی مخالفین کو طاقت کے بل پر پولنگ اسٹیشنوں تک آنے ہی نہیں دیا۔ نوجوانوں کے جتھوں نے ایسی دہشت پھیلائی کہ سیاسی حریفوں کے لیے ووٹ ڈالنا مقتل میں جانے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان انتخابات میں صرف نورالامین اور راجہ تری دیو رائے کامیاب ہو سکے جن کا اپنا بہت بڑا قبیلہ اور زبردست سیاسی حمایت حاصل تھی۔ مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب میں وہ دھاندلی ہوئی کہ الامان الحفیظ! خواتین کے غول کے غول گاڑیوں میں ایک پولنگ اسٹیشن سے دوسرے پولنگ اسٹیشن پر جاتے اور بے دھڑک آزادانہ انتخابات کی دھجیاں اڑاتے۔ پولنگ کا عملہ نظریاتی طور پر تقسیم تھا اور نوجوان بھٹو مرحوم کے اسی طرح شیدائی تھے جس طرح آج کل عمران خاں پر فریفتہ بتائے جاتے ہیں۔ ہم نے پندرہ اور سولہ برس کے لڑکوں کو بھی جعلی ووٹ بھگتانے کا ”عظیم فریضہ“ ادا کرتے دیکھا۔ اس ”فری فار آل“ انتخابات کے نتائج سامنے آئے‘ تو ملک دولخت ہو گیا اور مغربی پاکستان جسے بھٹو صاحب ”نیا پاکستان“ کہتے تھے ایک سیاسی جماعت کے تسلط میں چلا گیا جس کی سول آمریت عوام کے لیے بڑی اذیت ناک ثابت ہوئی۔

دوسرے عام انتخابات مارچ 1977ء میں ہوئے جب قومی اسمبلی نے اپنی آئینی مدت مکمل کر لی تھی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اس کا پہلا اجلاس فروری 1972ء میں ہوا اور عام انتخابات کا اعلان 1977ء کے آغاز میں وزیراعظم

جناب ڈیڈا ے بھٹو نے کیا۔ پیپلز پارٹی نے اپنی انتخابی جیت قائم کرنے کے لیے اپنے وزیر اعظم اور چاروں وزرائے اعلیٰ کو بلا مقابلہ منتخب کرانے کے منصوبے پر نہایت بھونڈے طریقے سے عمل کیا جس کے باعث انتخابات کا پورا ڈھانچہ لرز اُٹھا اور اپوزیشن کی جماعتوں میں شدید ردِعمل پیدا ہوا جو پی این اے کے پلیٹ فارم پر متحد ہو چکی تھیں۔
انھوں نے 7 مارچ کے انتخابی نتائج مسترد کرتے ہوئے تین روز بعد ہونے والے صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ 10 مارچ کے دن پورے ملک میں پولنگ اسٹیشن ویران پڑے تھے، مگر رات کے وقت نشر کیے جانے والے انتخابی نتائج میں ہر حلقے سے ووٹروں کی تعداد اسی نوے ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ یوں فریب کاری اور دغا بازی کا سارا پردہ چاک ہو گیا۔ نے انتخابات کی عوامی تحریک مارشل لا پر منتج ہوئی اور ایک "متنازع فیہ" عدالتی فیصلے کے مطابق جناب ذوالفقار علی بھٹو سولی چڑھا دیے گئے جو بلاشبہ ایک انتہائی دردناک واقعہ تھا۔ ضیاء الحق کی شہادت کے بعد صدر غلام اسحٰق خاں کے زیرِ اہتمام 1988ء میں جو انتخابات ہوئے اُن میں جھرلو کی بہت کم شکایات سامنے آئیں۔ مرکز میں بے نظیر صاحبہ نے حکومت تشکیل دی جبکہ میاں نواز شریف آئی جے آئی کی چھتری تلے پنجاب کی حکومت بنانے میں کامیاب رہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صدر غلام اسحٰق خاں نے دستوری تقاضے کو نظر انداز کرتے ہوئے نگران وزیر اعظم کا تقرر ہی نہیں کیا جس سے اُن کے سیاسی عزائم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت برطرف اور اسمبلیاں تحلیل ہونے کے بعد عام انتخابات اکتوبر 1990ء میں منعقد ہوئے جن کے نگران وزیر اعظم اپوزیشن لیڈر غلام مصطفیٰ جتوئی تعینات کیے گئے جس سے صدرِ مملکت جناب غلام اسحٰق خاں کا مائنڈ سیٹ پوری طرح عیاں تھا۔ جناب نواز شریف وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے جبکہ اپوزیشن لیڈر کے طور پر محترمہ نے انتخابات میں "پری پول رگنگ" کے الزامات عائد کیے۔ نواز شریف کی حکومت کی برطرفی اور عدالتِ عظمیٰ سے اُس کی بحالی کے بعد 1993ء کے آخر میں جو عام انتخابات ہوئے، اُن کے لیے نگران وزیر اعظم امریکہ سے جناب معین الدین احمد قریشی درآمد کیے گئے جنھوں نے آئی ایم ایف سے پاکستان کے مفادات کے منافی معاہدہ کر ڈالا اور اپنے "سخت گیر" اقدامات سے قومی سیاست کا توازن بگاڑ دیا۔ بے نظیر بھٹو انتخابات جیت گئیں جبکہ نواز شریف نے "انجینئرڈ رگنگ" کا الزام لگایا۔ فروری 1997ء کے انتخابات میں صدرِ مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری نے ملک معراج خالد کو نگران وزیر اعظم بنایا اور ماہِ رمضان کی وجہ سے ووٹوں کا ٹرن آؤٹ بہت کم رہا۔ پیپلز پارٹی کی انتہائی خراب کارکردگی کے باعث اس کا صفایا ہو گیا اور نواز شریف دوتہائی مینڈیٹ لے کر دوسری بار وزیر اعظم منتخب ہو گئے جن کے خلاف جنرل مشرف نے بغاوت کر کے 12 اکتوبر 1999ء کی رات اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ 2002ء کے عام انتخابات انہی کے زمانۂ اقتدار میں ہوئے جن میں دونوں بڑے سیاسی قائدین جلاوطن ہونے کے سبب حصہ نہ لے سکے اور آئی ایس آئی، رینجرز اور دوسرے خفیہ اداروں اور سول انتظامی مشینری

نے پری پول اور پوسٹ رگنگ کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ بندوق کی نوک پر سیاسی وفاداریاں تبدیل کرائی گئیں۔ اس کے باوجود بہت کھینچ تان کر صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے جناب میر ظفر اللہ خاں جمالی قائدِ ایوان منتخب کرائے جا سکے۔ بعد میں اُن سے استعفیٰ لے کر جناب شوکت عزیز کے لیے وزارتِ عظمیٰ کا راستہ ہموار کیا گیا۔
فروری 2008ء کے انتخابات بھی جنرل پرویز مشرف کے دورِ صدارت میں ہوئے، مگر اس وقت اُن کی جگہ جنرل اشفاق پرویز کیانی فوجی کمان سنبھال چکے تھے جنھوں نے اپنے تمام اداروں کو انتخابات سے الگ تھلگ رہنے کی سختی سے ہدایات جاری کی تھیں۔ اُن پر عمل درآمد نہیں ہوا، مگر وہ سیاسی طاقتیں جو فوجی آمریت کا دودھ پی کر خوفناک عفریت بن چکے تھے، انھوں نے عوام کا مینڈیٹ چیر پھاڑ ڈالا اور کراچی میں مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کی طرح ایم کیو ایم نے اپنے سیکٹر کمانڈروں کی طاقت پر انتخابی عملے کو یرغمال بنا لیا۔ جماعتِ اسلامی کے انتخابی بائیکاٹ نے اُن کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا جبکہ پیپلز پارٹی بھی شہر میں ابھی غیر منظم تھی اور اے این پی کا وجود اُس وقت فقط برائے نام تھا۔ کھلی اور بے روک ٹوک دھاندلی کے باعث بعض انتخابی حلقوں میں بیلٹ بکسوں سے ووٹ فہرستوں میں درج شدہ ووٹوں سے بھی کہیں زیادہ برآمد ہوئے۔ دراصل جنرل مشرف نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے ایم کیو ایم کو پوری چھوٹ دے رکھی تھی اور اُس کی خواہش کے مطابق انتظامیہ نے انتخابی حلقوں کی حدبندیاں کی تھیں۔ نگران وزیر اعظم جناب محمد میاں سومرو جو سینیٹ کے چیئرمین بھی تھے، انھوں نے غالباً صدر مشرف کے اشارے پر کراچی کے معاملات جوں کے توں رہنے دیے۔ ایم کیو ایم کے اندر جو ایک فسطائی مافیا ہے، اُس نے اسلحے کے زور پر 2008ء کے انتخابات میں 25 نشستیں حاصل کر لیں اور اُن کی طاقت سے پیپلز پارٹی کو نگنی کا ناچ نچایا، کیونکہ اُس کی پارلیمانی حمایت کے بغیر مرکز میں حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ کراچی کے شہری ایم کیو ایم کی بھتہ خوری، دہشت گردی اور خونیں کھیل سے تنگ آ چکے ہیں اور سالہا سال سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ انتخابی فہرستیں درست، انتخابی حلقوں کی معروف معیارات پر حدبندی اور سیاسی جماعتوں کے عسکری ونگ ختم کیے جائیں۔ عدالتِ عظمیٰ نے انتخابی فہرستوں کی درستی اور نئی حدبندیوں کے احکام دو سال پہلے صادر کیے، مگر ایم کیو ایم اور بیوروکریسی نے الیکشن کمیشن کو مسلسل دباؤ میں رکھا جس کی وجہ سے بروقت مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکے۔ اس غیر جمہوری طرزِ عمل کے خلاف بیس کے لگ بھگ سیاسی جماعتوں کے قائدین ٹرین مارچ پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے کراچی سے اسلام آباد تک پورے ملک میں پری رگنگ کے خلاف بیداری کی لہر اٹھانے کی ایک پُرامن اور جمہوری کوشش کی ہے جس نے ایم کیو ایم کے اندر بھی خاصا بڑا شگاف ڈال دیا ہے۔

☆☆☆

2008ء کے انتخابات کے حوالے سے بلوچستان کے اندر عام شکایت یہ پائی جاتی ہے کہ ایجنسیوں نے زیادہ تر اپنی پسند کے لوگ منتخب کرائے جو پانچ سال تک ہر طرح کی لوٹ مار میں لگے رہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے

انھیں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے سرکاری خزانے کے منہ کھول دیے اور ایک ایک ایم پی اے ترقیاتی فنڈز کے نام پر سالانہ پچیس کروڑ وصول کرتا اور عوام کا خون چوستا رہا۔ ان انتخابات کے بارے میں مولانا فضل الرحمٰن بھی بار بار یہ شکایت کرتے رہے کہ اُن کی جماعت کو امریکی سازش کے تحت خیبر پختون خوا میں ہرایا گیا۔ یہ حقائق ثابت کرتے ہیں کہ ماضی میں انتخابات کا عمل آزادانہ اور شفاف نہیں تھا اور عوام حقیقی نمائندگی کی برکات سے محروم ہی رہے۔ وہ معاشرہ جس میں نوے فی صد آبادی دس فی صد ساہوکاروں، جاگیرداروں، سرداروں، چودھریوں اور تمن داروں کی محتاج ہو، وہاں آزادی سے اور ضمیر کے مطابق ووٹ ڈالنے کے امکانات کچھ زیادہ روشن اور تابناک نہیں، تاہم جمہوریت سے وابستگی پاکستانیوں کی گھٹی میں ہے کہ ہمارا ملک جمہوری عمل ہی سے وجود میں آیا اور اسلام ہمیں اپنے اجتماعی امور مشاورت کے ذریعے چلانے کا حکم دیتا ہے۔ اس پہلو سے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ انتخابات کو زیادہ سے زیادہ معتبر اور شفاف بنانے اور نظام کے اندر زیادہ سے زیادہ بہتری لانے کی جدوجہد حکمت اور تدریج کے ساتھ جاری رکھیں۔

انتخابات کا عمل شروع ہو چکا ہے، چنانچہ ہمیں بے ہنگم خواہشات اور توقعات کے سراب میں سرگرداں رہنے کے بجائے حقیقت پسندی اور بالغ نظری سے کام لینا چاہیے۔ بلاشبہ عوام کے اندر تبدیلی کی زبردست خواہش موجزن ہے اور وہ انتخابات کے ذریعے ایک ایسی دیانت دار اور اہل قیادت کے متمنی ہیں جو پاکستان کو ایک باوقار مقام اور اُس کے شہریوں کو ایک باعزت اور پُرامن زندگی کی ضمانت دے سکے۔ جس کے قوی امکانات پیدا ہو رہے ہیں، کیونکہ تمام سیاسی جماعتوں تک یہ پیغام پوری صراحت سے پہنچ گیا ہے کہ انہیں امیدواروں کو ٹکٹ دیتے وقت پوری احتیاط سے کام لینا اور عوام کے جذبات کا احترام کرنا ہو گا۔ الیکشن کمیشن نے مختلف اداروں کے تعاون سے ایک ایسا میکانزم وضع کر لیا ہے جس کے ذریعے بدعنوانوں کی ازخود چھانٹی ہو جائے گی اور اب وہی لوگ انتخابات کے میدان میں اترنے کا حوصلہ کریں گے جن کے مالی معاملات اور ذاتی اوصاف عوام کی نظر میں درست، شفاف اور معتبر ہوں گے۔ اس دفعہ سول سوسائٹی اُمیدواروں کے کوائف معلوم کرنے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے اور خراب شہرت کے افراد کو انتخابی عمل سے الگ تھلگ رکھنے کے لیے نوجوان رضاکار تیار کیے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

شفاف انتخابات کے لیے قوم کے اندر بے حد جوش و خروش پایا جاتا ہے اور میڈیا انتخابی ایشوز فراہم کر رہا ہے جبکہ نگران حکومتوں کے نئے آئینی عمل نے کچھ پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ نئے طریق کار کی بدولت ہمیں ایک ایسے 84 سالہ نگران وزیراعظم دستیاب ہوئے ہیں جو ملکی حالات سے یکسر بے خبر ہونے کا تاثر دے رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ صوبوں میں کون کون گورنر ہیں اور کتنے نگران وزرائے اعلیٰ حلف اٹھا چکے ہیں۔ الیکشن کمیشن کے فیصلے اور اُس کے اختیار کا احترام کرتے ہوئے بیشتر سیاسی قائدین نے ان کے تقرر کا خیر مقدم کیا ہے اور غالباً یہ امر

بھی پیش نگاہ رکھا ہے کہ اُن کا تعلق شورش زدہ صوبے بلوچستان سے ہے جہاں وہ ایک مثبت کردار ادا کر سکیں گے، مگر اُن کی حلف برداری کی تقریب میں بڑے سیاسی زعماء شریک نہیں ہوئے اور یہ پیغام دے گئے کہ وہ اُن سے ایک فاصلہ رکھنا چاہتے ہیں۔ قومی حلقوں میں یہ تاثر گردش کر رہا ہے کہ صدر زرداری ایک طے شدہ منصوبے کے تحت فاضل جسٹس (ر) میر ہزار خان کھوسو کو اس منصب پر لائے ہیں کہ وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے غیر فعال رہیں اور اُن کے نام پر پیپلز پارٹی کی حکومت کے اندر موجود افسران اسی طرح امورِ مملکت چلاتے رہیں جس طرح سندھ میں نگران وزیراعلیٰ جسٹس (ر) زاہد قربان علوی کے نام پر سارے کام صدر زرداری کے معتمد خاص اویس ٹپی اور اُن کے حواری سرانجام دے رہے ہیں۔ اُن کے نام پر اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم نے مضحکہ خیز ڈراما رچایا اور سندھ اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کا وہ منصب جو پونے پانچ سال سے خالی چلا آ رہا تھا اور فنکشنل لیگ جس کی دعوے دار تھی، تو اچانک ایم کیو ایم کے ارکان اسمبلی اپوزیشن کے بنچوں پر آن بیٹھے اور اسپیکر صاحب نے جناب سردار احمد کو اپوزیشن لیڈر مقرر کر دیا۔ یہ سارا واقعہ اسمبلیوں کی تحلیل سے فقط ایک ہفتہ پہلے رونما ہوا اور تحلیل کے فوراً بعد وزیراعلیٰ اور اپوزیشن لیڈر مشاورت کے لیے بیٹھے اور پیپلز پارٹی کی طرف سے دیے ہوئے نگران وزیراعلیٰ کے نام پر متفق ہو گئے جبکہ پیر پگارا، جناب نواز شریف اور سید منور حسن سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں۔ جسٹس (ر) زاہد قربان علوی کا تقرر سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا ہے، مگر وہ حلف بھی اُٹھا چکے ہیں اور اُن کے نام پر پورا کاروبار پہلے کی طرح چل رہا ہے۔

کچھ ایسا ہی تماشا بلوچستان میں بھی ہونے چلا تھا۔ وہاں بھی اپوزیشن لیڈر کا عہدہ تقریباً پانچ سال سے خالی چلا آ رہا تھا۔ وزیراعلیٰ نواب اسلم رئیسانی کی حکومت اسمبلی کے تحلیل ہونے سے ایک دو روز پہلے بحال ہوئی، تو جعل سازی اور ملی بھگت سے جمعیت علمائے اسلام کے مولانا عبدالواسع اپوزیشن لیڈر بنا دیے گئے جو حکومت میں سینئر وزیر تھے۔ اس آئینی خلاف ورزی پر بلوچستان ہائی کورٹ حرکت میں آئی اور اُس نے جناب طارق مگسی کو اپوزیشن لیڈر بن جانے کا حق دار قرار دیا اور یوں سازش کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ بعد ازاں وزیراعلیٰ اور اپوزیشن لیڈر نے تمام جماعتوں کے ساتھ مشاورت سے نواب غوث بخش باروزئی کو نگران وزیراعلیٰ بنانے پر اتفاق کیا۔ باروزئی صاحب جنوری 2013ء میں پائنا اور پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام بلوچستان قومی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی ذاتی شرافت اور پاکستان کے ساتھ گہری محبت کے اظہار سے حاضرین اور میڈیا کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اُن کے آباؤاجداد شاہ احمد ابدالی کی طرف سے ایک وسیع علاقے میں ٹیکس وصول کرتے تھے، اُن کے تقرر سے یہ اُمید برگ و بار لانے لگی ہے کہ وہ بلوچستان کو قومی دھارے میں لانے کے لیے ایک انتہائی قابلِ قدر کردار ادا کریں گے اور پاکستان جو ہم سب کا بہت پیارا گھر ہے، اُس کی ہر طرح سے حفاظت کا مشن آگے بڑھائیں گے۔ قومی حلقے اس امر پر بہت خوش ہیں کہ نگران حکومت کے سلسلے میں خیبر پختونخوا کی سیاسی قیادت نے بڑی پختگی اور معاملہ فہمی کا ثبوت

دیا ہے۔ حکومت اور اپوزیشن کی جماعتیں ایک دوسری کی شدید مخالف تھیں، مگر وزیراعلیٰ جناب امیر حیدر ہوتی اور اپوزیشن لیڈر جناب اکرم درانی مشاورت کے لیے سرجوڑ کر بیٹھے اور پہلی ہی نشست میں جناب جسٹس (ر) طارق پرویز کی شخصیت پر متفق ہو گئے۔ انھوں نے سیاست دانوں کی لاج رکھ لی ہے اور خوشگوار توقعات کی شمع روشن کی ہے کہ حکومتوں کا نیا آئینی نظام تجربات کی بھٹی سے گزر کر جڑ پکڑے گا یا پھر الیکشن کمیشن اس کی جگہ لے گا۔

☆☆☆

اچھی روایتوں کی پرورش میں وقت بھی لگتا ہے اور محنت بھی۔ ہمارے ارباب حل و عقد کے لیے شفاف انتخابات کو اوّلین ترجیح قرار دیتے ہوئے اُن کے مقاصد کا تعین بھی ضروری ہے۔ سب سے بڑا مقصد تو یہی ہونا چاہیے کہ انتخابات کے نتیجے میں قوم پہلے سے زیادہ متحد، سیاسی طور پر صحت مند اور پُرعزم دکھائی دے اور اس کی رگوں میں تازہ ولولوں کا خون دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگے۔ اس فلک گیر مشق کے نتیجے میں عوام اپنا قیمتی وقت فضول باتوں اور منفی سرگرمیوں میں ضائع کرنے کے بجائے اس کی قدروقیمت کا احساس کرنے لگیں، بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے ان میں توانائی اور جواں ہمتی کے چشمے پھوٹ نکلیں اور سیاسی جماعتوں کا مائنڈ سیٹ تبدیل ہوتا دکھائی دے۔ الغرض کچھ یوں محسوس ہونے لگے کہ اصل حکمران پاکستان کے اٹھارہ کروڑ عوام ہیں۔ غالباً اتنی بڑی تبدیلی ان انتخابات میں تو شاید نہ آسکے، مگر اس کی شروعات کی مضبوط بنیادیں رکھی جا سکتی ہیں۔ اس ضمن میں ہماری پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انتخابات انتشار کے بجائے استحکام کا باعث بنیں، تمام علاقے اور صوبے قومی دھارے میں شامل ہو جائیں اور انتہاپسندی اور دہشت گردی کے خلاف پوری قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہو۔ انتخابات میں قومی سلامتی، سیاسی شیرازہ بندی اور ملکی خودانحصاری کے بنیادی مسائل زیر بحث لائے جائیں تاکہ عوام کے اندر اپنے مستقبل کی تعمیر کا زبردست داعیہ اور گہرا شعور پیدا ہو اور ملک ذہنی اور سیاسی پس ماندگی سے نکل کر ایک زبردست معاشی طاقت بن سکے۔

نگران حکومتوں کا بنیادی فرض امن و امان کا قیام، شفاف انتخابات کا انعقاد اور پچھلے حکمرانوں کی ناجائز تجاوزات کا انہدام ہونا چاہیے۔ سابق وزیراعظم راجہ پرویز اشرف بڑے بڑے مناصب پر اپنے من پسند افراد تعینات اور سفارت خانوں میں درجنوں کمرشل اتاشی مقرر کر کے چلے گئے ہیں جن پر نگران وزیراعظم خط تنسیخ پھیر دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔ آخری دو تین ہفتوں کے دوران سابق حکومتوں نے بڑے پیمانے پر بیوروکریسی میں ردوبدل کیا ہے اور اپنے ہزاروں وفادار بینکوں میں بھرتی کر دیے گئے ہیں جو انتخابات پر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ 1993ء کے انتخابات میں پنجاب کے نگران وزیراعلیٰ جناب شیخ منظور الٰہی نے ضلع اور کمشنری کے تمام اعلیٰ افسر تبدیل کر دیے تھے۔ اس بار الیکشن کمیشن کی طرف سے تبادلوں اور تقرریوں پر پابندی لگا دی گئی ہے جو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ کئی کئی سال سے ایک ہی شعبے اور ایک ہی شہر میں کام کرنے والے اہل

کاروں کا فوری تبادلہ شفافیت کو فروغ دے گا۔ دراصل ایک غیرجانبدار انتظامیہ ہی منصفانہ انتخابات میں اعانت فراہم کر سکتی ہے۔ بیوروکریسی کی خودسری کا یہ عالم ہے کہ الیکشن کمیشن نے دو تین ہفتے پہلے سٹیٹ بینک کے ڈپٹی گورنر کو برطرف کرنے کا حکم دیا جن کے کراچی کے ایک بہت بڑے بزنس مین سے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ انتخابی امیدواروں کی چھان پھٹک پر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ اس کے حکم پر عمل درآمد سے پہلوتہی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ انھی گراں قدر ذمے داریوں کی بجا آوری کے لیے نگران وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کو بیساکھیوں کا سہارا لینے کے بجائے اپنے وجود کا نقش قائم اور غیرجانب داری کا تاثر گہرا کرنا ہوگا۔ قوم ان سے بہت ساری توقعات وابستہ کیے ہوئے ہے کہ ان کے زیرِ اہتمام ہماری تاریخ کے سب سے اہم اور فیصلہ کن انتخابات منعقد ہونے والے ہیں۔ پنجاب کے نگران وزیراعلیٰ جناب نجم سیٹھی نے حلف اٹھانے کے بعد جو پہلی پریس کانفرنس کی ہے، اس میں ان کا یہ پختہ عزم سامنے آیا ہے کہ وہ انتخابات پر اثرانداز ہونے والے بڑے سے بڑے افسر کو معاف نہیں کریں گے اور الیکشن کمیشن اور اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں پر کامل دیانت داری سے عمل پیرا ہوں گے اور ایک چھوٹی سی کابینہ کے ساتھ معاملات بڑی جاں فشانی سے چلائیں گے۔

☆☆☆

انتخابات میں سب سے بڑی اسٹیک ہولڈر سیاسی جماعتیں ہیں جنھیں عوام کی سیاسی تربیت اور انھیں قومی وحدت کی لڑی میں پرونے کے ساتھ ساتھ حکومت کی ذمے داریاں بھی سنبھالنا ہوتی ہیں، اس لیے ان پر لازم آتا ہے کہ وہ انتخابی مہم چلاتے وقت عوام کے جذبات بھڑکانے کے بجائے ان کے سیاسی شعور کی تربیت پر توجہ دیں تاکہ وہ سوچ سمجھ کر اپنے صحیح نمائندوں کا انتخاب کر سکیں اور ملکی مفادات کی نگہبانی کی ذمے داری خوش اسلوبی سے نباہ سکیں۔ اسی طرح انھیں ضابطہ اخلاق کی پابندی کرنا اور فضا کو پُرامن رکھنا ہوگا۔ اس کے علاوہ انھیں انتخابی اخراجات کو بے قابو ہونے سے بچانا اور پیسے کے منفی اثرات کی روک تھام کے لیے مثالی کردار ادا کرنا ہوگا۔ پولنگ کے دن دھاندلی کے سدباب کی سب سے مؤثر طاقت پولنگ ایجنٹ ہیں جن کی ہمہ پہلو تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے بیشتر سیاسی جماعتوں کو تربیت یافتہ افرادی قوت وافر تعداد میں دستیاب نہیں جس کی وجہ سے پولنگ اسٹیشنوں میں سیاسی دہشت گروہوں کو ٹھپے لگانے کا ایک موقع مل جاتا ہے۔ اس غنڈہ گردی کی روک تھام کا ایک محفوظ راستہ یہ ہے کہ متاثرہ سیاسی جماعتوں کی مشاورت سے حساس پولنگ اسٹیشنوں کے اندر فوجی تعینات کیے جائیں جو نظم و ضبط کا خیال رکھیں اور ''سیکٹر کمانڈروں'' کی غیرقانونی مداخلت کا مؤثر سدباب کریں۔ بیشتر مہذب ملکوں میں شفاف انتخابات کے لیے مقامی کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں جو وقفے وقفے سے اپنی حدود میں آنے والے پولنگ اسٹیشنوں کی نگرانی کرتی ہیں اور یوں سول سوسائٹی ایک حصار بنا لیتی ہے۔ آنے والے انتخابات کی غیرمعمولی اہمیت کے پیشِ نظر فوج، سول سوسائٹی اور میڈیا کو ہمہ وقت بیدار اور مستعد رہنا ہوگا کہ فتنہ پرور گھات لگائے

بیٹھے ہیں۔ میڈیا نے ماضی میں انتخابات کی مانیٹرنگ میں ایک حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے۔ صوبائی اسمبلی کی اُمیدوار وحیدہ شاہ جو وڈیرانہ مزاج کی مالک تھیں' انھوں نے ایک پولنگ اسٹیشن میں پریذائڈنگ آفیسر پر ہاتھ اُٹھایا جسے ٹی وی کیمرے نے محفوظ کر لیا اور پورے ملک میں زبردست احتجاج ہوا۔ عدالت نے اس فرعون صفت خاتون کو نااہل قرار دے دیا اور اُن کے آفتابِ اقتدار کو مستقل گہن لگ چکا ہے۔ ہمیں واثق اُمید ہے کہ آزاد میڈیا کی موجودگی میں نگران حکومتیں بھی اپنی حدود میں رہتے ہوئے مستعدی سے کام کریں گی اور بیکنگر کمانڈروں کو بھی اپنی روش بدلنا ہو گی۔

الیکشن کمیشن کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنے پاؤں بہت زیادہ پھیلانے کے بجائے اپنے آپ کو انتہائی اہم امور تک محدود رکھنے کی پالیسی اختیار کرے۔ پولنگ اسٹاف کا انتخاب اور اُس کی تربیت غیر معمولی توجہ کی متقاضی ہے جس پر اگرچہ نہایت عمدگی سے کام ہو رہا ہے' تاہم گزشتہ تجربات کی روشنی میں اصلاح اور بہتری کی بڑی گنجائش ہے۔ اساتذہ کے علاوہ انجینئرز اور دوسرے پروفیشنلز بھی انتخابی عملے میں شامل کیے جا سکتے ہیں جو سیاسی اثرات سے مقابلتاً آزاد اور انتخابات کو شفاف بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ سب سے بڑا چیلنج انتخابات پر اُٹھنے والے اخراجات کی مؤثر مانیٹرنگ کا ہو گا۔ الیکشن کمیشن نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے اُمیدوار کو بالترتیب پندرہ اور دس لاکھ روپے خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اور ایک علیحدہ بینک اکاؤنٹ کھولنے کی پابندی عائد کی ہے۔ امریکہ' برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں الیکشن کمیشن بنیادی طور پر انتخابی اخراجات کی مانیٹرنگ کو بنیادی اہمیت دیتا اور ضابطہ اخلاق پر اس کی روح کے مطابق پابندی کو اوّلین ترجیح قرار دیتا ہے۔ ہمارے الیکشن کمیشن کو بھی اُمیدواروں کی چھان پھٹک' انتخابی اخراجات پر کنٹرول کے علاوہ سول سوسائٹی کی مدد سے شفاف انتخابات کو یقینی بنانا ہو گا۔ دستور نے اُسے لامحدود اختیارات دیے ہیں' اُن کے صحیح اور بروقت استعمال سے وہ آزادانہ انتخابات کے لیے ایک سازگار ماحول تیار کر سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے عدالتِ عظمیٰ بھی اس کے ساتھ پورے قد سے کھڑی ہے۔

☆☆☆

تمام اہم اداروں' سیاسی شخصیتوں اور تنظیموں کو انتخابی عمل کو درپیش چیلنجز کا جائزہ لینا اور اُن سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی تدابیر پر غور کرنا ہو گا۔ بلاشبہ طالبان یا دوسرے علیحدگی پسند عناصر امن و امان میں خلل ڈال کر بہت بڑا فساد برپا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہمیں اس خطرے سے خوفزدہ ہونے کے بجائے قوتِ ارادی سے کام لینا اور اپنے اعصاب پر قابو رکھنا ہو گا۔ جناب صدر زرداری کی اس بات میں بڑا وزن ہے کہ دورانِ جنگ افغانستان میں دو تین بار انتخابات ہو سکتے ہیں' تو ہمارے ہاں بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب سیاسی جماعتیں میدانِ عمل میں فعال ہوں گی اور عوام اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کریں گے' تو غالب امکان یہ ہے کہ طالبان کو تخریبی سرگرمیوں کا حوصلہ نہیں ہو گا اور وہ پوری دنیا میں اپنا امیج خراب کرنے سے گریز کریں گے جن کے ساتھ امریکہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کر چکا ہے۔ ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ کچھ دانش ور اور سیاسی دہشت گرد ہمارے

اور بھی ہیں جو انتخابات کے خلاف اور تین سالہ ٹیکنوکریٹس کی حکومت کے حق میں دلائل کے انبار لگاتے رہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں زبردست ناکامی کا سامنا ہے۔ امریکہ اور تمام جمہوری قوتیں اس تاریخ ساز کامیابی پر بہت خوش ہیں کہ پاکستان آئین کے مطابق جمہوریت کے راستے پر گامزن ہے اور پُرامن انتقالِ اقتدار کے لیے سیاسی جماعتوں کی پُرجوش حمایت اور شرکت سے انتخابات ہو رہے ہیں اور ایک عہدِ نو پوری آب و تاب سے طلوع ہونے کو ہے۔

انتخابات کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے کے لیے ہمیں بلوچستان کے گمبھیر مسائل اور خوں افشاں حالات پر غیر معمولی توجہ دینا ہو گی اور وہاں ایجنسیوں کا رول محدود کرتے ہوئے سپریم سویلین پاور کے ساتھ بنیادی معاملات طے کرنا ہوں گے۔ بلوچستان کے شورش زدہ حالات آئین و قانون کے تحت' فوج' ایف سی' پولیس اور لیویز کا ایک فعال کردار ناگزیر دکھائی دیتا ہے اور ریاست کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والے عناصر کی سرکوبی کے لیے ویسے ہی سخت قوانین نافذ کرنا ہوں گے جیسے نائن الیون اور سات جولائی کو ہونے والی دہشت گردی کے بعد امریکہ اور برطانیہ میں نافذ کیے گئے تھے جن سے دہشت گردی کا مکمل طور پر خاتمہ ہو چکا ہے۔ سردار اختر مینگل چار سالہ جلاوطنی ختم کر کے پاکستان آئے ہیں اور اُن کی سیاسی پارٹی نے چند ضمانتوں کے ساتھ انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے نگران وزیراعظم کا تعلق بھی اسی صوبے سے ہے جن سے گتھیاں سلجھانے کی توقع کی جا رہی ہے۔ الیکشن کمیشن نے بھی بلوچستان میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور وہ ناراض بلوچ لیڈروں سے انتخابات میں شرکت کے مسئلے پر مذاکرات کر رہے ہیں۔ انھوں نے براہمداغ کو بھی بات چیت کی دعوت دی جو ایک بہت اچھی پیش رفت ہے جس کے ہمارے مستقبل پر صحت مند اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ انتخابات کے حوالے سے ہمیں اس اہم پہلو پر بھی بطورِ خاص توجہ دینا ہو گی کہ ووٹ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم نہ ہونے پائیں اور عوام کا مینڈیٹ پوری قوت و حشمت کے ساتھ جلوہ گر ہو اور ایک مضبوط حکومت وجود میں آئے۔ اس مقصد کے لیے تمام نظریاتی اور ہم خیال سیاسی جماعتوں کو انتخابی اتحاد یا سیٹ ایڈجسٹمنٹ میں پرو لینے اور مستقبل کی مضبوط بنیادیں اُٹھانے کے لیے ایک دوسرے سے کُھلے دل سے تعاون کرنا چاہیے۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ اس ہم قدمی اور شیرازہ بندی سے کڑی دھوپ کا سفر آسانی سے طے ہو جائے گا اور پھولوں میں رنگ بھرتے جائیں گے اور بادِ نسیم کے زندگی سے لبریز جھونکے مشامِ جاں کو معطر کرتے چلے جائیں گے۔

■■■

3 کروڑ نوجوان انتخابی نتائج پلٹنے والے ہیں!

عمر رسیدہ سیاسی قیادت نوجوانوں کے لیے معاشی پروگرام دینے میں ناکام

خصوصی تجزیہ: طیب اعجاز قریشی

جوزف کالونی کا واقعہ ہو یا بجلی اور گیس کی عدم دستیابی پر احتجاج، گھیراؤ جلاؤ، توڑ پھوڑ، غصہ، نفرت اور انتظامیہ سے عدم تعاون ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں عام ہو چکا ہے۔ آپ ٹی وی پر اکثر دیکھتے ہوں گے کہ چھوٹے چھوٹے بچے اور نوجوان سڑکوں پر ٹائر جلا کر ٹریفک کو بلاک کر رہے ہوتے ہیں، یا پھر دکانوں پر لوٹ مار میں مصروف۔

نوجوانوں میں فرسٹریشن اور غصہ بڑھتا جا رہا ہے جس کی وجوہات کو پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی عمر رسیدہ قیادت سمجھنے سے ہی قاصر ہے۔ محترم نواز شریف، شہباز شریف، چودھری نثار، آصف علی زرداری، عمران خان، مخدوم جاوید ہاشمی، جہانگیر خان ترین اور اسفند یار ولی خان سبھی ساٹھ برس سے اوپر کے ہو چکے ہیں، ہماری قومی اسمبلی کے ارکان اور وزرا کی اوسط عمر بھی 50 سال سے زائد تھی۔ ایک جائزے کے مطابق پاکستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ یعنی تقریباً نو کروڑ افراد پچیس سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے۔ پرانی اور نئی نسل کے درمیان جنریشن گیپ اتنا بڑھ چکا ہے کہ سیاسی قیادت کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ان نوجوانوں کے مسائل کیا ہیں، وہ کیا سوچتے ہیں اور وہ کس طرح مطمئن ہو پائیں گے۔ دادا اور نانا کی عمروں کو پہنچنے والے

اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ ان کے لیے پوتوں اور نواسوں جو بالکل مختلف ماحول میں پلے بڑھے ہیں سے کمیونی کیٹ کرنا کتنا دشوار ہے۔ حتیٰ کہ ایک 40 سالہ والد کے لیے اپنے بیٹے یا بیٹی کو قائل کرنا ایک درد سر ہوتا ہے۔ نوجوان نسل نسبتاً تعلیم یافتہ اور باشعور ہے اور اپنے والدین اور بزرگوں سے بہت سی توقعات رکھتی ہے اور پھر الیکٹرانک میڈیا، انٹرنیٹ کا آزادانہ استعمال، سستا موبائل فون، سوشل میڈیا ٹیکنالوجی نے اس جنریشن گیپ کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

تحریک انصاف، مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور ایم کیو ایم کے منشور کا جائزہ لے کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس اس نسل کے لیے کوئی خاطر خواہ پروگرام نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ آنے والی حکومت اگر ان نوجوانوں کو روزگار اور مستقبل کا قابل عمل منصوبہ فراہم نہ کر سکی تو کیا ہوگا؟

کسی بھی ملک کے لیے گروتھ انجن اس کا پیداواری شعبہ ہوتا ہے۔ پچھلے بارہ برسوں میں ہم نے صنعت اور پیداواری شعبہ کو تباہ کر دیا ہے اور ساری توجہ زراعت پر مرکوز کر دی۔ گندم اور دوسری اجناس کی قیمتیں تو بڑھا دیں لیکن اس سیاسی فیصلے سے نوجوانوں کو نوکریاں نہ مل سکیں اور مہنگائی کا طوفان الگ سے کھڑا ہو گیا۔ حالت یہ ہے کہ ایک طرف بچی کھچی انڈسٹری کے لیے بھی مطلوب صلاحیتوں کے حامل تربیت یافتہ افراد آسانی سے میسر نہیں اور دوسری طرف پڑھے لکھے ایف اے، بی اے اور ایم اے پاس نوجوانوں کے لیے باعزت روزگار کے مواقع نہیں۔

اسی سلسلے میں ایک قاریہ کا خط پڑھیے:

''معزز قارئین! میں اپنا نام اور اپنی شناخت خفیہ ہی رکھوں گی...... ورنہ میرا سماج میری اس آواز کو بھی دبا دے گا۔

میں ایک ایکڑ سے کم زمین کے مالک کاشتکار اور ریٹائرڈ ٹیچر کی بیٹی ہوں۔ علاقہ ہذا عصر حاضر کی ہر تعلیمی سہولت سے محروم ہے، سائنس اور کمپیوٹر کی تعلیم ناپید ہے۔ ہمارے علاقہ میں صرف ایک ہی گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول ہے اور حال ہی میں وہاں سائنس اور کمپیوٹر کلاسز کا اجرا ہوا ہے۔ 2011 میں میرا بی۔ ایڈ کا رزلٹ آیا، سوچا تھا کہ اس کے بعد ملازمت مل جائے گی تو آگے پڑھنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔

چودہ بہن بھائیوں میں سے میرا درمیان کا نمبر ہے۔ وزیر اعلیٰ صاحب سے مالی تعاون کے لیے نہیں، کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں، صرف اس وجہ سے بار بار تحریری درخواست کی کہ سائنسی تعلیم کے حامل افراد کو تو ملازمتیں مل رہی ہیں، خدارا آرٹس کی تعلیم رکھنے والوں کے لیے بھی آسامیاں پیدا کریں تاکہ سفید پوش لوگ اپنے خواب شرمندۂ تعبیر کر سکیں۔ بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ خادم اعلیٰ کی سیکرٹری کی کال کے علاوہ کوئی جواب نہیں ملا صرف جھوٹی تسلیاں دی جاتی رہیں۔ میری درخواست تو صرف اتنی تھی کہ اربوں روپے منصوبوں پر خرچ ہو رہے ہیں کیا ایسے پسماندہ علاقے کے عوام کا عصر حاضر کی تعلیم پر کوئی حق نہیں؟ بے حد افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ایف ایس سی کے سند یافتہ کو تو ملازمت مل جاتی ہے لیکن ایف اے، بی اے، ایم اے کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ اعلان کہ" آرٹس کی ملازمتوں

پر بین لگ گیا، اور ایک لاکھ تیس ہزار کنٹریکٹ پر موجود ملازمین کو مستقل کر دیا گیا۔"

محترم وزیر اعلیٰ صاحب! صرف اتنا جواب دے دیں کہ اگر آرٹس گروپ کی ملازمتوں پر بین لگایا ہے تو آرٹس گروپ کے ڈگری ہولڈرز کہاں جائیں؟ ان کو روزگار کون فراہم کرے گا؟

صد افسوس! خدمت خلق کے علمبرداروں نے ایک بیٹی کی فریاد نہ سنی، کان تک نہ دھرے، میری سسکتی ہوئی آرزو فی الحال تشنگی کا شکار ہے..... (ایک طالب۔ جنوبی پنجاب)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مہارتوں اور تربیت کے فقدان (Skill Gap) میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، تعلیمی نصاب اور صنعتوں کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں۔ چار کروڑ ووٹرز خواہ عمران خان کو ہی منتخب کر لیں کہ وہ تبدیلی اور یوتھ کا پرچم تھامے 16 سال سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ لیکن کیا عمران خان کے پاس ان افراد کو روزگار فراہم کرنے کا کوئی ایکشن پلان ہے؟ اگر ہے تو اب تک سامنے کیوں نہیں آیا۔ 23 مارچ کے جلسے میں توقع کے مطابق نوجوانوں کی بڑی تعداد نے مینار پاکستان کے جلسے میں شامل ہو کر تبدیلی کے حق میں اپنی مہر ثبت کی۔ لیکن جلسے کے اختتام پر جب عمران خان کو تقریر ادھوری چھوڑنا پڑی، شدید بارش اور ٹھنڈ میں ٹھٹھرتے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ضرور سوچتے ہوں گے کہ تحریک انصاف کی سیاسی اقتدار میں آ کر بھی اسی طرح کی بدنظمی اور عدم پلاننگ کا مظاہرہ تو نہ کرے گی۔ چار حلقوں سے انتخاب لڑنے والے شاہ محمود قریشی سے، جب کہ بارش کی پیش گوئی کا ہر ایک کو علم تھا، اتنی لمبی اور بے تکی تقریر کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ نوجوان تو عمران خان سے حلف لینے اور ان سے مستقبل کا لائحہ عمل سننے آئے تھے نہ کہ شاہ محمود قریشی اور محترم جاوید ہاشمی کا "نظمی نعرہ" "اوپر اللہ نیچے بلا۔"

سستی روٹی اسکیم اور بے نظیر انکم سپورٹ فنڈ اچھی اسکیمیں تھیں لیکن کوئی بھی حکومت اس طرح کی اسکیموں کو کتنا عرصہ جاری رکھ سکتی ہے۔ سوشل مراعات یا سبسڈی کلچر اس ملک میں کاروبار کرنے کا ہنر Entrepreneurship کو پروان چڑھنے نہیں دے گا۔ یہ لوگوں کو سست، کاہل اور طفیلی بنائے گا۔ آپ لوگوں کو کام نہ کرنے کے لیے پیسے دے رہے ہوتے ہیں۔ کیا ایسی کسی اسکیم کے ذریعے نوجوان مہارت (Skill) حاصل کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں؟ چھوٹے پیمانے پر اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہیں؟ انھیں پرائیویٹ سیکٹر میں نوکری مل سکتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ کروڑوں نوجوانوں کو تکنیکی مہارتیں حاصل کرنے کے مواقع کون فراہم کرے گا؟ ان کو ہنرمند، پرعزم اور منظم فورس میں کون تبدیل کرے گا؟ کیا پاکستانی قائدین ان کو باعزت روزگار فراہم کر سکیں گے؟

موجودہ صورت حال میں ہم دستیاب ورک فورس سے پروڈکٹیوٹی (Productivity) یعنی زیادہ پیداوار حاصل نہیں کر سکتے۔ اس وقت ملک کو ایک نئے معاشی ماڈل کی اشد اور فوری ضرورت ہے جس کے تحت ملک میں ترقی کی طرح ٹیکسٹائل اور زراعت پر مبنی صنعتوں اور مینوفیکچرنگ کے شعبہ کو فروغ دیا جائے۔ اگر ہم نے ملک میں زراعت پر مبنی صنعتوں اور مینوفیکچرنگ کے شعبہ کو فروغ نہ دیا تو یہ ہیومن ریسورس، جو ایک سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے ایک المناک سانحے میں تبدیل ہو جائے گا۔

■■

یہ ہے اللہ کی تلواروں میں سے ایک

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

اسلامی تاریخ میں بہادری و جاں فروشی کی علامت بن جانے والے ایک مردِ باصفا کا جاں فزا، دلنواز تذکرہ

خالد محمد خالد / ارشاد الرحمن

ان کا معاملہ بھی عجیب ہے! اُحد کے روز مسلمانوں کو گھاؤ لگایا اور باقی زندگی اعدائے اسلام کو ناکوں چنے چبوائے۔

آیئے ان کی داستانِ حیات ابتدا سے سنیں!

مگر کون سی ابتدا؟...... وہ تو خود اس روز کے علاوہ کسی روز کو اپنی زندگی کا آغاز نہیں سمجھتے جس روز انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرتے ہوئے آپؐ کے دست مبارک سے مصافحہ کیا تھا۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ اس ساری عمر اور زندگی کو خود سے دور کر دیتے جو اس روز سے قبل مہینوں اور برسوں کی صورت میں گزر چکی تھی۔

ہم بھی ان کی کہانی وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے وہ شروع کرنا پسند کرتے ہیں یعنی وہ حسین لمحہ جس میں ان کا دل اللہ سے ڈر گیا اور ان کی روح نے رب الرحمٰن کے دائیں ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ (رحمٰن کے تو دونوں ہاتھ دائیں ہیں) تو وہ روح اس کے دین، اس کے رسول اور راہِ حق میں تمنائے شہادت کے شوق سے کھل اٹھی۔ ایسی شہادت جو ایامِ ماضی کا وہ بوجھ اتار پھینکے جو باطل کی حمایت و نصرت کی صورت میں ان کے کندھوں پر پڑا ہوا تھا۔

ایک روز وہ تنہائی میں بیٹھ گئے اور اپنے سنجیدہ احساسات اور صحیح عقل و شعور کو اس دینِ جدید پر مرکوز کر دیا جس کے پرچم روز بروز بلند بھی ہو رہے تھے اور ان میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اللہ عالم الغیب ان کے لیے ہدایت کا کوئی ذریعہ پیدا کر دے۔

یعنی ان کے بیدار دل میں یقین کے احساسات جاگ اٹھیں۔ وہ خود سے ہم کلام ہوئے:

''اللہ کی قسم راستہ درست ہے اور آدمی رسول ﷺ ہے۔ لہٰذا کہاں تک اور کب تک (میں اس سے دور رہوں گا)؟ اللہ کی قسم! میں جاتا ہوں اور اسلام قبول کر لیتا ہوں!''

قارئین کرام! ہم انھی کے الفاظ کی طرف کان لگاتے ہیں۔

وہ رسول اللہ ﷺ

کے پاس جانے اور قافلہ مومنین میں اپنا نام درج کرانے کے لیے مکہ سے مدینہ کی طرف اپنے سفرِ مبارک کی روداد بیان کرتے ہیں:

"میں نے چاہا کہ کوئی ایسا آدمی ملے جس کو ساتھ لے چلوں! میں عثمانؓ بن طلحہ کو ملا اور اس سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو اس نے فوراً بات مان لی۔ ہم دونوں بوقتِ سحر نکل پڑے۔ جب ہم ہدہ کے مقام پر پہنچے تو وہاں ہمیں عمروؓ بن العاص ملے۔ انھوں نے کہا: آنے والوں کو خوش آمدید۔

ہم نے کہا: "آپ کو بھی خوش آمدید۔"

انھوں نے پوچھا: "کہاں کا ارادہ ہے؟"

ہم نے انھیں بتایا تو انھوں نے بھی ہمیں بتا دیا کہ وہ بھی نبی ﷺ کی طرف جا رہے ہیں تاکہ اسلام قبول کریں۔

پھر وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ یہاں تک کہ ہم ۸ ہجری یکم صفر کو مدینہ پہنچ گئے۔ میں جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ کو نبی کہہ کر سلام کیا۔ آپ ﷺ نے بھی خندہ روئی سے سلام کا جواب دیا۔ پھر میں نے کلمہ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں تمھارے اندر ایسی عقل دیکھ رہا ہوں کہ وہ تمھیں خیر کے سوا کسی اور چیز کے حوالے نہیں کرے گی۔"

میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی اور عرض کیا: راہِ حق میں رکاوٹ ڈالنے کی خاطر مجھ سے سرزد ہونے والے ہر عمل کی میرے لیے استغفار کیجیے!

آپؐ نے فرمایا: ان الاسلام یجب ما کان قبلۃ (اسلام ان تمام (گناہوں) کو مٹا دیتا ہے جو اس سے پہلے سرزد ہوئے ہوں)۔

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ پھر بھی آپ ﷺ میرے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔

پھر آپ یوں گویا ہوئے:

اللھم اغفر لخالد ابن الولید کل ما اوضع فیہ من صد عن سبیلک

"اے اللہ! خالد بن ولیدؓ کے ان تمام گناہوں کو معاف فرما دے جو اس نے تیری راہ روکنے کے لیے کیے ہیں۔"

اس کے بعد عمروؓ بن العاص اور عثمانؓ بن طلحہ بھی مسلمان ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کی بیعت کر لی۔"

آئیے ان "حضرت خالدؓ" کی معیت میں چند لمحات گزاریں جو اپنی قوت بازو کے بل بوتے پر اسلام لائے تھے۔

جناب خالدؓ جب مسلمان ہو جاتے ہیں تو ان کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہو جاتا ہے۔

قارئین کرام! آپ معرکہ موتہ کے مرد میدان تین شہدا جناب زید بن حارثہؓ، جناب جعفرؓ بن ابی طالب اور جناب عبداللہؓ بن رواحہؓ ہیں۔ موتہ وہ غزوہ ہے جس کے لیے روم نے دو لاکھ فوج جمع کی تھی اور جس کے مقابلے میں مسلمانوں نے بے مثال دادِ شجاعت دی تھی۔

آپ کو وہ غم انگیز الفاظ بھی یاد ہوں گے جو رسول اللہ ﷺ نے تینوں قائدین معرکہ کے شہادت کی خبر دیتے ہوئے فرمائے تھے کہ:

اخذ الرایۃ "زید بن حارثۃ" فقاتل بھا حتیٰ قتل شھیدا... ثم اخذھا "جعفر" فقاتل بھا حتیٰ قتل شھیدا... ثم اخذھا "عبداللہ بن رواحۃ" فقاتل بھا حتیٰ قتل شھیدا

"زید بن حارثہ نے پرچم پکڑا اور وہ لڑتے رہے حتیٰ کہ وہ قتل ہو کر شہید ہو گئے۔ پھر پرچم جعفرؓ نے پکڑا اور وہ بھی لڑتے رہے حتیٰ کہ قتل ہو کر شہید ہو گئے۔ پھر پرچم عبداللہؓ بن رواحہؓ نے تھاما اور لڑتے رہے حتیٰ کہ قتل

ہو کر شہادت پا گئے۔"

اس حدیث رسول ﷺ کا کچھ حصہ باقی ہے۔ آپ نے مزید فرمایا:

ثم اخذ الرایۃ سیف من سیوف اللہ ففتح اللہ علی یدیہ

"پھر پرچم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے تھاما اور اللہ نے اس کے ہاتھوں فتح عطا فرما دی۔"

یہ سیف من سیوف اللہ کون تھا؟

یہ حضرت خالدؓ بن ولیدؓ تھے جو ایک عام سپاہی کی حیثیت سے تین کمانڈروں حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ کی قیادت میں غزوۂ موتہ میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ یہ تینوں کمانڈر اسی ترتیب سے اس خوفناک جنگ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

آخری کمانڈر کے شہید ہو کر زمین پر گرنے کے بعد حضرت ثابت بن اقرمؓ جلدی سے جھنڈے کی طرف بڑھے اور اسے داہنے ہاتھ میں تھام کر لشکرِ اسلام کے وسط میں بلند کر دیا تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں کوئی بددلی نہ پیدا ہونے پائے۔

حضرت ثابتؓ نے جھنڈے کو تھامتے ہی یہ کہتے ہوئے فوراً اسے حضرت خالد بن ولیدؓ کی طرف بڑھا دیا کہ: "اے ابوسلیمان! پرچم پکڑ لیجیے!"

حضرت خالدؓ جھنڈے کو اٹھانا اپنا حق نہیں سمجھتے تھے کیونکہ آپ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ آپ اس وقت مسلمانوں کی قیادت کریں جب وہ انصار و مہاجرین ان کے درمیان ابھی موجود ہوں جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت حاصل کی تھی۔

ادب، انکسار، علم اور اخلاقی خوبیاں! یہ انھی کے لائق تھیں اور وہ ان کے اہل تھے۔ اس وقت انھوں نے حضرت ثابت بن اقرمؓ کو جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"نہیں..... میں پرچم نہیں تھام سکتا۔ آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں۔ آپ عمر میں بھی بڑے ہیں اور غزوۂ بدر میں بھی شریک ہو چکے ہیں۔"

حضرت ثابتؓ نے ان کو جواب دیا: اسے آپ پکڑیں، آپ مجھ سے زیادہ جنگ کے ماہر ہیں اور اللہ کی قسم! میں نے یہ آپ کو پکڑانے کے لیے پکڑا تھا۔

پھر حضرت ثابتؓ نے مسلمانوں میں باآواز بلند کہا: "کیا تمھیں خالدؓ کی امارت منظور ہے؟"

لوگوں نے کہا: ہاں منظور ہے!

جناب خالدؓ اس وقت لشکر کی کمان سنبھالتے ہیں جب لڑائی اپنے انجام کے قریب پہنچ رہی ہے اور مسلمانوں کی شہادتیں بہت ہو چکی ہیں، ان کے بازو کٹ چکے ہیں، لشکرِ روم اپنی بے حساب کثرت کے بل بوتے پر تباہی بھی پھیلا رہا ہے اور مسلسل کامیابی بھی حاصل کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ اب کوئی جنگی چال یا داؤ پیچ ایسا نہیں تھا جو معرکہ کے انجام کی سمت کو تبدیل کر سکے اور مغلوب کو غالب اور غالب کو مغلوب کر دے۔ جو واحد عمل کسی عبقری کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ اسے آزمائے وہ یہ تھا کہ لشکرِ اسلام میں جانی نقصان کو مزید بڑھنے سے روکا جائے اور بقیہ قوت کو بچا کر یہاں سے نکالا جائے۔ یعنی محتاط پسپائی اختیار کی جائے جو بقیہ قوت کو ارضِ معرکہ میں تباہ ہو جانے سے بچا سکے۔

لیکن ان حالات میں اس طرح کی پسپائی کسی بھی جگہ ناممکن ہوتی ہے۔ مگر جب یہ بات صحیح ہے کہ یہ کام کسی بہادر دل کے لیے ذرا مشکل و ناممکن نہیں تو ہم کہیں گے کہ حضرت خالدؓ سے بڑا بہادر دل کون ہو سکتا ہے۔

سیف اللہ آگے بڑھتے ہیں۔ پورے میدان جنگ پر عقاب جیسی نگاہ ڈالتے ہیں اور روشنی جیسی تیزی سے فوراً منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ جنگ جاری ہے اور اسی دوران لشکر کو کئی ٹولیوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ پھر ہر ٹولی کو اس کی مہم اور ذمہ داری سونپتے ہیں اور مشکل میں ڈال دینے والے اپنے فن اور گہری چالاکی کو استعمال میں لاتے ہیں۔ یہاں تک کہ لشکرِ روم کی صفوں میں بہت بڑا شگاف ڈال دیتے ہیں جس کے درمیان سے مسلمان لشکر بسلامت گزر جاتا ہے۔

....

حضرت خالدؓ اسلام لائے تو اس دین کے لیے اپنی عظیم خدمات رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کر دیتے ہیں جس دین پر وہ پورے یقین کے ساتھ ایمان لائے تھے اور پوری زندگی اس کی نذر کر دی۔

رسول اللہ ﷺ کے رفیق اعلیٰ سے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں تو ارتداد کی غدارانہ و مکارانہ آندھیاں چل پڑتی ہیں۔ ان طوفانوں نے کانوں کو بہرا کر ڈالنے والی خوفناک چنگھاڑ اور مسلسل تحریک کے ذریعے دین اسلام کا گھیراؤ کرنے کی ٹھانی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اس اولین بغاوت کی سرکوبی کے لیے مردِ عصر و مردِ دہر حضرت خالد بن ولیدؓ پر نظر ڈالتے ہیں!

یہ بات صحیح ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ارتداد کے خلاف معرکے کا آغاز اس لشکرِ اسلام کے ذریعے کیا تھا جس کی قیادت خود فرمائی تھی لیکن یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ انھوں نے فیصلہ کن دن کے لیے حضرت خالد بن ولیدؓ کو سنبھال رکھا تھا اور پھر حضرت خالد بن ولیدؓ ہی ارتداد کے خلاف ان تمام معرکوں میں بے مثل و عظیم مردِ میدان رہے۔

جب مرتدین کے لشکروں نے اپنی بڑی بڑی سازشوں کو عملی رنگ دینے کی تیاری شروع کر دی تو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی عزم صمیم کر لیا کہ آپ خود لشکرِ اسلام کی قیادت کریں گے۔ بڑے بڑے صحابہ جو کسی قدر مایوسی میں آگئے تھے وہ خلیفہ کو اس عزم سے روک رہے تھے۔ لیکن خلیفہ کا عزم بتدریج پختہ ہوتا گیا۔ شاید اس طرح وہ اس مسئلہ کو جس میں کودنے کے لیے لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، ایسی اہمیت دینا چاہتے تھے جو اس خوفناک معرکے میں بنفس نفیس شرکت کے بغیر نہیں دی جا سکتی تھی جو معرکہ ابھی ایمان و اسلام اور ارتداد و ضلال کی قوتوں کے مابین برپا ہونے والا تھا۔

باوجود اس کے کہ یہ تمرد عارضی تھا تاہم مرتدین کی یہ حرکات بہت بڑا خطرہ تھیں۔ اس مہم میں اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات رکھنے اور پس و پیش کرنے والے عناصر کو اپنے بغض قلب کی آتش کو ٹھنڈا کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا تھا۔

اس فتنے کی آگ اسد، غطفان، عبس، طی، ذبیان، بنی عامر، ہوازن، سلیم اور بنی تمیم کے قبائل کے اندر بھی بھڑک اٹھی تھی۔

یہ سازشیں سر اٹھاتے ہی ہزاروں جنگجوؤں کے لشکر جرار میں تبدیل ہو گئیں۔

اس خوفناک بغاوت کو بحرین، عمان اور مہرہ کے لوگوں نے بھی قبول کر لیا تھا اور اسلام کو خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ گویا زمین نے مسلمانوں کے چہار اطراف آگ بھڑکا دی تھی۔

لیکن ادھر دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ تھے!!

حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کو جنگ کے لیے تیار کیا اور خود ان کی قیادت فرما کر اس مقام پر جا پہنچے جہاں بنی عبس، بنی مرہ اور ذبیان ایک لشکر جرار کی صورت نکل آئے تھے۔ لڑائی چھڑ گئی اور شدت پکڑتی گئی...... بالآخر عظیم فتح مسلمانوں کے حصے میں آئی۔

کامیاب و فاتح لشکر ابھی مدینہ میں قدم ہی رکھ پایا تھا کہ خلیفہ نے اسے ایک اور معرکہ کے لیے آواز دے دی۔ چونکہ مرتدین کی خبریں اور ان کی جتھا بندی ہر لمحہ خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس لیے اس دوسرے لشکر کی قیادت کے لیے بھی حضرت ابوبکرؓ خود نکلے مگر کبار صحابہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور وہ سب اس بات پر متفق و جمع ہو گئے کہ خلیفہ کو مدینہ میں ہی رہنا چاہیے۔ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کے راستے میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی اس سواری کی لگام پکڑ لیتے ہیں جس پر سوار ہو کر حضرت ابوبکرؓ لشکر کی قیادت کرنے جا رہے تھے۔

حضرت علی کہتے ہیں: ''خلیفۂ رسول ﷺ! کہاں جا رہے ہیں؟

میں آپ سے وہی بات کہوں گا جو رسول اللہ ﷺ نے احد کے روز فرمائی تھی کہ

لم سیفک یا ابابکر و لا تفجعنا بنفسک

''ابوبکرؓ! ذرا اپنی تلوار کو بند رکھو اور اپنے بارے میں ہمیں صدمہ نہ پہنچاؤ!''

مسلمانوں کے اس مستحکم اجتماعی موقف کے پیش نظر خلیفۂ وقت مدینہ میں رہنے پر راضی ہو گئے اور فوج کو گیارہ گروہوں میں تقسیم کر کے ہر گروپ کے لیے اس کا کام متعین کر دیا۔ فوج کے ان یونٹوں میں سے سب سے بڑے یونٹ کے امیر حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔

خلیفہ نے جب کمانڈروں کو جھنڈے تفویض کیے تو حضرت خالدؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ

نعم عبداللہ و اخو العشیرۃ خالد بن ولید سیف من سیوف اللہ سلہ اللہ علی الکفار و المنافقین

''اللہ کا بہترین بندہ اور خاندان کا وفادار خالد بن ولید اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، اللہ اسے کفار و منافقین پر تان رکھے۔''

....

حضرت خالدؓ اپنے لشکر کو ایک سے دوسرے معرکے میں منتقل کرتے ہوئے اپنی راہ پر گامزن ہیں اور فتح پر فتح پا رہے ہیں یہاں تک کہ فیصلہ کن معرکے کا روز آگیا۔ یہ یمامہ کا مقام ہے جہاں بنو حنیفہ اور ان کے ساتھ آملنے والے قبائل مرتدین کے لشکروں کو اکٹھا کر لائے ہیں جن کی قیادت (نبوت کا دعوے دار) مسیلمہ کذاب کر رہا ہے۔

اس موقع پر کچھ مسلمان قوتوں نے بھی لشکرِ مسیلمہ کا ساتھ دینے کا تجربہ کیا مگر انھیں کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

ادھر خلیفہ کا حکم فاتح سالار تک پہنچا کہ بنو حنیفہ کی طرف پیش قدمی کرو۔ حضرت خالدؓ لشکر کو لے کر چل پڑے۔ جب مسیلمہ کو علم ہوا کہ اس کی راہ میں آنے والے لشکر کی قیادت حضرت خالد بن ولیدؓ کر رہے ہیں تو اس نے اسے حقیقی اور خوفناک تصادم سمجھا۔ پھر اپنے لشکر کو از سر نو ترتیب دینا شروع کر دیا۔

حضرت خالدؓ نے لشکر کو یمامہ کی بلند جگہ پر اتار دیا اور لشکر کے کمانڈروں کو پرچم عنایت کیے اور دونوں لشکر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ خوفناک جنگ شروع ہو

گئی۔ پھر اس میں شدت آتی گئی۔ مسلمان شہید ہو کر ایسے گر رہے تھے جیسے تند و تیز ہوا باغ کے پھولوں کو گراتی ہے!!

جناب خالدؓ نے دشمن کا پلہ بھاری ہوتا دیکھا تو فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر قریب ہی اونچی جگہ سے وسیع و عمیق میدان جنگ پر نظر ڈالی اور اپنے لشکر کے کمزور پہلوؤں کا جائزہ لیا۔

آپؓ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ذمہ داری کا احساس اس تابڑ توڑ پیش قدمی کی بنا پر کمزور ہو گیا ہے جو مسیلمہ کی فوج نے ان پر کی ہے۔ لہٰذا آپؓ نے سوچا کہ تمام مسلمانوں کے دلوں میں ذمہ داری کے احساس کو پوری طرح اجاگر اور مضبوط کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ لشکر کے جتھوں اور ٹولیوں کو بلا رہے تھے، میدان جنگ میں ہی اس کی تنظیم نو کر رہے تھے پھر اپنی فاتحانہ آواز میں کہا: الگ الگ ہو جاؤ۔ تاکہ ہم آج ہر قبیلے کی شجاعت کو دیکھ سکیں!

سب قبیلے الگ الگ ہو گئے۔ مہاجر ایک جھنڈے تلے آ گئے اور انصار دوسرے جھنڈے کے نیچے چلے گئے۔ اور ایک باپ کی اولاد ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور دوسرے کی دوسرے جھنڈے تلے چلی گئی۔ اس طرح واضح ہو گیا کہ شکست کس جگہ سے در آ رہی تھی۔ پھر دل بہادری کی آتش سے جل اٹھے اور عزم و جذبے سے سرشار ہو گئے۔

حضرت خالدؓ لحہ بہ لحہ تکبیر و تہلیل کا نعرہ بلند کرتے یا گرجدار آواز میں کوئی حکم دیتے تو لشکر کی تلواریں ایسی موت ثابت ہوتیں جنھیں کوئی موڑ نہیں سکتا اور اپنے ہدف تک پہنچنے سے روک نہیں سکتا۔ چند ہی ثانیوں میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسیلمہ کا لشکر دس دس کر کے پھر سیکڑوں اور پھر ہزاروں کی تعداد میں تلواروں کی نذر ہونے لگا۔

اس طرح ارتداد کا انتہائی خطرناک اور شدید معرکہ انجام کو پہنچا۔ مسیلمہ قتل ہو گیا، میدان جنگ اس کے لشکر کی نعشوں سے بھر گیا اور کذاب مدعیِ نبوت کا جھنڈا مٹی تلے دب گیا۔

خلیفہؓ نے مدینہ میں اللہ رب العزت کے لیے نمازِ شکر ادا کی کہ اس نے مسلمانوں کو اس فتح سے نوازا اور انھیں خالدؓ جیسا بطل جنگ عطا فرمایا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خداداد بصیرت سے اپنی حدودِ خلافت سے پار اسلام اور اہلِ اسلام کو خائف کرنے میں ایران و روم کے خطرناک کردار کو بھی بھانپ لیا تھا۔

آپؓ نے حضرت خالدؓ کو احکام جاری کیے کہ وہ لشکر لے کر عراق کی جانب نکلیں۔

آپؓ نے عراق میں اپنے کام کا آغاز ان خطوط سے کیا جو کسرائے ایران، گورنروں اور عراق و مدائن کی ریاستوں کے نواب کو ارسال کیے۔ آپؓ نے لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خالد بن ولیدؓ کی طرف سے رؤسائے ایران کی طرف۔

سلام ہو اس شخص پر جس نے ہدایت کو قبول کر لیا۔

اما بعد..... تعریف اس ذات کے لیے جس نے تمھاری جمعیت کو منتشر کر دیا، تم سے حکمرانی چھین لی اور تمھاری تدبیریں خاک میں ملا دیں۔

جو شخص ہماری نماز پڑھنا شروع کر دے، ہمارے قبلے کو مان لے اور ہمارے ذبیحہ کو کھا لے یہ شخص مسلمان ہے۔ اس کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمیں

حاصل ہیں اور اس پر بھی وہی فرائض و ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو ہم پر عائد ہیں۔

جب تمھیں میرا یہ خط ملے تو بطور ضمانت کچھ لوگ میرے پاس بھیج دو اور ذمی بن کر رہنے کا معاہدہ کر لو۔

اگر یہ بات تمھیں منظور نہیں تو اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، میں تمھاری طرف ایسی قوم بھیجوں گا جو موت سے اس طرح محبت کرتی ہے جس طرح تم زندگی سے پیار کرتے ہو۔"

ایرانی کمانڈروں کے عراق میں تیار کیے ہوئے ایجنڈوں کی خبریں لانے کے لیے جناب خالد بن ولیدؓ کے پھیلائے ہوئے جاسوس واپس آئے تو جناب خالدؓ وقت ضائع کیے بغیر اپنے لشکر کے ذریعے باطل کی قوت پر ٹوٹ پڑے تاکہ اس کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں۔

پھر زمین بھی آپؓ کے لیے عجیب انداز سے سکڑ گئی۔

ابلہ سے لے کر سدیر، پھر نجف سے لے کر حیرہ، پھر انبار سے لے کر کاظمیہ تک کمزور اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے لوگ دامن اسلام میں پناہ لے رہے تھے۔

حضرت خالدؓ کی رحم دلی کے بھی کیا کہنے کہ وہ اپنے لشکر کی تمام قوتوں کو جو پہلا حکم جاری کرتے ہیں وہ یہ ہے: "کسانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ ان کو اپنے کام میں لگے رہنے دو، ماسوائے اس کے کہ کوئی تم سے لڑنے کے لیے نکل آئے۔ تب تم ان لڑنے والوں سے لڑ سکتے ہو۔"

حضرت خالدؓ اپنے لشکر لے کر تیزی کے ساتھ چلے اور شام کی سرحدوں پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر مؤذنین کی اذانیں اور فاتحین کے نعرے بلند ہوئے۔

رومیوں نے شام کے اندر بلند ہونے والے ان نعروں کو سن لیا تھا اور سن کر خوفزدہ ہو گئے تھے، اسی لیے تو انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ ہر صورت اس معرکے میں کود پڑیں گے!

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے متعدد لشکر تیار کیے اور ان کی قیادت کے لیے ماہر کمانڈروں حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت یزید بن ابی سفیانؓ پھر معاویہ بن ابی سفیانؓ کو منتخب فرمایا۔

ان لشکروں کی خبر جب روم کے شہنشاہ تک پہنچی تو اس نے اپنے وزراء اور کمانڈروں کو مسلمانوں سے مصالحت کر لینے اور تباہ کن جنگ میں نہ کودنے کا مشورہ دیا لیکن کمانڈروں اور وزیروں نے لڑائی پر اصرار کیا اور کہا: "اللہ کی قسم! ہم ابوبکر کو موقع نہیں دیں گے کہ وہ ہماری سرزمین میں لشکر داخل کر سکے۔" پھر ان لوگوں نے لڑائی کے لیے لشکر تیار کیا جو ۲ لاکھ ۴۰ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

اس خوفناک صورت حال کی خبر خلیفۂ وقت حضرت ابوبکرؓ تک پہنچی تو آپؓ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں خالدؓ کے ذریعے ان کے تصورات کو ٹھنڈا کر دوں گا۔"

ادھر تمرد و عدوان اور شرک کے تصورات کے "تریاق" حضرت خالد بن ولیدؓ کو خلیفہ کی طرف سے حکم ملتا ہے کہ شام کی طرف لشکر کشی کرو تاکہ وہاں جا کر ان مسلمان لشکروں کی قیادت کر سکو جو پہلے سے وہاں پہنچ چکے ہیں۔

اطاعت امیر میں حضرت خالدؓ سے تیز کون ہو سکتا ہے۔ آپؓ نے اسی وقت مثنیٰ بن حارثہؓ کو عراق کا امیر بنایا اور کچھ منتخب مجاہدوں کو لے کر سرزمین شام میں مسلمان لشکروں سے جا ملے اور اپنی حیران کن عبقریت کو استعمال میں لاتے ہوئے مختصر وقت میں لشکر کی ترتیب و تنظیم قائم کر ڈالی۔ پھر جنگ شروع ہونے سے قبل اپنے بہادروں سے مخاطب ہوئے، اللہ کی حمد و

ثنا کے بعد فرمایا:

"یہ آج کا دن اللہ کے دنوں میں سے ایک ہے۔ اس میں نہ فخر زیبا ہے نہ سرکشی ہمارے لائق اپنے جہاد کو (اللہ کے لیے) خالص کرلو اور اپنے اس عمل کے ذریعے رب کی رضا طلب کرنے کا عزم کرلو۔ آؤ ہم (لشکر کی) امارت (کمانڈری) کے لیے باری مقرر کرلیں یعنی اس کو بدلتے رہیں۔ آج ایک شخص امیر ہو اور کل دوسرا اور تیسرا اس کے اگلے روز یہاں تک کہ تم میں سے ہر کوئی امیر بن جائے۔"

اس عظیم قائد کے ایثار سے بھرپور فراست میں اس موقع پر بھی کوئی کمی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود کہ خلیفہ نے ان کو پورے لشکر اسلام کا کمانڈر انچیف مقرر کیا ہے لیکن وہ نہیں چاہتے کہ اپنے ساتھیوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے میں شیطان کی مدد کریں۔ وہ امارت (کمانڈری) کے اپنے دائمی حق سے دستبردار ہوتے ہیں اور اس کو تمام چھوٹے کمانڈروں کے سپرد کردیتے ہیں۔

ادھر رومی کمانڈروں نے سوچا کہ مسلمانوں کو تیاری کا موقع دینے اور پھر جنگ کو طویل کرنے سے معرکوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور یہ دونوں باتیں مسلمانوں کو واقعی فتح سے ہمکنار کردیں گی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ میدان جنگ میں لشکر کو تیار کرتے ہیں۔ اسے مختلف اور متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کردیتے ہیں اور پیش قدمی اور دفاعی اقدامات ایسے نئے انداز اور طریقے پر کرتے ہیں جو روم کے طریق جنگ سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ طریقہ عراق میں موجود ایرانیوں نے آپؓ کو بتایا تھا۔

حیرانی کی بات ہے کہ معرکے کا ایک ایک قدم اور ایک ایک حرکت بالکل اسی طرح عمل میں آتی ہے جس طرح حضرت خالدؓ نے لشکر کی صف بندی کی تھی اور جس کی آپؓ کو توقع تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ آپؓ کو تلواروں کی ضربوں تک کی تعداد کی خبر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے آپؓ کا کوئی اندازہ و قیاس غلط نہ ہوا۔

ہر وہ داؤ جس کی آپؓ کو توقع تھی کہ روم یہ داؤ کھیلے گا، روم نے اسے کھیلا اور ہر وہ پسپائی جس کی آپؓ کو روم کی طرف سے توقع تھی روم نے اس کو اپنایا۔

جنگ میں کودنے سے قبل آپؓ نے لشکر روم کی دہشت و ہیبت دیکھی تو آپؓ کے دل میں اپنے لشکر کے بارے میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں کچھ لوگ میدان سے بھاگ نہ جائیں خصوصاً وہ لوگ جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور حضرت خالدؓ کی بے مثال فتوحات کا راز جس واحد چیز میں تھا وہ ثابت قدمی تھی۔ آپؓ کا خیال تھا کہ ممکن ہے دو تین آدمیوں کا فرار لشکر میں ایسی بے دلی اور انتشار پھیلا دے جو دشمن کا پورا لشکر بھی نہ پھیلا سکتا ہو۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی تلوار

اس اعتبار سے تو آپؓ اس آدمی کے لیے شمشیر براں تھے جو ہتھیار پھینک کر میدان جنگ سے بھاگ جائے۔

اس موقع یعنی جنگ یرموک میں جب لشکر اپنی مقررہ جگہ پر کھڑا ہوگیا تو حضرت خالدؓ نے مسلمان عورتوں کو بلایا اور پہلی بار تلواریں ان کے ہاتھوں میں تھمائیں اور حکم دیا کہ ہر طرف سے مسلمان لشکر کی پشت پر کھڑی ہو جاؤ اور جو میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگنے کی کوشش کرے اس کو قتل کر ڈالو۔ پھر اس گروہ کی ایک نوجوان لڑکی نے اپنی اس ذمہ داری کو بطریق احسن پورا کیا۔

جنگ شروع ہونے سے قبل افواج روم کے کمانڈر نے مطالبہ کیا کہ خالدؓ اس کے سامنے آئیں تاکہ وہ ان سے کچھ باتیں کرسکے۔ حضرت خالدؓ لشکر سے نکل کر اس کے سامنے آگئے۔ دونوں کمانڈر لشکروں کے درمیان خالی جگہ پر اپنے اپنے گھوڑوں پر موجود تھے۔

افواج روم کے کمانڈر "ماہن" نے حضرت خالدؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمھیں بھوک نے گھروں سے نکالا ہے۔ تم چاہو تو میں تم میں سے ہر آدمی کو دس دینار، کپڑے اور سامان خورد و نوش دے دیتا ہوں اور تم اپنے ملک واپس چلے جاؤ۔ اگلے سال بھی اتنی مقدار میں یہ چیزیں تمھارے پاس پہنچا دوں گا۔"

مرد جری و بطل جنگ حضرت خالد بن ولیدؓ نے رومی کمانڈر کے ان الفاظ میں بے ادبی محسوس کی اور غصے سے دانتوں کو بھینچا، پھر اسی انداز میں اس کو جواب دیا:

"ہمیں ہمارے گھروں سے بھوک نے نہیں نکالا جیسا کہ تو نے کہا ہے، بلکہ ہم خون پینے والی قوم ہیں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ رومیوں کے خون سے زیادہ مرغوب اور لذیذ خون کسی کا نہیں لہٰذا ہم یہ خون پینے آئے ہیں!"

یہ کہہ کر بطل اسلام نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور واپس اپنے لشکر میں آگئے۔ جھنڈا بلند کرتے ہوئے اعلان جنگ کردیا۔ آواز لگائی:

اللہ اکبر...... ھبی ریاح الجنۃ

"اللہ ہی سب سے بڑا ہے...... چلو جنت کی ہواؤ چل پڑو!"

ایسی جنگ شروع ہوگئی جس کی شدت و سنگینی کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ رومیوں نے مسلمانوں کی شجاعت و دلیری کے ایسے مظاہرے دیکھے جو ان کے گمان میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی اپنی جاں سپاری اور ثابت قدمی کی ایسی داستانیں رقم کیں جو عقلوں کو حیران کردیتی ہیں۔

لڑائی جاری ہے اور ایک مسلمان حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کے قریب ہوتا ہے۔ کہتا ہے: میں نے شہادت کا عزم کر رکھا ہے۔ کیا آپ کا کوئی پیغام ہے جو رسول اللہ ﷺ کو پہنچانا ہو کہ میں جب آپ ﷺ سے ملوں تو پہنچا دوں؟

حضرت ابوعبیدہؓ جواب دیتے ہیں: "ہاں!...... آپ ﷺ سے کہنا: یا رسول اللہ ﷺ ہم نے وہ چیز پالی ہے جس کا ہمارے رب نے ہم سے سچا وعدہ فرمایا تھا۔"

یہ آدمی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند پلٹتا ہے اور ہولناک لڑائی کے وسط میں اپنی جائے شہادت تک پہنچنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

......

حضرت خالدؓ کی ذہانت نے لشکر روم کے کمانڈروں کو حیران کرکے رکھ دیا۔ ان میں سے ایک کمانڈر نے جس کا نام گرگر تھا، لڑائی کے دوران وقفہ میں حضرت خالدؓ کو باہر نکلنے کے لیے کہا۔

جب حضرت خالدؓ باہر آئے تو اس نے کہا: "اے خالد! مجھ سے سچ بات کرنا جھوٹ نہ بولنا، آزاد مرد کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی پر

آسمان سے کوئی تلوار نازل کی تھی جو اس نے تمھیں عطا کر دی اور تم جس پر بھی یہ تلوار چلاتے ہو اُسے ہزیمت سے دوچار کر دیتے ہو؟ حضرت خالدؓ نے جواب دیا: "نہیں...... بات یہ نہیں ہے!"

حضرت خالدؓ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان ایک رسول ﷺ بھیجا۔ ہم میں سے کچھ نے اس کی تصدیق کی اور کچھ نے تکذیب۔ میں بھی تکذیب کرنے والوں میں رہا یہاں تک کہ اللہ نے ہمارے دلوں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا اور اپنے رسول ﷺ کے ذریعے ہمیں ہدایت سے نوازا تو ہم نے ان کی بیعت کر لی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے دعا فرمائی اور فرمایا کہ تم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہو۔ اس طرح میرا نام سیف اللہ (اللہ کی تلوار) پڑ گیا۔"

رومی کمانڈر نے پوچھا تم کس چیز کی طرف بلاتے ہو؟ حضرت خالدؓ نے جواب دیا: "اللہ کی توحید اور اسلام کی طرف!"

رومی نے کہا کیا اس آدمی کو بھی تمھارے برابر اجر و ثواب ملے جو آج اسلام میں داخل ہو؟

حضرت خالدؓ نے فرمایا: "ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب ملے گا۔"

آدمی نے پوچھا وہ کیسے؟ جبکہ تم تو اس سے پہلے ایمان لائے ہو؟

حضرت خالد نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زندگی گزاری، آپ ﷺ کے معجزات و نشانیوں کو دیکھا اور یہ حقیقت ہے کہ جو آدمی بھی وہ چیز دیکھے گا جو ہم نے دیکھی اور اس بات کو مانے گا جو ہم نے مانی تو وہ بڑی آسانی سے مسلمان ہو جائے گا۔ جبکہ تم جنھوں نے نہ آپ ﷺ کو دیکھا نہ سنا پھر بھی غیب پر ایمان لے آئے۔

اس لیے جب تم اپنی خلوت و جلوت میں اللہ کے لیے خالص ہو کر عمل کرو گے تو تمھارا اجر زیادہ اور بڑا ہوگا۔"

رومی کمانڈر نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی گفتگو سنی تو اپنے گھوڑے کو ایک طرف کھڑا کرتے ہوئے آپؓ کے پاس آ کر ٹھہر گیا اور بلند آواز سے کہا: خالد مجھے اسلام سکھاؤ!

پھر مسلمان ہو گیا اور اللہ کے لیے دو رکعت نماز ادا کی جو صرف حضرت خالدؓ اور اس کمانڈر نے ہی ادا کی تھی۔

اب دونوں لشکر پھر سے جنگ میں کود پڑے اور گرگہ رومی نے مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر شہادت کی طلب میں لڑائی کی یہاں تک کہ اس رتبۂ عظیم سے سرفراز ہو گیا!

....

جب حضرت خالدؓ اس تباہ کن معرکہ میں لشکر اسلام کی قیادت کرتے ہیں اور فتح و نصرت جسے روم نے جس قدر مضبوطی سے اپنے جبڑوں میں پکڑ رکھا تھا وہ اسی شدت کے ساتھ چھوٹ کر مسلمانوں کی جھولی میں آ گرتی ہے تو ہم دنیا کی اس جنگِ عظیم میں عظمت انسانی کا بھی ایمان افروز نظارہ کرتے ہیں۔ عین اسی وقت مدینہ سے نئے خلیفہ حضرت عمرؓ کا خط انھیں ملتا ہے جس میں وہ خلیفۂ رسول ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کی خبر دیتے ہیں۔ پھر حضرت خالدؓ کو قیادت لشکر سے معزول کر کے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو کمانڈری کا حکم دیتے ہیں۔

حضرت خالدؓ خط پڑھتے ہیں اور لشکر کو حضرت ابوبکرؓ کے لیے مغفرت اور حضرت عمرؓ کے لیے توفیق کی دعا کرنے کے لیے کہتے ہیں۔

پھر اس حامل خط سے کہتے ہیں کہ اس خط میں جو خبر ہے اس کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔ اسے ایک جگہ پر رہنے کا حکم دے دیتے ہیں کہ اس جگہ کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ کسی سے ملنا۔

پھر حضرت خالدؓ جناب عمرؓ کے احکامات کو چھپائے معرکہ کی قیادت جاری رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ فتح یقینی ہو جاتی ہے جو بالکل قریب آ پہنچی تھی۔ مسلمانوں کی کامیابی کا اعلان ہو جاتا ہے اور روم شکست سے دوچار ہو جاتا ہے۔

بطلِ اسلام حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت ابوعبیدہؓ کی طرف بڑھتے ہیں اور سپاہیانہ انداز میں اپنے کمانڈر کو سلامی پیش کرتے ہیں۔ پہلے تو حضرت ابوعبیدہؓ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کمانڈر کی طرف سے مزاح کا کوئی جملہ ہے جس نے ایسی نصرت و فتح کو یقینی بنایا ہے جس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ جلد ہی حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ حضرت خالدؓ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہیں اور ان کی عظمت و بہادرانہ خوبیوں کو سراہتے ہیں۔

اس بارے میں دوسری تاریخی روایات بھی ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے خط حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو ارسال کیا تھا اور انھوں نے معرکہ ختم ہونے تک یہ خبر حضرت خالدؓ سے چھپائے رکھی۔

خبر کو حضرت خالدؓ نے خفیہ رکھا ہو یا جناب ابوعبیدہؓ نے، دونوں حالتوں میں حضرت خالدؓ کا مسلک وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور ان کا یہ مسلک اپنے حسن، عظمت اور جلال کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔

حضرت خالدؓ کمانڈر ہوں یا سپاہی، ان کے لیے دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ کمانڈری بھی تو سپاہیت جیسی ہی ہے۔ دونوں اس فرض کی ادائی کا ذریعہ ہیں جو اس اللہ کی طرف سے جس پر وہ ایمان لائے اور اس رسول ﷺ کی طرف سے جس کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوئے ہیں اور اس دین کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے جس کو وہ اختیار کر چکے ہیں اور اس کے جھنڈے تلے آ گئے ہیں۔

جس طرح ایک سپاہی کی حیثیت سے جبکہ وہ مطیع ہوتے ہیں، ان کی کوشش جان توڑ ہوتی ہے اسی طرح ایک امیر کی حیثیت سے بھی جبکہ ان کی اطاعت ہو رہی ہوتی ہے، ان کی کوشش جاں گسل ہوتی ہے۔

اس عظیم فتح نے امت مسلمہ کے سرخیل اور دولت اسلامیہ کے خلفاء کی طرح حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھی نفس کی اصلاح و تیاری کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

....

امیر المومنین حضرت عمرؓ ایسے نہیں تھے کہ حضرت خالدؓ کا بُرا مواخذہ کرتے ہوں بلکہ آپؓ حضرت خالدؓ کی تلوار کی تیزی اور کاٹ پر مواخذہ کرتے تھے۔ اس بات کا اظہار حضرت عمرؓ نے اس وقت کیا تھا جب مالک بن نویرہ کے قتل کے بعد آپؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کی معزولی کی تجویز دی تھی۔ آپؓ نے کہا:

ان فی سیف خالد رھقا "خالد کی تلوار میں کچھ رہق ہے۔"

یعنی اس کے استعمال میں خفت، حدت اور تسرع ہے۔

خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا:

ما کنت لاشیم سیفا سلہ اللہ علی الکافرین

"میں تو اس تلوار کو بُرا نہیں کہہ سکتا جس کو اللہ تعالیٰ نے کافروں پر مسلط کر رکھا ہے۔"

حضرت خالدؓ کی تلوار نے اپنے مالک کو بعض مشکلات سے بھی دوچار کیا۔ فتح مکہ کے بعد جب نبی ﷺ نے انھیں مکہ کے قریب بعض قبائل کی طرف

روانہ کیا تو آپ ﷺ نے انھیں فرمایا:

انی ابعثک داعیا لا مقاتلا ''میں تمھیں ایک داعی بنا کر بھیج رہا ہوں نہ کہ لڑنے والا!''

گویا تلوار ان کے معاملے پر غالب آ گئی تھی اور اس نے انھیں ایک جنگجو بنا دیا تھا۔ ان سے ایسے داعی کا کردار چھین لیا تھا جس کی رسول اللہ ﷺ نے انھیں نصیحت کی اور جب رسول اللہ ﷺ کو حضرت خالدؓ کی ایک سنگین غلطی کی خبر ملی تو آپ ﷺ اس پر افسوس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ ﷺ قبلہ رو ہو کر دست بہ دعا ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اللہ سے معافی مانگنے لگے کہ:

اللھم انی ابرا الیک مما صنع خالد

''اے اللہ میں اس فعل کی تیرے حضور براءت پیش کرتا ہوں جو خالدؓ سے ہو گیا ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا اور انھوں نے متعلقہ لوگوں کو خون بہا (دیت) دیا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ غیر معمولی طاقت کے مالک تھے۔ کفر و شرک کے پورے عالم قدیم کو منہدم کر دینے کے شدید شوق نے اس طاقت کو تیز تر کر دیا تھا۔ اگر ہم انھیں دیکھیں کہ وہ عُزّیٰ کے اس بت کو پاش پاش کر رہے ہیں جس کے انہدام کے لیے رسول اللہ ﷺ نے انھیں بھیجا تھا تو وہ یہ کام کر کے چھوڑتے ہیں۔ جب ہم انھیں پتھر کے اس بت پر اپنے کدال سے ضرب لگاتے دیکھتے ہیں تو وہ ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی لشکر کے خلاف پوری قوت کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہوں۔ وہ اپنے دائیں بائیں اور سامنے ہر طرف سے ضرب لگاتے ہیں اور اس بت سے ٹوٹ کر بکھرنے والے سنگ ریزوں اور گرنے والی مٹی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

یا عزّیٰ کفرانک، لا سبحانک

انی رایت اللہ قد اھانک

''اے عزّیٰ میں تجھے نہیں مانتا، نہ تجھے پاک سمجھتا ہوں میں نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ نے تجھے ذلیل کر کے چھوڑا ہے۔''

پھر وہ اس بت کو جلا ڈالتے ہیں اور اس سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہیں۔

حضرت خالدؓ کی نظر میں عزّیٰ کی طرح شرک کے دیگر مظاہر اور باقیات کا اس جہان تو میں کوئی مقام نہیں تھا جس کے جھنڈوں تلے آپ کھڑے تھے اور آپؓ ان چیزوں کے خاتمے کے لیے اپنی تلوار کے علاوہ کسی اور آلے کو جانتے ہی نہ تھے۔

جب ہم امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کے ساتھ مل کر اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ کاش حضرت خالدؓ کی تلوار میں رجق نہ ہوتا تو ہم انھی فاروقِ اعظم کے ساتھ مل کر ان کا یہ قول بھی دہراتے ہیں کہ:

عجزت النساء ان یلدون مثل خالد ''عورتیں خالدؓ کی مثل جننے سے عاجز ہیں۔''

حضرت خالدؓ کی وفات پر حضرت عمرؓ بہت زیادہ روئے۔ بعد میں لوگوں کو علم ہوا کہ وہ صرف ان کی موت پر نہیں رو رہے تھے بلکہ اس موقع کے ضائع ہو جانے کو رو رہے تھے کہ وہ لوگوں کو آزما لینے کے بعد دوبارہ حضرت خالدؓ کو لشکروں کی کمانڈ سونپنا چاہتے تھے لیکن موت نے انھیں یہ موقع نہ دیا۔

وہ شخص جس نے معیت رسول ﷺ میں جہاد کیا۔ مرتدین کا قلع قمع کیا۔ ایران و روم کے تخت زمین بوس کیے اور قدم قدم زمین کو ناپتے ہوئے عراق کو فتح کیا۔ پھر اسی تسلسل کے ساتھ سرزمین شام کی ارض پیمائی کی اور اسے بھی فتح کر کے چھوڑا۔ وہ امیر ہوتے ہوئے سپاہیانہ تواضع رکھتے تھے اور سپاہی ہوتے ہوئے قائدانہ ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تھے۔

بطلِ عظیم کا غم اور افسوس

وہ اپنی زندگی کے ایک غم کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''میں فلاں فلاں لشکر میں حاضر رہا ہوں، میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں تلوار کی کوئی ضرب، نیزے کی کوئی چبھن یا تیر کا کوئی گھاؤ نہ لگا ہو۔

اور آج...... آج میں کوئی ضرب یا زخم کھائے بغیر اس طرح بستر پر جان دے رہا ہوں جس طرح اونٹ مرتا ہے (بہر حال) اب بزدلوں کو نیند نہیں آ سکتی۔''

آپؓ جب لمحات رحلت کا استقبال کر رہے تھے تو وصیت لکھوانا شروع کی۔ قارئین کرام! کیا آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے کس کے بارے میں وصیت کی؟

اگر نہیں معلوم تو جان لیجیے کہ انھوں نے حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں وصیت کی تھی!

کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا ترکہ کیا تھا؟ معلوم نہیں تو سن لیں کہ ان کا ترکہ گھوڑا اور اسلحہ تھا!

کچھ اور بھی......؟ ہرگز نہیں۔ بالکل کوئی ایسی چیز ان کا ترکہ نہیں تھی جس کو لوگ جمع کرتے اور ملکیت بناتے ہیں۔

دنیا کی ایک چیز تھی جس کے وہ اسقدر حریص تھے کہ اس کے لیے جان کی بازی لگانے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ یہ چیز ان کی ٹوپی تھی۔

جنگ یرموک کے روز یہ ٹوپی ان سے گر گئی تو وہ حد درجہ مغموم ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ ایک ٹوپی کی خاطر اتنا غم کر رہے ہو، فرمایا ''اس میں رسول اللہ ﷺ کی پیشانی مبارک کے کچھ بال تھے اور میں ان کے ذریعے نیک فال لیتا اور فتح حاصل کرتا تھا۔''

جب بطلِ اسلام کا جنازہ ساتھیوں کے کندھوں پر سوار سوئے مدفن جا رہا تھا تو آپؓ کی ماں نے پُرعزم نظروں اور غمگین دل کے ساتھ آپؓ کو الوداع کرتے ہوئے کہا:

انت خیر من الف الف من القوم
اذا ما کبت وجوہ الرجال

اشجاع؟ فانت اشجع من لیث
غضنفر یذود عن اشبال

اجواد؟ فانت اجود من سیل
غامر یسیل بین الجبال

''جب جنگ میں بہادروں کے منہ مُڑ جاتے تھے تو تُو قوم کے لاکھوں آدمیوں سے طاقت ور ثابت ہوتا تھا۔''

''بہادروں کی بات کروں تو تُو اس شیر سے بھی بڑھ کر بہادر ہے جو دشمن کو اپنے بچوں سے پوری شدت کے ساتھ دور کر دیتا ہے۔''

''فیاضوں کی بات کروں تو، تُو اس سیلاب تند جولاں سے بڑھ کر فیاض ہے جو پہاڑوں کے درمیان بہتا ہے۔''

حضرت عمرؓ نے ام خالدؓ کے یہ الفاظ سنے تو آپؓ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ کہنے لگے: ''تو نے سچ کہا ہے۔ اللہ کی قسم! وہ ایسا ہی تھا۔''

■ ■ ■

عفوودرگزر

اٹھ گیا کیا؟

ایک قاتل کی دلدوز داستان، وہ اپنے بچوں کو پرندوں کے چوزوں کی طرح صحرا میں تنہا چھوڑ کر سزا پانے چلا تھا

حافظ ذوہیب طیب

دو نوجوان حضرت عمرؓ کی محفل میں داخل ہوتے ہی محفل میں بیٹھے ایک شخص کے سامنے جا کھڑے ہوتے اور اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں:

"اے امیر المومنین! یہ ہے وہ شخص جس نے ہمارے باپ کو قتل کیا۔"

حضرت عمرؓ اس شخص سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ واقعی تو نے ان نوجوانوں کے باپ کو قتل کیا؟

اس شخص نے جواب دیا: "امیر المومنینؓ! ان کا باپ اپنے اونٹ سمیت میرے کھیت میں داخل ہوا۔ میں نے منع کیا، وہ باز نہیں آیا تو میں نے ایک پتھر دے مارا جو سیدھا اس کے سر میں لگا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا، پھر تو قصاص دینا پڑے گا اور اس کی سزا تو موت ہے۔ اس نے عرض کیا: "اے امیر المومنینؓ! اس کے نام سے جس کے حکم سے یہ زمین و آسمان قائم ہیں، مجھے صحرا میں واپس اپنی بیوی بچوں کے پاس جانے دیجیے تاکہ میں انھیں بتا آؤں، میں قتل کر دیا جاؤں گا۔ ان کا اللہ اور میرے سوا کوئی آسرا نہیں، میں پھر واپس آجاؤں گا۔"

سیدنا عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ کون ہے جو تیری ضمانت دے گا کہ تو صحرا جا کے واپس بھی آئے گا؟

مجمع پر خاموشی چھا جاتی ہے، کوئی بھی تو ایسا نہیں جو اس کے نام تک سے واقف ہو۔ قبیلے، خیمے اور گھر کے بارے میں جاننا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کی کون ضمانت دے؟ کیا یہ دس درہم کے ادھار، زمین کے ٹکڑے یا کسی اونٹ کے سودے کی ضمانت کا معاملہ ہے؟ نہیں، ادھر تو ایک گردن کی ضمانت دینے کی بات ہے جسے تلوار سے اڑا دیا جاتا ہے۔ پھر ایسا کوئی بھی تو نہیں جو اللہ کی شریعت کی تنفیذ کے معاملے پر عمرؓ سے اعتراض کرے یا پھر اس شخص کی سفارش کرنے کھڑا ہو جائے۔ محفل میں موجود اصحابؓ پر خاموشی چھا گئی۔

صورت حال سے خود عمرؓ بھی متاثر ہیں کیونکہ اس شخص کی حالت نے سب ہی کو حیرت میں ڈال کے رکھ دیا۔ کیا واقعی اسے قتل کر کے اس کے بچوں کو بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے؟ یا پھر اس کو بغیر ضمانت کے واپس جانے دیا جائے؟

حضرت عمرؓ سر جھکائے افسردہ بیٹھے ہیں۔ پھر سر اٹھا کے التجا بھری نظروں سے نوجوانوں کی طرف دیکھتے اور فرماتے ہیں: "معاف کر دو اس شخص کو۔"

"نہیں امیر المومنینؓ! جس نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہم اسے معاف نہیں کر سکتے۔" نوجوان اپنا آخری فیصلہ بغیر کسی جھجک کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

عمرؓ پھر مجمع کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے پوچھتے ہیں، "اے لوگو! تم میں ہے کوئی جو اس کی ضمانت دے سکے؟"

حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے زہد و صدق سے بھرپور بڑھاپے کے ساتھ کھڑے ہوتے اور فرماتے ہیں "میں اس شخص کی ضمانت دیتا ہوں۔"

سیدنا عمرؓ کہتے ہیں: "ابوذرؓ! اس نے قتل کیا ہے۔"

"چاہے قتل ہی کیا ہو" ابوذرؓ اپنا اٹل فیصلہ سناتے ہیں۔ عمرؓ فرماتے ہیں:

"ابوذرؓ دیکھ لو! اگر یہ تین دن میں لوٹ کے نہ آیا تو مجھے تیری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔"

ابوذرؓ اپنے فیصلے پر ڈٹے ہوئے فرماتے ہیں "اے امیر المومنینؓ! پھر اللہ مالک ہے۔"

یوں سیدنا عمرؓ سے تین دن کی مہلت پا کے وہ شخص رخصت ہو جاتا ہے۔ تین راتوں کے بعد نماز عصر کے وقت شہر میں الصلاۃ الجامعہ کی منادی کو نجتی ہے۔ نوجوان اپنے باپ کا قصاص لینے کے لیے بے چین ہیں۔ مجمع اللہ کی شریعت کو نافذ ہوتا دیکھنے جمع ہے۔ ابوذرؓ بھی تشریف لاتے اور عمرؓ کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔

"کدھر ہے وہ آدمی؟" عمرؓ ابوذرؓ سے سوال کرتے ہیں۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں اے امیر المومنینؓ!" ابوذرؓ مختصر جواب دیتے اور آسمان کی جانب دیکھنا شروع ہو جاتے ہیں جہاں سورج ڈوبنے کی جلدی میں ہے۔ محفل میں ہُو کا عالم ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ آج کیا ہونے جا رہا ہے۔ بالآخر مغرب سے کچھ لحات قبل وہ شخص ہانپتا کانپتا آجاتا ہے۔ عمرؓ اس سے مخاطب ہو کے فرماتے ہیں: "اے شخص! اگر تو لوٹ کے نہ بھی آتا تو ہم نے تیرا کیا کر لینا تھا، یہاں کوئی نہ تو تیرا گھر جانتا تھا اور نہ ہی کوئی تیرا اتا پتا۔"

آدمی نے جواب دیا: "امیر المومنینؓ! اللہ کی قسم، بات آپ کی نہیں، اس ذات کی ہے جو سب ظاہر و پوشیدہ کے بارے میں جانتا ہے۔ دیکھ لیجیے، میں آگیا ہوں، اپنے بچوں کو چوزوں کی طرح صحرا میں تنہا چھوڑ کے، جہاں نہ درخت کا سایہ ہے اور نہ ہی پانی کا نام و نشان۔ میں قتل کیے جانے کے لیے حاضر ہوں۔ مجھے بس یہ ڈر تھا کہ کوئی یہ نہ کہہ دے، اب لوگوں میں سے وعدوں کا ایفا ہی اٹھ گیا۔"

سیدنا عمرؓ نے ابوذر غفاریؓ کی طرف رخ کر کے پوچھا "آپؓ نے کس بنا پر اس شخص کی ضمانت دی تھی؟"

ابوذرؓ نے فرمایا: "اے عمرؓ! مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے، اب لوگوں میں سے خیر ہی اٹھا لی گئی ہے۔"

عمرؓ ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر نوجوانوں سے پوچھا کہ اب کیا کہتے ہو؟

نوجوانوں نے روتے ہوئے جواب دیا: "اے امیر المومنینؓ! ہم اس کی صداقت کی وجہ سے اسے معاف

کرتے ہیں؟ ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ اب لوگوں میں سے عفو و درگزر ہی اٹھ گیا۔"

قارئین! یہ واقعہ سنے کئی دن گزر چکے۔ میں اس سوال کے جواب کا متلاشی ہوں کہ ہم بھی تو اسی نبی مہربان ﷺ کے امتی ہونے کے دعویدار ہیں کہ جس میں عمرؓ، ابوذرؓ اور ان جیسے ہزاروں خوش بخت لوگ شامل تھے۔ لیکن ان میں اور ہم میں آخر اتنا فرق کیوں پیدا ہو گیا؟ وہ اپنے ہر فیصلے سے پہلے اس بات کا لحاظ رکھا کرتے تھے کہ اس پر اللہ اور لوگوں کا ردعمل کیا ہو گا؟ یہی وجہ ہے کہ آج ہندو، سکھ اور یہودی سمیت سبھی اقوام عمرؓ کے عدل کو مثال کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنے ہی بے گناہ بھائیوں کو سرعام موت کے گھاٹ اتارتے دیکھ رہے ہیں۔

عدالتیں سزا کے ان سطالبوں پر مبنی مقدمات سے بھری ہیں جو برسوں لوگوں کو اذیت اور عذاب سے دوچار رکھتے ہیں۔ وہاں موجود لوگوں کی زندگیاں اور دل نفرت سے بھرے رہتے ہیں۔ یہ کیسا نظام عدل ہے جس میں اور جس کے لیے کام کرنے والوں کے دل ہی نہیں ہیں؟

ہمارے لوگوں کو ضرور سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے کہ اسلام اور اسلامی شخصیات کی زندگی کی کہکشاں جو ہمدردی، غم گساری، اور معافی سے سجی ہے ہمارے ہاں بدلے پر تل جانے والے فریق سے معاملات، سلیقے اور درگزر کی بنیاد پر سلجھانے اور نمٹانے پر آمادہ کرنے کا نہ کوئی نظام باقی رہا ہے نہ خواہش۔ جج اور عدالتیں صرف بے زبان قانون اور کتابوں کا نام نہیں، ان کا بھی تو دل ہوتا ہے اور ان کے اندر بھی روح ہونی چاہیے۔

■■■

حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا

دنیا کی فکروں کا اندھیرا ہے اور آخرت کی فکروں کا نور۔

جب تم لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھو تو ان میں شامل ہو جاؤ اور جب برے کاموں میں مصروف دیکھو تو ان سے علیحدہ ہو جاؤ۔

انسان کتنا ہی مفلوک الحال ہو مگر مضطرب الحال نہ بنے۔

افضل ترین ایمان یہ ہے کہ تو خدا کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھے۔

تلوار کا زخم بدن پر لگتا ہے مگر بری عادت کا زخم روح پر۔

سخاوت پھل ہے مال کا، عمل پھل ہے علم کا، رضائے الٰہی پھل ہے اخلاق کا۔

ہر وہ کام دنیا ہے جس سے آخرت مقصود نہ ہو خواہ نماز جیسی نیکی ہی کیوں نہ ہو۔

دنیائے فانی کی لذتیں لینے سے عالم باقی کے اجر و ثواب میں کمی ہو جاتی ہے۔

حیا کے ساتھ تمام نیکیاں اور بے حیائی کے ساتھ تمام بدیاں وابستہ ہیں۔

بدگوئی تین آدمیوں کو مجروح کرتا ہے، اول اپنے آپ کو، دوم جس کی برائی کرتا ہے، سوم جو اس کی برائی سنتا ہے۔

حاجت مند غربا کا تمھارے پاس آنا خدا کا انعام ہے۔

اے انسان! اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے لیے پیدا کیا ہے تو دوسروں کا ہونا چاہتا ہے۔

اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھ اور اپنے گناہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈر۔

اگر تو معبود حقیقی کی پرستش نہیں کرنا چاہتا تو اس کی بنائی ہوئی چیزوں کو بھی استعمال نہ کر۔

اپنا بوجھ خلقت میں سے کسی پر نہ رکھو، نہ کم نہ زیادہ۔

دوسروں کا بوجھ اٹھانا اللہ والوں کا خاصہ ہے۔

("تذکرہ معارف"، انتخاب: مریم نور، لاہور)

دنیا کے سب سے بڑے قید خانے کا سفر

چودہ دن

مصریوں اور فلسطینیوں کے ساتھ

60 سالہ آمریت کے پنجوں سے رہائی کے بعد مصری کن آزمائشوں سے گزر رہے ہیں؟ اسرائیلی طاقت و ہیبت کا طلسم توڑ کر فلسطینی کن امنگوں سے سرشار ہیں۔۔۔ عرب بہار کے بعد قاہرہ و غزہ جانے والے پہلے پاکستانی صحافی کے چشم کشا سفر کا احوال

اختر عباس

اچانک ایک ایسے سفر کی دعوت ملی کہ جس کا صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ بے شک یہ سفر حیرت، اسرار اور بے یقینی سے لبالب تھا۔ یہ ایک منفرد و مختلف اور تحیر انگیز سفر تھا۔ کچھ بھی یقینی نہیں تھا اور سب کچھ یقینی تھا۔ فلسطین انتفاضہ غزہ سے دعوت تھی۔ وہاں جانے کے لیے مصر سے گزرنا تھا۔ جو آتش فشاں کا دہانہ بنا ہوا تھا۔ قاہرہ کا التحریر چوک مسلسل مظاہرین کے قبضے اور میڈیا ان کے نرغے میں تھا۔ خبریں سن سن کر لگتا تھا قاہرہ میں اتنی سیاسی تپش میں اہم لوگوں سے کیسے ملا جا سکے گا۔ اہرام مصر جا کر فراعین سے ملاقات کیونکر ہو سکے گی۔ دریائے نیل کے کنارے کوئی حسین شام کیسے اپنا مہمان کرے گی۔ قاہرہ اور پورٹ سعید کے فٹ بال میچ کے بعد سے حالت جنگ میں تھے۔ پورٹ سعید والوں نے قاہرہ سے ٹیم کے ساتھ آئے مہمانوں اور تماشائیوں کو اسٹیڈیم کے اندر گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ 72 لاشیں گنی جا سکیں۔ عدالت نے 22 قاتلوں کی پھانسی کا اعلان کیا تو احتجاجی مظاہروں کے دوران مزید 40 لوگ اپنی زندگی ہار گئے۔ پوری دنیا سے کوئی ملک مصر کو قرضہ دینے پر تیار نہیں، سعودی عرب سمیت عالم اسلام سے کئی قدم دور کھڑا، اخوان المسلمون سے تعلق رکھنے والے صدر مرسی کو اقتدار کے شیر کی سواری کرتے حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ اس لاتعلقی نے معیشت کو بٹھا کر رکھ چھوڑا ہے۔ شریف النفس صدر مرسی میڈیا کے تیروں سے چھلنی دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہا تھا۔ ایک وقت میں کئی کئی محاذوں پر لڑنا، کتنی مشکلیں اور دیکھ پائے گا، ہر طرف بے یقینی کی گرد سے اٹے سوال تھے۔

قطر ایئرویز کی ایئربس بادلوں کو چیرتی نیچے آ رہی تھی اور میں حیرت سے کبھی سامنے سکرین پر تیزی سے گھٹتے اعداد و شمار کو دیکھتا اور کبھی اپنے دائیں جانب قاہرہ شہر ڈھونڈتا۔ دن کے بارہ بجے سورج جس شدت سے چمک رہا تھا، جہاز کے اندر اندازہ کرنا مشکل تھا مگر نیچے صحرا چمک رہا تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی، پھر اس میں ایک لکیر نظر آنے لگی۔ یہ دریائے نیل کے آثار تھے۔ مصر کا دارالحکومت قاہرہ اس دریا کے ڈیلٹا پر واقع ہے۔

دوحا ایئرپورٹ کی خوبصورتی اور کشادگی کے بعد قاہرہ ایئرپورٹ کا آنکھوں میں اترنا کافی مشکل ہو رہا تھا۔ جہاز نے یونہی ٹہلتے سے رن وے کے ایک کونے کو اپنے آرام کے لیے پسند کیا، اندر بے چینی اور بے آرامی کا ایک طوفان آ گیا۔ جہاز رکنے کے بعد دروازے کھلنے میں ہمیشہ ہی سے پچیس منٹ لگتے ہیں۔ جلد باز لوگ یہ سارا وقت کھڑے ہو کر گزارتے ہیں۔

ایئرپورٹ کے اندر ایک فرعون کے بڑے سے ہورڈنگ پہ نگاہیں پڑیں۔ کچھ سپاہی اس عہد کی ٹوپیاں پہنے نظر آئے۔

اپنے سفر کے پہلے مرحلے میں ہم فرعونوں کے درمیان پہنچ چکے۔ میں نے ہمسفر ڈاکٹر انتظار بٹ سے کہا مصر اور فراعین مصر اس قدر لازم و ملزوم رہے ہیں کہ ان کے بنا مصر کا تصور ہی محال ہے۔ کم سے کم پانچ ہزار سال سے تو یہی صورتحال ہے۔ یوں سمجھیے جیسے عراق کے شہر بابل کو انسانی تہذیب کا پہلا مسکن قرار دیا جاتا ہے اسی طرح وادی نیل کو انسان کا پہلا جنم کدہ مانا جاتا ہے۔ مورخین کا اصرار ہے کہ فراعین مصر سے سات لاکھ سال پہلے مصر میں انسانی ارتقا کے مظاہر، شواہد اور باقیات ثبوت کے طور پہ دستیاب ہیں۔ سوچا تھا مصر کے سیاسی و سماجی حالات کے ساتھ ساتھ، لگے ہاتھوں دو چار ثبوت اس کے بھی دیکھ لیں گے۔

مصر سے جڑی یادیں

ہمیں جس پہلے مصری سے واسطہ پڑا، اس کے

عرب سپرنگ کے بعد التحریر چوک سے جنم لینے والی عظیم عوامی جدوجہد نے مصر کی قیادت تو بدل دی تھی مگر یہ پارہ صفت لوگ اب کیا چاہ رہے ہیں۔ ان کو سننے، دیکھنے اور قریب سے جاننے کا عملاً اب تک کسی پاکستانی صحافی کو موقع نہیں ملا تھا۔ صحافتی زبان میں یہ شاندار سکوپ ہو سکتا تھا۔ اصل سفر اس سب کے بعد تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی جیل غزہ کا سفر، وہ غزہ جو اسرائیلی جارحیت کے نشانوں اور عذابوں سے داغ داغ ہے۔ جو تاریخ کے ان سینکڑوں سال پرانے بے رحم بادشاہوں کے جنوبی لشکروں کے محاصرے میں آئے شہروں میں بسنے والے معصوم لوگوں کی طرح بے بسی سے بھوک اور پیاس سے زیادہ جان جانے کے خوف میں سالوں سے جکڑا ہے۔ وہاں جانا اور واپس آنا دونوں ہی آسان نہ تھا۔ اب تک کوئی پاکستانی صحافی تو وہاں نہیں پہنچ پایا تھا۔ وہاں جانا ممکن ہی کب تھا۔ پہلے اسرائیلی قبضہ اور پھر طویل محاصرہ، دنیا سے براہ راست رابطہ ہی ممکن نہ تھا۔

جیسے ہی عالم اسلام کے 35 ممالک میں ڈاکٹروں کی تنظیموں FIMA-save vision کے ایک تین رکنی وفد کو اسے عملی کر دکھایا۔ فلسطین کے وزیر صحت ڈاکٹر مفید اس کے میزبان بننے والے تھے۔ اس وفد میں تین ماہر ترین آئی سرجن اور ایک میڈیا ایڈوائزر شامل تھے جس کا قرعہ قدرت نے میرے نام ڈالا تھا۔

مصر اور مصر کے فرعونوں کے ساتھ دس دن کیسے گزرے، واپسی کے بعد اب تک یقین نہیں آ رہا۔ غزہ فلسطین میں گزرے چار شاندار دنوں کی تو بات ہی چھوڑیے یہ تو کسی اور دنیا کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں غم کے کل دس حصے ہیں۔ ان میں سے نو حصے فلسطین کو نصیب ہوئے ہیں اور باقی ایک حصہ پوری دنیا کو۔ غزہ میں گزرے چار دن کتنی ہی حیرتوں، دکھوں، ہمتوں اور باہم جڑے ہوئے بہادر لوگوں کی زندگی کے مشاہدوں اور داستانوں سے عبارت ہیں۔ ایسے باہمت لوگ کہاں ملتے ہیں جو موت کے انتظار میں جیتے ہوں، مسکراتے ہوں، منصوبے بناتے ہوں اور اپنے رب کی رحمت کی آس لیے راکھ میں پھول اگاتے ہوں۔

چہرے پر تھکاوٹ اور اکتاہٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ اس نے پاسپورٹ دیکھا، پھر پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ کہاں سے آئے ہو اور مہر لگا دی۔ مصر میں باقاعدہ انٹری ہو چکی تھی۔ مصر سے میرے تعارف میں قاری عبدالباسط عبدالصمد، جامعہ الازہر، اہرام مصر، ام کلثوم، محمد حسنین ہیکل، دریائے نیل، صحرائے سینا، کوہ طور، اخوان المسلمون اور ان پر نصف صدی کی سختیاں اور

گزشتہ 60 سالوں میں دو صدور کی مضبوط آمرانہ حکومتیں۔ پاکستان سے پی آئی اے کی پہلی فلائٹ جو قاہرہ آئی تھی، تقریباً اپنے سارے مسافروں کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ 1974ء میں ہونے والی سربراہی کانفرنس میں صدر انورالسادات لاہور آیا اور اب چالیس سال بعد صدر محمد مرسی کا پاکستان

کے دورہ کا پروگرام شامل تھے۔

پہلے ہی قدم پر مسئلہ ہو گیا

کسی ملک کے بارے میں آپ نے جتنا بھی سنا اور پڑھا ہو، مشاہدے کے بعد ہی اس کی اصل شکل سامنے آتی ہے۔ مصریوں سے قربت تو پہلی بار ہونے جا رہی تھی اور رائے کیا بنتی، پہلے قدم پر ایک چھوٹے سے فرعون کی وجہ سے ہی مسئلہ کھڑا ہو چکا تھا۔ سامان لیکر ہم جب باہر نکلنے والے تھے تو اچانک ایک کسٹم آفیسر نے روک لیا۔ اس کے معاون سامان سے بھرے بکسوں کو آپریشن تھیٹر میں لیٹے مریض کی طرح بڑی بے رحمی سے جانچ رہے تھے۔ یہ کیا ہیں؟ اس نے آپریشن کے آلات اور دیگر سامان کو دیکھ کر پوچھا۔ ڈاکٹر عمران نے آگے بڑھ کر انھیں بتایا کہ یہ آنکھوں کی سرجری کا سامان ہے اور ہم آئی سرجن مصر اور غزہ کیلئے بطور عطیہ لائے ہیں۔ اس نے ثبوت مانگا وہ دے دیے گئے۔ اس نے سامان کی لسٹ مانگی، پی او بی کے چیئرمین ڈاکٹر انتظار بٹ نے فٹ سے وہ بھی فراہم کر دی۔ تب اس نے کہا کہ ان سب کی قیمت بھی بتائیے۔ اسے سمجھانے کی کوشش میں دو گھنٹے مزید ضائع ہو چکے تھے۔ اس کوفت نے بھوک کو بری طرح چمکا دیا تھا اور وہاں آس پاس کھانے کی کسی چیز کے ملنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ کسٹمز لاؤنج سے باہر منتظر میزبانوں کو فون پر اطلاع ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ رات تین بجے لاہور سے روانگی کی تیاری کے دوران اہلیہ کو بڑی خاموشی سے اس میں کچھ ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ اب جو دیکھا تو آنکھیں خوشی اور اطمینان سے روشن ہو گئیں اور ہونٹوں سے اس کیلئے دعا نکلی۔ وہاں چار عدد سیب اور چار عدد ہی صحت مند چمکتے اور دھلے ہوئے کوڑے تھے۔ وہ عدد کو نکال کر باہم بانٹ کھائے۔ اندر تک اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی تھی کہ کچھ دیر اور بھی رکنا پڑا تو خیر ہے۔

مصر میں پہلی نماز

نماز کیلئے ایک کمرے میں کسٹمز والوں نے جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وضو کیلئے واش روم گیا تو وہاں دو نو عمر سپاہی کھڑے باہم مصروف گفتگو تھے۔ مصری آپس میں گفتگو یوں کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کو لگتا ہے ابھی لڑ پڑیں گے۔ گفتگو میں بلند آہنگی اور تیزی آنے والے دنوں میں بھی ہم نے ہر جگہ پائی۔ میں نے ان کی سیاہ یونیفارم اور سر پر فرعونی قسم کی ٹوپیاں دیکھ کر تصویر بنانے کی تکلفاً اجازت چاہی۔ خیال تھا کہ سیاحوں کا ملک ہے، یہ تو ان کا معمول ہوگا۔ مگر دونوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولے ڈیوٹی۔ پھر یوں اشارہ کیا گویا وہ تو لٹکا ہی دیے جائیں گے۔ ان کو کسی مشکل میں ڈالے بنا میں آگے بڑھ گیا۔ ایئرپورٹ پر جہاں جہاں مصری لڑکیاں نظر آئیں، غور کرنے پر اجتماعی طور پر ہی ان کو کافی "بولڈ" پایا۔ سوچا ممکن ہے کہ یہ صنعت مندی نوکری کی ضرورت ہو مگر پھر حیرت تھی کہ اتنی تنگ یونیفارم میں گھسی کیسے ہوں گی۔ یہ حیرت اسی شام دور ہو گئی جب اس عمومی منظر کی وجہ معلوم ہوئی۔

مسجد میں پہنچا تو کمال منظر تھا۔ محلے کے لوگ اور نمازی مسلسل آ رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دو دو تین تین لوگوں کی "جماعتیں" ہو رہی تھیں۔ مصر میں قیام کے دوران اس منظر کو زندگی کا لازم حصہ دیکھا۔ جماعت کے بنا نماز پڑھنے کا تصور ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو مسجد کے مولوی صاحب کے خوف سے ان کی امامت کے علاوہ جماعت کروانا اچھا خاصا مسئلہ بن جاتا ہے۔ سو سو دلائل دے کر روکا جاتا ہے۔ اور اپنے محدود

تصور دین کے باعث نمازیوں کو جماعت کے ستائیس گنا ثواب سے ہی بہرحال محروم کر دیا جاتا ہے۔

قاہرہ سے ملاقات

ایئرپورٹ سے نکلے تو چار بجنے کو تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سر سے بوجھ اترا تھا یا مزید چڑھ گیا تھا۔ چونکہ ادویات و سامان انھوں نے روک لیا تھا، اتنی کشادہ پارکنگ دیکھ کر ایک ہی خیال آیا کتنا اچھا ہوتا کسٹم آفیسر ضد کرنے کے بجائے کشادہ دلی پہ آمادہ ہوتا تو اتنا وقت ضائع نہ ہوتا۔ گاڑی ایئرپورٹ سے نکل کر سیدھی سڑک پر اڑی جا رہی تھی۔ ایئرپورٹ شہر سے کافی باہر ہے۔ سڑک پر بڑے بڑے ہورڈنگ لگے تھے۔ "محبوب عرب" یہ "عرب آئیڈل" کا ترجمہ تھا کسی MBC ٹی وی کی طرف سے۔ ایک دوسرے ٹی وی چینل cbc کا اشتہار بھی متوجہ کر رہا تھا۔ "عرب ٹیلنٹ کی تلاش" ایکس فیکٹر، چار جج، دو لڑکے دو لڑکیوں کی بہت ہی ماڈرن تصاویر بھی تھیں۔ ایسے ہی پروگراموں کی ان دنوں انڈین چینلز پر بھرمار ہے۔

ڈاکٹر خالد حنفی سے ملاقات

التحریر چوک رکے بغیر ہم آگے گزر گئے۔ ذرا آگے دریائے نیل کے کنارے اچانک گاڑی رک گئی۔ ایک مسکراتا ہوا صاحب سا مصری ڈاکٹر فٹ پاتھ پر کھڑا ہمارا استقبال کر رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر خالد حنفی تھے۔ مصر کے ڈاکٹروں کی تنظیم کے رہنما۔ اہلاً و سہلاً مرحبا کے جملے اہل مصر بار بار استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان سے روانگی سے ایک روز قبل برادر عبدالغفار عزیز نے مصر کے تین چار اہم لوگوں کو فون کر دیے تھے۔ ان میں سے ایک عبدالرحمن الرزی نے ہی ہمیں ایئرپورٹ سے لیا تھا اور ہوٹل المعادی پہنچنے سے پہلے ہمارے وفد کے چاروں اراکین کو ووڈا فون کی نئی سمیں تھما دی تھیں۔

ہوٹل المعادی

دریائے نیل کے کنارے واقع 15 منزلہ ہوٹل المعادی ہمارا پہلا مستقر ٹھہرا۔ استقبالیہ پر وزارت سیاحت کی طرف سے ہوٹل کے لیے 4 ستارہ کا نشان دیوار پر آویزاں تھا۔ 12ویں منزل پہ ملنے والا کمرہ صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ پردہ اٹھایا تو دریائے نیل سکون سے بہتا نظر آیا۔ اس سے دور اہرام کے آثار تھے۔ اہرام مصر، مصری زندگی کا لازم حصہ ہیں۔ شہر سے 18 میل دور واقع ہونے کے باوجود وہ شہر کے اندر ہی ہیں۔ اپنے اپنے کمروں میں سامان رکھوا کر ہم سبھی ہوٹل کے ریستوران میں جمع ہوئے۔ کھانے کے لیے مینو میں موجود مصری ڈشوں کو اللہ کا نام لے کر آرڈر کیا۔ کھاتے جاتے تھے اور پچھتاتے جاتے تھے۔ پھیکے اور ہاف کلڈ۔ ایک آدھ کو تو دوبارہ "فل ڈن" کرایا۔ اصل مسئلہ ویٹر کو سمجھانا تھا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کھانا کھا کر ہوٹل سے باہر نکلے اور نیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ سیر کا پروگرام بنایا۔ سامنے ہی ایک مسجد تھی۔ ساتھ ہی رہائشی علاقہ، ون وے سڑک پر مجال ہے کسی نے خلاف ورزی کی ہو۔ کاروں کی اس قدر بہتات ہے کہ شمار مشکل ہے۔ ہر سڑک کے دونوں کناروں پر ہر گلی اور سڑک پر پارکنگ ہے۔ مسجد ہماری توقع سے زیادہ صاف اور خوب صورت ہے۔ پتا چلا کہ ہر مسجد پر حکومت کی طرف سے صفائی کا عملہ دن بھر کے لیے متعین رہتا ہے۔ محلے کے لوگ یہاں مسجد کی یونیفارم میں تھے، عمدہ کارپٹ اور اس سے عمدہ کرسیوں کی قطار، نماز کے بعد کچھ دیر کے لیے کرسیوں پر بیٹھے تو "جماعتوں" کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی اکیلا بھی ہوتا تو

تکبیر پڑھ کر کھڑا ہو جاتا فوراً ہی اسے مقتدی مل جاتا۔ قاہرہ سے تعارف کے لیے زیادہ انتظار نہیں ہو سکا اور بٹ صاحب کے ساتھ پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر عمران غیور (کراچی) اور ڈاکٹر عمران صحاف (لاہور) آرام کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کنارے نیل کے ہم نے کیا دیکھا

ہوٹل سے نکل کر ہم نے پہلی احتیاط تو یہ کی کہ سڑک اور دکانوں کی نشانیاں یاد کیں تا کہ واپسی پہ بخیر و عافیت پہنچ سکیں ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ چاروں طرف ایک سی سڑکیں، ایک سی دکانیں، ایک سے نام اور قریباً ایک سی اونچائی والی عمارتوں میں ہم واپسی پہ ہوٹل بھی تلاش کرتے رہتے۔ مزید احتیاط یہ کی کہ ہوٹل کا کارڈ بھی جیب میں ڈال لیا۔ دریائے نیل نے اپنے چمکتے پانیوں اور خوشگوار ہواؤں سے ہمارا استقبال کیا۔ یہ وہی نیل ہے جس میں کبھی حضرت موسیٰ کو ان کی والدہ نے بہایا تھا اور سالوں بعد اللہ کے حکم پر انھیں رستہ دیا تھا اور فرعون کو ڈبو دیا تھا۔ نیل مصر کی شہری اور زرعی زندگی کا ہی نہیں، خوب صورت معاشرت کا بھی لازم حصہ ہے۔

جگہ جگہ چھوٹے بحری جہاز (کروز) پانی کے اندر کھڑے جگمگا رہے تھے۔ جلتے بجھتے قمقمے پانی میں منعکس ہو کر عجب خوب صورتی کا باعث بن رہے تھے۔ ہم نیل کنارے چلتے رہے۔ مختلف کلبوں کے کلب اور گارڈن ہمیں روک روک کر اپنا تعارف کراتے رہے۔ ایک کروز نے تو ہمیں بلا ہی لیا اور اوپر جا کر ہم نے ڈنر کا پوچھا تو جواب ملا اوپر عرشے پر بار بی کیو ہے۔ اوپر گئے تو لمبا ہال، کرسیاں لگی ہوئیں۔ پتا چلا ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہاں لائیو کنسرٹ ہو گا۔ تعارفی تصاویر دیکھیں تو نرگس کی طرح کی ایک ڈانسر اسی کی طرح کے جھکے ہوئے پوز۔ بچاری کو کپڑے بھی کافی کم ہی دستیاب ہوئے تھے۔ یہ ایک بیلے ڈانسر تھی۔ دو سو پاؤنڈ ٹکٹ تھی، مصری پاؤنڈ ہمارے قریباً پندرہ روپے کا ہے۔ خاتون کا پیٹ لٹکا ہوا تھا۔ پتا چلا یہ موٹاپا ان کے ہاں خوبصورتی کی علامت ہے۔

اتنے میں کروز کا منیجر شو و آ گیا۔ ہمیں عرشے پر لے گیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول تھا۔ وہاں کھانا اور شو 10 بجے ہونا تھا۔ بٹ صاحب کو نجانے کیا سوجھی بولے اگر ہم پورا ہال ہی بک کرا لیں تو کیا چارج کریں گے اور کتنی رعایت کریں گے؟

"باقی دوستوں سے مشورے کے بعد بکنگ بتائیں گے" کہہ کر وہاں سے نکلے تو کانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ سڑک پہ تیز رفتار کاروں کی ہیڈ لائٹس ایک ردھم کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پہ بنچوں کی بھی کافی روشنی تھی۔ اسی روشنی میں جگہ جگہ نوجوان جوڑے لوہے کے جنگلے سے ٹیک لگائے عالمی و سماجی مسائل کو بھلا کر ذاتی مسائل حل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ خوش گمانی اچھی چیز ہے، مصری لوگ بھی اس معاملے میں کافی خوش گماں ہیں اسی لیے ہماری طرح حیرت سے مڑ مڑ کر تو بالکل نہیں دیکھتے۔ میں نے تحقیق شروع کی، بارہ تک پہنچ کر بٹ صاحب بولے "بس کریں جذبات مجروح ہونے کا امکان بڑھ رہا ہے۔" ہم باقاعدہ جذباتی لوگ ہیں۔ ہر قوم کو اپنے لحاظ سے دیکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

چکنا نہیں، تھکنا نہیں اور اکنا نہیں

ناشتہ ہم نے صبح 6 بجے کیا اور خوب کیا۔ تمام اچھے ہوٹلز میں ناشتہ کمپلیمنٹری ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عمران صحاف صاحب نے مختلف چیزیں دیکھنے کے بعد انڈے پسند کیے اور 6 انڈے کھائے۔ مجھے سب نے بار بار وہی کھاتے پکڑا حالانکہ میں نے بھی کافی چیزیں چکھی تھیں۔ افتخار بٹ صاحب دودھ اور کارن فلیکس کھاتے پائے گئے، آلو کا mash کیا ہوا سالن اور لوبیا کا baked سالن بھی چکھا، اُف بہت ہی پھیکا اور بدمزہ ہم نے وہیں چھوڑ دیا۔ بریڈ گرم کرنے کے لیے آٹومیٹک ٹوسٹر چل رہا تھا۔ بریڈ گرم کریں یا سوکھے اور میٹھے گول گول بند، وہ چلتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر عمران غیور صاحب نے کئی چیزیں کھانے کے بعد کہا، میں ابھی تک طے نہیں کر پایا کہ مجھے کیا پسند ہے؟ زیتون اور سرکے میں لگی سبزیاں کسی کو بھی پسند نہ آئیں، کافی کڑوی تھیں، زیتون کھانے کی میں نے بار بار کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ حالانکہ ان میں بڑی ورائٹی تھی مگر ذائقہ ایک جیسا بدذائقہ۔ بٹ صاحب آنکھیں بند کر کے ثواب سمجھ کر کھاتے جاتے تھے اور دہراتے جاتے تھے۔ نئی جگہ پر کھانے کا ایک ہی اصول یاد رکھیں:

"چکنا نہیں، تھکنا نہیں تے اکنا نہیں۔" (جھجک نہیں کرنا، تھکاوٹ کو قریب نہیں آنے دینا اور پریشان ہو کر چھوڑ نہیں دینا) بڑا کمال قسم کا اصول تھا۔

ڈاکٹر عمران صحاف نے کسی بارات کے ساتھ جانے کا واقعہ سنایا اور بتایا کہ راولپنڈی کے بیشتر شادی ہال اس صورت میں انکار کر دیتے ہیں اگر بارات گوجرانوالہ سے آرہی ہو، وہ دگنے پیسوں پر بھی راضی نہیں ہوتے۔ کیونکہ گوجرانوالہ کے لوگ اسی اصول پر چلتے ہیں، جو بٹ صاحب نے یاد کر رکھا ہے۔

میں نے گوجرانوالہ، گجرات کے درمیان چناب کے پل پر بنے والے ہوٹل اکبر کے مالک کا قصہ سنایا جہاں چودھری شوکت صاحب کے ساتھ کھانے کے بعد ہم ان سے ملنے ان کے آفس گئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ "رمضان میں افطار ڈنر ہونے شروع کیا تھا۔ ہفتے کے اندر اندر بند کرنا پڑا۔ فی آدمی 40 سے 50 تیتر کھا جاتا تھا۔ ہم جتنے بھی لاتے کم پڑ جاتے۔" کیونکہ کھانے والوں کے ساتھ بہت سیانے آتے تھے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی نے شرط رکھی کہ بارات کے ساتھ کوئی بزرگ نہ آئے۔ لوگ مان گئے۔ ایک بزرگ نے کہا مجھے چھپا کر لے چلو تمھارے کام آؤں گا۔ وہاں پہنچے تو 100 باراتیوں کے لیے انھوں نے 100 بکرے تیار کیے ہوئے تھے۔ شرط یہ تھی کہ سارے کھانے پڑیں گے۔ بزرگ نے کہا مان لو اور کہو کہ باری باری لیتے آئیں۔ یوں 100 بکرے ختم ہو گئے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ تمھارے دونوں ہاتھ باندھ دیے جائیں گے، اب ہاتھ سیدھے کر کے کھانا ہو گا۔ سب پریشان تھے کہ اب کیا ہو گا، کوئی نہیں کھا سکے گا۔ بزرگ نے کہا کوئی مسئلہ نہیں آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو کھلاتے جاؤ۔ میزبان گھبرا گئے کہ ہو نہ ہو کوئی سیانا ساتھ ہے۔ نوجوان اتنے دانش مند نہیں ہو سکتے۔ مزے کی بات یہ کہ ہمارے ساتھ ایسے کم سے کم دو دانش مند تو ضرور تھے۔

پاکستانی سفیر کا انکار

بٹ صاحب سامان کی وصولی کے لیے ائیر پورٹ گئے۔ خیال تھا 11 بجے تک آ جائیں گے تو سفارت خانے جائیں گے۔ ائیر پورٹ سے ادویات کسٹمز والوں نے پھر نہیں دیں۔ عرب یونین آف ڈاکٹرز کے کسی مقامی ڈاکٹر کے نام تعارفی لیٹر دے آئے ہیں۔ پاکستانی سفیر منظور الحق سے بھی بات کر آئے۔ سفیر

صاحب نے کہا "ہم فلسطین جانے کے لیے نہ تو پاسپورٹ دے سکتے ہیں نہ کوئی خط۔ سرکاری سطح پر تو کچھ نہیں ہو سکتا ہاں مصری انٹیلی جنس کے حکام ہی کچھ کریں گے۔ انھی سے رابطہ کریں۔

سلطانہ بیگم سے ملاقات

بٹ صاحب کی واپسی پر ہم دونوں اس انڈین ہوٹل کی تلاش میں نکلے جو میں نے صبح نماز فجر کے بعد سیر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو خالی تھا، پرانی انڈین دھنیں بج رہی تھیں۔ ویٹروں کے پاکستانی کپڑے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گفتگو کی تو پتا چلا کہ خالص مصری ہیں، صرف کپڑے کسی پاکستانی دوست سے بنوائے ہیں، سر پر شملہ کی ٹوپی رکھی تھی۔ انڈیا کے صوبے ہماچل میں یہ ٹوپی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں سندھ میں سندھی ٹوپی کا رواج ہے۔ یہ گول اور کڑھائی والی ہوتی ہے، چند سال پہلے "ہماچل" کے گورنر صاحب نے تحفے میں دی تھی۔ تمام کھانوں کے نام پاکستانی مگر نام انڈین ریستوران۔ ایک پلیٹر کھایا یہ سوچ کر کہ باقی کھانا دونوں بزرگوں کے ساتھ کھائیں گے جو ٹہلنے نکلے ہوئے تھے۔ ایک نے واپسی پر کہا میں تو کھاؤں گا نہیں سموسہ منگوا لیں وہ بھی گوشت کا نہ ہو۔ دوسرے نے کہا کہ میں بھی سموسہ لے لوں گا۔ چنانچہ فاسٹ فوڈ کی ایک صاف ستھری دکان پر چلے گئے اور 8 سموسے، ایک چٹنی منگوائی گئی۔ میں نے ایک سویٹ ڈش جس کا نام ام علی تھا منگوالی۔ یہ بعد میں شاہی ٹکڑے جیسی نکلی۔ سموسے چھوٹے چھوٹے تھے۔ دو دو کھا کر بھی ایسے ہی بیٹھے تھے جیسے کچھ بھی نہیں کھایا۔ پھر ہم نے ایک اور ام علی کے ساتھ ایک چاول کا بھی آرڈر دے دیا۔ چاول پہ Daughter of the sultan پڑی تھی یعنی sultana duck کا سینے کا ٹکڑا۔ خدا جانے نام اتنے مختلف کیوں رکھے ہوئے تھے۔ سلطانہ بیگم، سلطان کی بیوی، سلطان کی بیٹی، ام علی۔ یہ کھانوں کے نام تھے۔ سروس بھی کافی بُری poor تھی۔ لڑکے اچھے لباس میں تھے۔ مگر آپس کی باتوں میں زیادہ مصروف تھے۔ منی سائز سموسے چٹنی سموسے دوبارہ منگوانے پڑے۔ سلطانہ بیگم کا سینہ چاولوں پر ویسے ہی پڑا رہا۔ کسی کو بھی حوصلہ نہیں پڑا کھانے کا۔ میں تو دوبارہ اس دکان کے پاس سے بھی تیزی سے گزرتا رہا کہ کہیں سلطانہ بیگم سے دوبارہ ملاقات نہ ہو جائے۔

جمال عبدالناصر اور انور سادات سے ملاقات

عشا کی نماز پڑھ کر جوتے پہن رہا تھا کہ سیڑھیوں پر نظر گئی۔ مٹی اور سیمنٹ سے اٹے اوزار جگہ جگہ بکھرے تھے۔ وہیں سابق مصری صدر انور السادات اور فوجی انقلاب کے لیڈر کرنل جمال عبدالناصر سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں سر جھکا کر بیٹھے تھے۔ 1952ء میں جنرل نجیب نے شاہ فاروق کا تختہ الٹ کر مصر کو جمہوریہ قرار دینے کے بعد خود کو پہلا صدر بنا لیا تھا۔ اگلے ہی سال کرنل جمال عبدالناصر اس کو معزول کر کے خود صدر بن بیٹھا۔ صدر ناصر نے 70ء تک مصر پر حکمرانی کی اور دل کے دورے سے مرنے کے بعد انور السادات صدر بنا۔ صدر ناصر 67ء میں اسرائیلی فوج سے جنگ ہار کر صحرائے سینا اور غزہ کی پٹی کھو بیٹھا تھا۔ صدر سادات نے 73ء میں اس شکست کا بدلہ لے کر اسرائیل کے ساتھ صلح کر لی اور تین سال میں اپنے علاقے واپس لے لیے۔ مگر صلح کی وجہ سے اکتوبر 81ء کو ایک فوجی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

جمال عبدالناصر تو فوجی لباس میں تھے، جامعہ الازہر کے دو مفتیان ساتھ بیٹھے تھے، ساتھ سول کپڑوں

میں انور السادات بیٹھے تھے۔ سبھی نے سر جھکائے ہوئے تھے نہ جانے وہ کیمرے کو دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے عوام پہ بھی اس لیے نظر نہیں تھی۔ آمروں کا یہی معاملہ رہا ہے۔ ان کی نظریں ہمیشہ کہیں اور ہوتی ہیں۔

اصل میں یہ ایک بہت بڑی تصویر تھی۔ flex پر بنی ہوئی۔ یہ مسجد حسین صدیقی جہاں ہم نے نماز پڑھی اور جس کی نفاست اور خوبصورتی نے ہر بار قدم روک لیے تھے۔ تصویر اس مسجد کے افتتاح کے موقع کی تھی۔ وقت گزر جاتا ہے، ہیرو بدل جاتے ہیں، تصویریں رُل جاتی ہیں۔ مسجد کے خوبصورت سرخ قالین پر آخری صف نئی چمکدار اور آرام دہ کرسیوں کی تھی اور تلاوت کے لیے جدید لوہے کے رحل نما اسٹینڈ رکھے تھے۔ سفید رنگ کی جلد کے ساتھ چھپائے ہوئے قرآن جگہ جگہ سلیقے سے رکھے تھے۔ قاری صاحب کی قرأت بہت اچھی تھی۔ مصر کے قرا تو عالم اسلام میں ہمیشہ سے معروف رہے ہیں۔ عشا کے بعد کسی کا درس بھی تھا۔ 30 کے قریب لوگ بیٹھے تھے۔

اہرام مصر (خوفو، خفرا اور منکرا)

صبح ہوٹل سے باہر نکلتے ہی ایک سرخ رنگ کی کار ہماری منتظر تھی۔ اس نئی نویلی کار کے ڈرائیور کا نام تھا محمد سعید اور ہماری پہلی منزل اہرام مصر قرار پائی۔ میرا خیال تھا شہر سے باہر کسی صحرا میں جائیں گے وہاں دور تک ریت کے ٹیلے اور ان کے اندر اہرام مصر ہوں گے۔ نیل کا پل عبور کر کے پرانے شہر میں داخل ہوئے۔ ٹوٹی ہوئی سڑک، ساتھ گندا نالا جسے لوگوں نے دیواریں ہو کر اور اپنی اپنی سائیڈ کا کچرا پھینک پھینک کر اور بھی گندا کر دیا تھا۔ وہاں سے ایک گلی پھر دوسری پھر تیسری گلی سے ہوتا ہوا ڈرائیور ایک محلے کے بیچ میں ایک دکان کے باہر جا رکا۔ ایک آدمی بھاگا ہوا آیا اور بولا میں پروفیشنل گائیڈ ہوں۔ آپ کے ساتھ چلوں گا۔ یہ تانگہ لے لیں یا اونٹ، ایک ایک آدمی کے سو سو پاؤنڈ ہوں گے۔ ڈرائیور ہمیں رکے گا۔ اب ہمیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اہرام ہیں کہاں، چاروں طرف تو عمارتیں ہیں۔ کتنی دور جانا ہے، شہر کے اندر ہیں یا باہر۔

خیر بحث و تمحیص کے بعد طے ہوا کہ ایک تانگے پر دو دو لوگ بیٹھیں گے اور کل 100 پاؤنڈ دیے جائیں گے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر عمران اکرم تھے۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہے تھے۔ یہ ہمیں لے کہاں جا رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی غربت سے بھری گلیاں، چھوٹی چھوٹی محلے کی دکانیں، نانبائی کا تنور جہاں مصری روٹیوں کے ڈھیر ہر جگہ پڑے تھے۔ سنا ہے یہاں گھر میں روٹی پکانے کا کلچر ہی نہیں ہے۔ بلکہ آٹا بیچنے پر پابندی ہے۔ روٹی ہر صورت آپ کو تندور سے لینی ہے۔ ایک جگہ ہم نے دیکھا دس بارہ خواتین ایک فیکٹری کے گیٹ کے سامنے دروازے میں ہاتھ ڈال کر روٹی لے رہی تھیں۔ تانگہ ہمیں اب مین سڑک پر لے آیا۔ افسوس ہو رہا تھا کہ تانگہ کیوں لیا۔ یہاں سے آگے بھی کار آسانی سے جا سکتی تھی۔ اہرام کے گیٹ پر پہنچ کر تانگے سے اتر گئے وہاں بڑا ہی ماڈرن گیٹ ہے۔ سامان کی تلاشی کے بعد لوگ اندر جا رہے تھے۔ سیاح بہت تھے اور مصری لڑکے ان سے بھی زیادہ۔ ہم ٹکٹ پہلے ہی لے چکے تھے۔ چیکنگ کے بعد اندر داخل ہوئے۔ کھلی سیڑھیوں پہ ٹکٹ چیک ہوئے، آگے کھلا میدان تھا اور اس میدان کے بیچوں بیچ ایستادہ تین حیران کرنے والے اہرام۔ جامعہ الازہر کے زیر سایہ ایک دکاندار نے ان اہراموں کے نام لکھوائے تھے۔ خوفو، سب سے بڑا، خفرا، درمیانی اور منکرا، چھوٹا۔

اہرام مصر دیکھ کر انسان حیرت سے گم ہو جاتا ہے۔

اتنا بڑا اسٹرکچر، اتنے بڑے بڑے پتھر۔ اتنی بڑی جس اور اس قدر سر بلند، ہر طرف مٹی اڑ رہی تھی۔ گھوڑے، اونٹ اور تانگے اوپر جا رہے تھے۔ ہم دوبارہ اپنے تانگے پر سوار ہو چکے تھے۔ عینک نہ ہونے کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ مٹی تیز ہوا کے ساتھ سیدھی آنکھوں میں آ رہی تھی۔ آگے جا کر جہاں ایک ہیلی پیڈ تھا، وہاں تصویریں لی گئیں۔ ایک اونٹ والے نے بٹ صاحب کو اونٹ کے ساتھ لگا کر تصویر لینے کو کہا انھوں نے انکار کر دیا تو دونوں کی لڑائی ہو گئی۔ وہ کہے کہ میرے اونٹ سے اور اس جگہ سے ہی دور چلے جائیں۔ بٹ صاحب کا خیال اور کہنا تھا کہ تیرے باپ کی جگہ ہے۔ ہم کیوں جائیں تم چلے جاؤ۔ بڑی مشکل سے ان کو وہاں سے الگ کیا۔ وہ بدتمیز آدمی کافی بدتمیز اور اس سے زیادہ موٹا تازہ تھا۔ اسی دوران ایک لڑکے نے غیور صاحب کے سر پر اپنا پٹکا باندھ کر تصویر کھینچ دی وہ گھوڑے والا تھا۔ تصویر اچھی لگی تو اس نے پٹکا سب کو باری باری باندھ دیا۔ ہمارے تانگہ ڈرائیورز نے بھی پوز بدل بدل کر فوٹو کھینچے۔ مجھے اس نے مشورہ دیا کہ اس طرح ہاتھ موڑیں اور جھکیں کہ یوں لگے جیسے آپ کی کمنی اہرام مصر کے اوپر محسوس ہو۔ کسی فرعون نے بھی اس طرح کمنی نہیں

لگائی تھی جیسے ہم نے مزہ لے لیا۔ واپسی پر لڑکے نے پیسے مانگے، میں نے دو پاؤنڈ دے دیے۔ وہ ایک ایک سے مانگ رہا تھا۔ تانگے، گھوڑوں والے سارے جمع ہو کر اس کی سپورٹ میں بولنے لگے۔ بٹ صاحب نے بھی دیے۔ اس "بدعت" کا آغاز غیور صاحب نے کیا تھا۔ ان کے پاس ٹوٹے پیسے نہیں تھے۔ بڑبڑا رہے تھے کہ میں نے تو پہلے کہا تھا پیسے نہیں دوں گا۔ بہر حال سب کو دینے پڑے۔ نیچے دوسرے اہرام خفرا کے ہیں میں آئے تو ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے چار اہرام اور تھے۔ ان میں سے ایک کے اندر اترے۔ چوکیدار نے اس کے نقد پیسے لیے۔ یہ بہر حال فراڈ تھے، وہاں ٹکٹ نہیں تھی۔ لکڑی کا تختہ تھا۔ اس پر پاؤں رکھ کر دوہرا ہو کر نیچے اترنا تھا۔ ایک کمرے کے بعد پھر اترنا تھا۔ نیچے والے کمرے میں دو قبریں تھیں۔ خالی۔ تابوت وغیرہ نکال لیے گئے تھے۔ چھت اور دیواریں بے حد مضبوط تھیں۔ غیور صاحب تیزی میں باہر نکلتے ہوئے پھسل گئے، رات کافی تکلیف ہوئی میں نے آئل سے مالش کی۔ وہاں سے نکل کر دونوں بزرگ پوچھے بنا بڑے آرام سے خوفو کے ہیں کی طرف چل پڑے۔ وہاں دونوں تانگے والوں سے لڑائی ہو گئی کہ واپس چلو۔ بٹ صاحب نے کہا تم

ڈاکٹر عمران غیور — ڈاکٹر افتخار حسین بٹ — ڈاکٹر عمران صحاف

انھیں روک لیتے، ہم نے تو انھیں نہیں بھیجا۔ ڈاکٹر غیور صاحب کو بڑی مشکل سے واپس بلایا گیا۔ وہ آتے ہی بولے "بندہ آئے اور بڑے اہرام کے نیچے نہ جائے یہ کوئی بات ہے میں دوبارہ آیا تو سیدھا وہاں ہی جاؤں گا۔" اس پہ ہم خاموش رہے۔ کئی مقامات اور وقتاں پر خاموشی بڑی کار آمد ہوتی ہے۔ میں لاہور سے آتے ہوئے شرما شرمی میں جو گرز چھوڑ آیا تھا۔ روز ہی شدت سے وہ یاد آ رہے تھے۔ آج تو بے طرح یاد آئے۔ یہاں پوچھا تھا کم سے کم 3 ہزار میں مل رہے تھے۔ اب بندہ پوچھے کہ مٹی میں رولنے کے لیے تین ہزار خرچ کرنا کون سی عقل مندی ہے بھلا۔ اس لیے باز رہا اور سکیچرز (سکیشن) پہنے تنگ ہوتا رہا۔ یہاں ایک فلم کی شوٹنگ بھی ہو رہی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ سب کے منہ سر مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔ اپنے رنگ و روغن سے بھی ساؤتھ انڈین لگ رہے تھے۔ امید تو یہی تھی کہ وہ اپنی دھوتیاں اڑس کر اچھل کود کر کے خوب خاک اڑائیں گے اور گانا گائیں گے۔ سکرین پر ایسے گانے بہت خوشنما اور خوب صورت لگتے ہیں۔ اس میں وہ دھول مٹی اور گرمی نہیں نظر آتی جو فلم بنانے والوں نے کھائی اور جھیلی ہوتی ہے۔ اس موقع پر مجھے تو شاہ رخ اور کاجل کا گانا "سورج ہوا مدھم، چاند جلنے لگا" بہت یاد آیا۔

ابوالہول کی گھوڑیاں

تانگے والوں کو ایک دم سے وزٹ ختم کرنے کا دورہ پڑا اور انھوں نے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے۔ نیچے اترتے ہوئے گھوڑے مسلسل پھسل رہے تھے۔ سڑک اچھی خاصی ڈھلوان تھی۔ ابوالہول جس کا سر انسان کا اور دھڑ شیر کا ہے کے پاس پہنچ کر انھوں نے ہمیں یوں گھورا جیسے خود ابوالہول ہوں۔ "نماز جمعہ کا

وقت ہے" بس کرو، دیکھ تو لیا ہے۔ مت اترو، دیر ہو جائے گی۔ کبھی سیاح لڑکے لڑکیاں ابوالہول کے پاس جا رہی تھیں اور ہم گھوڑوں سے ڈر کر وہیں بیٹھے تصویریں بنا رہے تھے۔ ہمارے چاروں طرف سیاحوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک جاپانی جوڑے نے ہاتھ ملایا۔ میں نے بھی تانگے پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ ہلا دیا، اس نے مسکرا کر کہا۔ لاہور، لاہور میں نے بھی بتیسی نکال کر ہاں کیا۔ اللہ جانے اسے کیسے پتا چلا۔ اہرام کے احاطے سے باہر نکل رہے تھے تو دونوں تانگوں والوں نے ایک قریبی گلی میں روک کر کہا چپ دو، بٹ صاحب نے بہت کہا کہ گاڑی کے پاس لے چلو مگر وہ نہیں مانے اور جبراً سب سے پانچ پانچ پاؤنڈ لے کر ہٹے۔ چند لمحوں بعد گاڑی کے پاس آ گئے۔

وہاں سے پیچھے کو مسجد جامع الازہر ہماری منزل قرار پائی۔ جمعہ پڑھا، وضو کے لیے کھڑا ہوتا۔ یہاں عجیب رواج ہے وضو کھڑے ہو کر کرتے ہیں، نماز میں رش میری توقع سے کم تھا۔ مولوی صاحب بہت ہی زور زور سے خطبہ دے رہے تھے۔ کچھ آواز گونج رہی تھی ایک بات بھی سمجھ میں نہ آئی۔

نماز کے بعد کافی دیر ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ رش بہت تھا، نکلنے والوں کا۔ باہر آیا تو بٹ صاحب نے بتایا اندر بنگلہ دیش کے حکومتی مظالم کے خلاف کچھ لوگ بینر لہرا رہے ہیں۔ میں بھاگ کر اندر گیا۔

بنگلہ دیش حکومت کے مظالم کے خلاف احتجاج

دو بڑے بڑے بینر تھے، پروفیسر غلام اعظم اور مطیع الرحمن اور دوسرے لوگوں کی تصاویر ساتھ زخمیوں اور شہداء کی۔ ابھی گاڑی کی طرف جا رہے تھے کہ ڈاکٹر خالد حنفی کا فون آیا کہ اخوان کے مرکزی ترجمان ڈاکٹر

غزلان سے ملاقات طے ہے۔ میں نے فوراً کالی پنسل خریدنے کے لیے دوڑ لگائی۔ دس پاؤنڈ کی دو کاپیاں اور ایک پنسل ملی۔

ڈاکٹر محمود غزلان چیف سپوکس مین سے ملاقات

حدیقہ الظہر پارک جو قاہرہ کی سب سے خوب صورت اور بڑی پارک ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر ایک ڈمپنگ ڈپو تھا۔ کئی ایکڑوں میں پھیلے اس ڈپو میں پورے شہر کا کوڑا اور کچرا ڈالا جاتا تھا۔ انسانی ذہن کی خوبصورتی تو یہی ہے کہ وہ بدصورتی سے خوب صورتی پیدا کرنے کی تدبیریں کرتا ہے۔

یہ بھی تخلیق کی ایک ایسی ہی زندہ مثال ہے کہ گندگی کے ڈھیروں کو مہکتے پھولوں، خوش رنگ بیلوں اور سبزے سے یوں ڈھانپ دیا گیا ہے کہ پہلی نظر دیکھنے والا اس کے علاوہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے پارکنگ کے خودکار نظام کے تحت ٹوکن مل جاتا ہے اور پارک کی ٹکٹ لینے کے بعد اندر داخل ہونے کے لیے جدید اور جاذب نظر گھومنے والے ریوالنگ بیریر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر محمود غزلان اپنے گھر (ڈاؤن ٹاؤن سٹی) میں آپ کے منتظر ہیں۔ وہ دن سے صدر مرسی کے ترجمان سے تفصیلی ملاقات کے لیے وقت لینے کی کوشش بار آور ثابت ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر محمود بائیو کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہیں اور فیکلٹی آف ایگری کلچر میں استاد ہیں۔ ان سے تفصیلی ملاقات کا دلچسپ تذکرہ ذرا بعد میں کریں گے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بڑبڑانا شروع کیا۔ حدیقہ الظہر سے ہو کر ہم نے پیناڈول آف صلاح الدین ایوبی جانا تھا اور اس کو ایک سو مصری پاؤنڈ ملنے تھے۔ یہ بہت دور ہے۔ دریائے نیل کے اس پار ڈاؤن ٹاؤن میں۔ اب میں پیناڈول نہیں جاؤں گا۔ بٹ صاحب کو ایسا موقع خدا دے۔ اگلے دو روز انھوں نے محمد سعید کا پیناڈول کا نام لے کے وہ بینڈ بجایا کہ وہ بھی یاد کرتا ہوگا۔ ہم نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ انٹرویو میں تاخیر ہو جائے گی اس لیے آج پیناڈول جانے کا پروگرام نہیں رکھیں گے۔ بچپن سے قلعے کو انگریزی میں کیسل ہی پڑھتے اور سنتے آرہے تھے۔ یہاں آکر پیناڈول لفظ ملا۔ دو تین روز تو زبان پر ہی نہیں چڑھا۔

اخوان کی مخالفت اور بدنامی

مصر میں اپنے قیام کے دس دنوں میں اخبارات اور میڈیا میں اخوان کے خلاف جس کثرت سے خبریں پڑھیں اور ٹی وی پروگرام دیکھے اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ حسنی مبارک کے تیس سالوں میں

انہوں نے کیا کیا نہیں برداشت کیا ہوگا۔ صدر ناصر کا دور تو پھانسیوں، عمر قیدوں اور بدترین جسمانی اذیتوں سے عبارت تھا۔ حسنی مبارک کے عہد میں میڈیا کو بہت تواتر کے ساتھ اخوان کے خلاف استعمال کیا گیا۔ کم سے کم دو ہزار ڈرامے اور فلمیں ایسی ہیں جن میں سفید کپڑے پہنے ڈاڑھی والوں کو شیطان اور اخوان ثابت کیا گیا اور داڑھی کو ہر برائی کا منبع ٹھہرایا گیا۔

صدر مرسی ویسا سیدھا نہیں ہے

عام لوگوں کا خیال ہے کہ مرسی جتنا سیدھا اور سادہ نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے۔ اس نے فوج کے بعد جج کو نمٹایا۔ اب اس کا ہدف میڈیا ہے جہاں قریباً سارے چینل ہی اس کو چٹکیاں کاٹ رہے ہیں سوائے چینل 25 egypt کے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ملک کے منتخب صدر مرسی کی کوئی تصویر نہ تو سرکاری دفاتر میں نظر آئی اور نہ ہی بازاروں اور کھمبوں پر۔ مجھے بہت تشویش ہوئی کہ ہمارے ہاں تو لیڈر بننے کے شوقین اپنے بچوں تک کی تصاویر پوسٹروں پہ چھاپنے سے باز نہیں آتے۔ انھوں نے کیسے ضبط کیا؟

ایک حیرت انگیز بات میری منتظر تھی کہ مصر کے صدر کی سرکاری تصویر کیلئے بجٹ میں پانچ سو ملین پاؤنڈ رکھا جاتا ہے۔ صدر مرسی نے قومی خزانے کی حالت دیکھی یا احتیاطاً over exposure سے بچنے کیلئے یہ فیصلہ کیا۔ وجہ جو بھی رہی ہو عوام نے اس کو بے حد سراہا اور صدر کی ذہانت کو بھی مانا کہ نہ صرف وہ اپنے دشمنوں کو ترتیب وار نپٹ رہا ہے بلکہ باقی معاملات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اسی لیے مرسی نے عوام کی روزمرہ زندگی اور ثقافتی مظاہر کی طرف رخ بھی نہیں کیا۔ پوری توجہ ملک کی بگڑی بلکہ بدتر ہوتی معاشی حالت پر ہے۔

مصری قوم اس وقت تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔

1۔ صدر کے حامی

2۔ صدر کے مخالف

3۔ خاموش منتظر کہ کون غالب رہتا ہے

تربیتی نظام جس نے عالمی قوتوں کو مسخر کیا

اخوان نے صدارتی الیکشن میں ایک کروڑ اور 34 لاکھ لوگوں کے ووٹ لیے ہیں۔ ایک بات تو ظاہر ہے کہ سارے اس کے ممبرز نہیں ہیں۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اخوان کو کچھ ہی عرصے میں جانا اور پہچانا ہے۔ ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد اخوان کی دعوت کو سمجھ کے ان کے قریب بھی آئی ہے۔ اخوان نے اپنے ارکان اور جماعت میں شامل ہونے والے نئے کارکنان کی تربیت کیلئے جو موثر اور دلچسپ نظام اختیار کیا ہوا ہے 'اسرہ جاتی نظام' کہلاتا ہے۔ ایک گروپ میں سات لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ہر ہفتے تین تین گھنٹے اکٹھے گزارتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ اس گروپ کا امیر بوڑھا نہیں ہوگا۔ قرآن و حدیث اور فقہ پڑھایا جاتا ہے۔ اخوان کی خبریں، ہدایات اور اپنی اپنی فیلڈ میں کام کی رپورٹ شیئر ہوتی ہے۔ امیر سب سے نماز فجر کی رپورٹ لازماً لیتے ہیں۔ ان اسرہ جات کی کئی layers ہیں۔ ان کے اوپر ناظم تربیت الگ سے ہیں جن کو امیر رپورٹ کرتے ہیں اور تربیت کی کمی بیشی کیلئے مشورے اور مدد لیتے ہیں۔ تربیت، آرڈر، مصارف نام کے تین مدارج ہیں۔

نئے لوگوں کیلئے تین سرکل

1۔ رابطہ العام سرکل، 2۔ محب سرکل (جو آپ کو پسند کرتے ہیں)، 3۔ معیط سرکل (پسند بمعہ سپورٹ)۔

اس میں پانچ لوگ بلائے جاتے ہیں اور دو کو اسرہ

کے لیے منتخب کرلیا جاتا ہے۔

اپنے انجام کو پہنچنے والا ایک بیمار اور تنہا فرعون

تیس سال تک ملک کے سیاہ و سفید کا مالک رہنے والا حسنی مبارک ایک ہسپتال کے بستر پر اپنی زندگی کے اذیت ناک دن گزار رہا ہے۔ عدالت میں اسے ایک پنجرے میں لایا جاتا ہے کہ لوگ اس سے انتہائی نفرت کرتے ہیں۔ جس نے مبارک (بیٹے جمال مبارک) کو اس نے اپنے بعد صدارت کیلئے تیار کیا تھا، اس کا سیاسی منظرنامے میں کہیں نام ہی نہیں۔ حسنی مبارک کی جماعت کا ہیڈ آفس دریائے نیل کے بالکل کنارے ایک ملٹی سٹوری بلڈنگ میں تھا۔ التحریر چوک میں جب لاشیں گرنے لگیں اور عوام بپھر گئے تو سب سے پہلا ہدف وہی بلڈنگ بنی۔ ہم نے وہاں کھڑے ہو کر اس کی ویرانی اور تباہی کی تصویریں بھی لیں۔ پورے قاہرہ میں مجھے صرف ایک جگہ تین سپاہی نظر آئے۔ یہ ایک ہسپتال تھا اور ہمارے ہوٹل کے قریب ہی واقع تھا۔ پتہ چلا یہاں حسنی مبارک داخل ہے۔ ملاقات کیلئے کوشش کی مگر اس تک رسائی ممنوع تھی ورنہ ہم بھی اس عہد کے فرعون کو دیکھتے جو اپنی زندگی میں ہی اپنے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

قاہرہ سے پہلی روانگی

تیسرے دن صبح 4 بجے بٹ صاحب نے اٹھا دیا ہم زندگی کے انوکھے سفر پر جانے والے تھے۔ خطرات اور خدشات سے بھرا سفر، ان دیکھی، ان جانی دنیا کا سفر جہاں زندگی اتنی سستی ہے کہ اسرائیل چند منٹوں میں 250 بندے مار کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ دنیا کی سب سے بڑی جیل کہلانے والا علاقہ غزہ، جہاں اس سے پہلے کوئی پاکستانی صحافی نہیں پہنچا۔ کوئی پاکستانی وفد نہیں گیا۔ ایک نئی تاریخ رقم ہونے کو تھی اور خدا نے یہ اعزاز ہمارے لیے رکھ دیا تھا۔ ہم سب 10 منٹ میں سامان سمیٹ کر ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو رہے تھے۔ میں ساری رات ہی تقریباً لکھتا، ٹی وی دیکھتا اور سامان سمیٹتا رہا۔ خیال تھا کہ دوران سفر سکون سے سو جاؤں گا 400 کلومیٹر کا طویل سفر درپیش تھا۔ قاہرہ سے نکلتے، منظر دیکھتے زیادہ وقت ہی نہیں لگا۔ سڑکیں بالکل خالی تھیں۔ ڈرائیور نے 120 سے سپیڈ کم ہونے ہی نہیں دی۔ گاڑی بڑی تھی، عبدالرحمن الرومی صبح دو بجے رفاہ کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ تاکہ ہم سے پہلے پہنچ کر بارڈر پار کرنے کے انتظامات کر سکے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایک جگہ رک کر نماز فجر ادا کی۔ بڑی سی مسجد تھی۔ نمازی سلام کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ سلام بھی لیتے ہیں۔ مصری قرأت کا بہت مزہ آیا۔ عربی سمجھ تو نہیں آتی مگر لب و لہجے سے بڑا فرق پڑتا ہے۔ امام صاحب نے فجر کی پہلی رکعت میں سجدہ والی سورہ السجدہ پڑھی۔ ہمارے ہاں ایسا صرف

حسنی مبارک بستر علالت پر

رمضان میں ہوتا ہے، وہ بھی پہلے اعلان کر کے۔ یہ اضافی سجدہ بہت بھلا لگا۔

پروفیسر صاحب کا کیمرہ گم ہو گیا

سفر دوبارہ شروع ہوا۔ پروفیسر صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے، پندرہ بیس منٹ کے بعد بڑی معصومیت سے بولے ”میرا کیمرہ وہیں مسجد میں رہ گیا ہے۔“ سبھی کو ایک دم سے بے حد افسوس ہوا کہ اتنی تصاویر اس سے اتاری تھیں۔ کیمرے سے زیادہ وہ تصاویر قیمتی تھیں۔ اظہار افسوس کے لیے ابھی موزوں الفاظ تیار کر رہے تھے کہ گاڑی رکوا کر انھوں نے پیچھے اپنے سامان کو چیک کیا پھر وہاں نہ پا کر اپنی جیکٹ کی جیبوں کو تفصیل سے دیکھا پھر خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ گاڑی موڑ لی جاتی۔ اچانک اسی معصومیت سے بولے ”وہ دوسری جیب سے مل گیا ہے۔“

نہر سویز خوبصورتی اور تخلیق کا امتزاج

دوران سفر کئی حیرتیں ہم رکاب رہیں۔ نہر سویز کا پل فی الواقع خوبصورتی اور تخلیق کا امتزاج تھا۔ بہت ہی طویل، درمیان سے اس قدر اونچا کہ بحری جہاز آرام و اطمینان سے گزر جائیں۔ یہ تاریخی نہر مصر کی سیاست اور آبادی و بربادی کا لازم حصہ رہی ہے۔

تاریخ کے ساتھ صحرائے سینا میں شاندار سفر

صحرائے سینا میں سفر اصل میں تاریخ کے ساتھ ساتھ ایک شاندار سفر کی مانند تھا۔ دریائے نیل کی وادی کو چھوڑ کر پورا مصر ہی ایک پلیٹو کی شکل میں ہے۔ بنجر، ریگستان اور ویران جہاں پانی کی کمی بہت واضح ہے۔ پورے ملک میں زراعت کا دارومدار دریائے نیل کے دونوں کناروں کے ساتھ واقع تنگ سی پٹی پر ہے جسے زراعت اور کاشت کاری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

صحرائے سینا ہمارے ساتھ ساتھ سفر میں تھا اور ہماری متلاشی نگاہیں دور دور تک ان بھٹکے قافلوں کی گزرگاہیں ڈھونڈ رہی تھیں جن پر حضرت موسیٰ کی قوم چالیس سال بھٹکتی رہی۔

اسی صحرائے سینا میں کہ کوہ سینا واقع ہے اور 2627 میٹر بلند کوہ طور بھی جہاں حضرت موسیٰ کو رب کائنات سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ رفتار کی سوئی ایک سو بیس سے کم پہ آنے کو تیار نہ تھی اور تاریخ تو اس سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ نہر سویز سے پہلے سبزہ، فصلیں اور پھلوں کے باغات کثرت سے نظر آنے لگے تھے۔ یہ اسماعیلیہ شہر کا مضافات تھا۔ یہ بہت ہی تاریخی شہر ہے۔ اس کی تاریخ اخوان المسلمون کی ابتداء اور امام حسن البنا کی سرگرم جوانی کے دنوں کی خوب صورتیوں اخلاص، حکمت اور جوش سے بھری ہے۔ ساحلی شہر پورٹ سعید سامنے نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی شہر ہے جو ان دنوں آگ بنا ہوا ہے اور حسنی مبارک کے ایک بزنس مین دوست پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں کہ فٹ بال میچ کے بعد پرامن لوگوں پر حملہ اسی کے لوگوں نے کیا اور 72 کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس نے ملک میں اپنے کارخانے بھی بند کر دیے ہیں تا کہ خوراک کی کمی ہو اور حکومت کی بدنامی ہو۔ جب صحرائے سینا میں داخل ہو رہے تھے تو ایک فوجی چیک پوسٹ پر پاسپورٹ چیک کیے گئے تھے۔ اس کے بعد راستے میں آنے والی کسی بھی چیک پوسٹ پہ نہ چیک کیا گیا نہ روکا گیا۔

کچے پکے فوجی

راستے میں جہاں جہاں مصری فوجی کھڑے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کچے پکے ہی اتار لیے گئے ہیں۔ ابھی

داڑھی مونچھ بھی بمشکل ہی نکلی ہوگی کہ بیچارے فوج میں دھر لیے گئے۔ وردی کا رنگ بالکل غیر متاثر کن تھا۔ پولیس کی کالی یونیفارم ہے اور فوج کی گرین، مٹی کے رنگ کا کمبچر۔ بعد میں پتا چلا فوج میں بھرتی کی عمر 19 سے 29 سال مقرر ہے اور یہ بھی کہ شناختی کارڈ بنانے سے پہلے ہر صورت میں 6 ماہ فوج میں گزارنے پڑتے ہیں۔

سکون سے لیٹا صحرا

سڑک اس قدر عمدہ تھی کہ 400 میل کے طویل سفر میں بار بار تعریف کرنی پڑی۔ کارپیٹڈ، سیدھی، ون وے، صحرا میں اس کی توقع نہ تھی۔ ہم اسے حیرت سے دیکھتے تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔ صحرا سکون سے لیٹا ہماری حیرت کے مزے لے رہا تھا

کیا ٹینکوں کو بچوں کا ڈر تھا

عمران صاحب نے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ صحرا میں ایک بڑی جھیل نظر آئی ہے۔ جھیل کے آثار کے ساتھ ہی ایک شہر شروع ہو گیا۔ یہ شہر العریش تھا۔ خوبصورتی سے بنا ہوا۔ جابجا فوجی کھڑے تھے۔ دو جگہ ٹینک کھڑے دیکھے، ان کو ہمارے ہاں کے پولیس اسٹیشنوں کے باہر پولیس گارڈ کے لیے رکھی ریت کی بوریوں یا لوہے کے اسٹینڈ کے اندر رکھی ریت سے محفوظ بنایا گیا تھا۔ خدا جانے کس سے بچنے اور بچانے کے لیے یہ احتیاطی تدابیر کی گئی تھیں کہ خاردار تار بھی لگائی گئی تھی۔ کیا بچے چھیڑتے ہیں اور ان ٹینکوں کو بچوں کا ڈر تھا۔ ابھی اسی مخمصے میں تھے کہ اچانک نظر پڑی تو وہاں جھیل نہیں، بحر روم تھا۔ جو خدا جانے کہاں سے ہوتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ سارے ساحل کے ساتھ ساتھ گھر اور خوبصورت ریزارٹس بنے تھے مگر اتنا سکون کہ زندگی کی علامت بھی ڈھونڈنا پڑ رہی تھی۔ کچھ عمارتوں پر فوجی پہرہ تھا۔ عوام الناس کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ سارے ساحلی گھر ہی خالی پڑے تھے۔

لڑکیوں کے لباس

ہمیں حیرت یہ بھی ہو رہی تھی کہ پورا صحرا سینا ہم نے عبور کر ڈالا۔ کئی گاؤں، قصبے اور چھوٹی بڑی آبادیاں گزریں۔ بڑے شہروں میں تو کچھ رواج اور مزاج سمجھ میں آتا ہے، مگر یہاں چھوٹے چھوٹے گاؤں کی لڑکیاں بھی اسی طرح اسکارف اوڑھے اور کسی ہوئی جین پہنے ہوئے تھیں جیسی ہم نے قاہرہ میں دیکھی تھیں۔ صبح صبح آفس یا تعلیمی اداروں میں جانے کے لیے اکیلی یا دو دو کی تعداد میں سڑک کنارے چلتی، ویگن کے انتظار میں کھڑی نظر آئیں۔ سارے راستے میں بس البتہ کوئی نہیں ملی۔ ویگنیں بھی کبھی آتی جاتی ملیں۔ تصویر بنانے کے لیے جب جب تیار ہوتا تو ڈرائیور صاحب کافی آگے بڑھ چکے ہوتے۔ العریش میں ایک خوبصورت یونیورسٹی بھی تھی۔ پودے، دیواریں، بہت ہی خوبصورت اور صاف ستھری عمارتیں، لڑکیاں ہر جگہ آزادی، خودمختاری سے چلتی آتی جاتی محسوس ہوئیں۔

رفاہ بارڈر پر

ناشتے کا کسی نے شرعاً شرعی نام ہی نہیں لیا اور ہم بالآخر بھوکے پیاسے صبح 9 بجے رفاہ بارڈر پر پہنچ گئے۔ رفاہ بارڈر تک پہنچتے تک بھوک سے برا حال ہو چکا تھا۔ بٹ صاحب تو عبدالرحمن الرومی کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے یقیناً وہ گیٹ کے اندر عمارت میں ہی تھا۔ مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ کافی دیر بعد وہ گیٹ پر دوبارہ گئے۔ گیٹ کے دوسری طرف کافی فاصلے پر فلسطینی بارڈر تھا وہاں وزارت صحت کا وفد استقبال کے لیے آیا ہوا تھا اور وہاں جانے کی واحد صورت دھند میں لپٹی تھی۔ (باقی آئندہ) ■■■

افغانستان سے ایک ٹریلین ڈالر کی نایاب دھاتوں کو ہتھیانے میں امریکا کی دلچسپی جنگ میں ڈھل گئی، یہ قیمتی دھاتیں پاکستان میں بھی ہیں

نایاب دھاتیں

اور ان کے حصول کی عالمی دوڑ

حنا انور

نایاب دھاتوں (Rare Earth) کے حصول اور ان کی فروخت کی عالمی دوڑ میں چین اور امریکا کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ 4 جنوری 2012ء میں امریکی صدر بارک اوباما نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ چین کی غیر منصفانہ تجارتی پابندیوں کے لیے وہ ایک تجارتی نفاذ یونٹ (Trade enforcementunit) قائم کریں گے۔ چین دنیا کی نہ صرف ۹۰ فیصد سے زائد Rare Earth پیدا کرتا ہے بلکہ اس کی کان کنی اور پروسیسنگ کے عمل میں بھی سب سے آگے ہے۔

یورپی یونین کے حکام کا اندازہ ہے کہ چین یورپی مینوفیکچررز (Manufacturers) کو Rare Earth، مقامی سرمایہ کاروں کی نسبت دوگنا مہنگے داموں فروخت کرنے کے لیے اس قسم کی پابندیاں لگاتا رہتا ہے۔

امریکی اہلکار کے مطابق امریکا، جاپان اور یورپی یونین کی Rare Earth کی چین کی جانب سے عائد کی جانے والی تجارتی پابندیوں کے خلاف عالمی تجارتی تنظیم (World Trade Organization) میں کیس فائل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حکام کا کہنا ہے چین کی جانب سے Rare Earth کی برآمدات پر لگائی جانے والی پابندیوں سے مینوفیکچررز (Manufacturers) کو شدید مالی نقصان پہنچا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ چین اپنی پابندیوں میں کمی کرے اور اپنی برآمدات میں اضافہ کرے۔

Rare Earth معدنیات کی ایک ایسی قسم ہے جس میں ایک یا ایک سے زیادہ غیر معمولی دھاتی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ یہ معدنی اجزاء عام طور پر مٹی میں موجود قیمتی شورے کے ساتھ تحلیل ہو جاتے ہیں اور جدید ٹیکنالوجی جیسے دفاعی آلات، موبائل فون، ہائبرڈ کاروں اور میزائلوں کے سسٹم میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ نادر زمینی معدن دراصل سترہ قسم کے کیمیائی عناصر کا ایک سیٹ ہے۔ یہ عناصر دیگر معدنیات کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ انھیں نہ صرف زمین سے نکالنے بلکہ قابل استعمال بنانے کا عمل قدرے مہنگا بھی ثابت ہوتا ہے۔

Rare Earth کو دفاعی نظام کے لیے انتہائی موزوں سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ Semerium cobalt اور

Neodymium iron boron دنیا بھر میں سب سے زیادہ طاقتور مقناطیس مانے جاتے ہیں اور دفاعی ہتھیاروں جیسے میزائل، چھوٹے بموں اور ایئر کرافٹ میں اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی کون سی خصوصیات ہیں جو ان نادر زمینی معدنیات کو خاص اور منفرد بناتی ہیں؟

زیادہ تر Rare Earth کی اہمیت ان کے مخصوص اور مبہم قسم کے کاموں کو انجام دینے کی صلاحیت میں پنہاں ہے۔ جیسا کہ Europium ٹی وی اور کمپیوٹر کی اسکرینوں کے لیے سرخ فاسفر فراہم کرتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا ابھی تک کوئی متبادل بھی موجود نہیں۔ اسی طرح Cerium شیشے کی صنعت کے ساتھ منسلک ہے اور تقریباً ہر طرح کے شیشے کی مصنوعات اس کے بغیر ممکن نہیں۔

مستقل مقناطیسی طاقت Rare Earth کی ایک اور اہم خاصیت ہے۔ اس کے ہلکے وزن اور مقناطیسی طاقت سے دیگر مصنوعات جیسے آڈیو، ویڈیو کے آلات، کمپیوٹر، کاروں اور فوجی گیئرز اور دیگر ٹیکنالوجی کی اشیا کو مزید چھوٹے سائز میں بنانا ممکن ہوا ہے۔ خاص طور پر DVD Players کی ہارڈ ڈسک ڈرائیوز وغیرہ Rare Earth کے مقناطیسوں کے بغیر بنائے ہی نہیں جا سکتے تھے۔

تاہم یہ بھی مانا جاتا ہے کہ دیگر Rare Earth ماحولیاتی آلودگی کا باعث بنتے ہیں اور اس کی ایک طویل تاریخ بھی ہے۔ دیگر کئی متعلق عوامل کی طرح اس سے بھی زہریلا مواد خارج ہوتا ہے۔ جو تابکار یورینیم اور تھوریم کے ساتھ مل کر آلودگی کا باعث بنتا ہے۔ چین میں ایسے زہریلے مواد کو Rare Earth کی جھیلوں میں ہی تلف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن AFP کی رپورٹ کے مطابق چین میں Baotou کی کان کے قریب فصلوں کی تباہی انسانوں کے دانت اور بال کھو دینے کی شکایات ملتی رہتی ہیں اور اس علاقے کی مٹی اور پانی کے ٹیسٹ سے بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ وہاں Carcinogens بڑی مقدار میں موجود ہے۔

چین نے حال ہی میں اس آلودگی کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا ہے۔ وہ بھی شاید اس خوف سے کہ 2002ء میں کیلی فورنیا جو دنیا بھر میں Rare Earth کا ایک بڑا سپلائر تھا اسے اقتصادی اور ماحولیاتی دباؤ کے پیش نظر اپنی تمام سپلائز بند کرنا پڑی تھیں۔ اسی وجہ سے دیگر ممالک اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کے باوجود اپنے ذخائر کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ ماحول دوست بھی ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ فلوراسینٹ لیمپ اور مقناطیسی ریفریجریشن نظام Rare Earth کی ہی مثالیں ہیں۔

90ء کی دہائی میں چین نے ان کی تیزابیت اور تابکاری سے نمٹنے کا فیصلہ کر کے عالمی تجارت پر باہمی رضا مندی کا اظہار کیا تھا۔ اسی وجہ سے امریکا نادر زمینی دھاتوں کے بڑے ذخائر رکھنے کے باوجود اب بھی چین سے 96فیصد تک درآمد کرنے پر مجبور ہے۔

Rare Earth کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کے ذخائر پہلی دفعہ سویڈن کے گاؤں میں 1887ء میں ملے تھے۔ 1948ء تک Rare Earth کے ذخائر بھارت اور برازیل سے حاصل کیے جاتے تھے۔

1950ء میں جنوبی افریقہ کو دنیا کا سب سے بڑا Rare Earth کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ 1960-80ء تک کیلی فورنیا ایک اہم پروڈیوسر رہا ہے۔ اس وقت بھارت اور جنوبی افریقہ کے پاس Rare Earth کے بیشتر ذخائر موجود ہیں لیکن چین سے فی الوقت ابھی بھی کم ہیں۔ چین کے پاس 55ملین میٹرک ٹن کے

ذخائر موجود ہیں جو کہ پوری دنیا میں موجود Rare Earth کے ذخائر کا نصف ہیں۔ چین Inner Mangolia میں دنیا کی سپلائی کا 95 فیصد Rare Earth کی فراہمی کا سہرا اپنے سر لیے ہوئے ہے۔

امریکی جغرافیائی سروے کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکا، چین، سوویت یونین کے بعد انڈیا سالانہ 3.1 ملین میٹرک ٹن کی برآمدات کے ساتھ چوتھے نمبر پر ہے۔

چین کی Rare Earth کی عالمی تجارت پر قبضے کا آغاز دو دہائیاں قبل ہوا۔ چین نے 1986ء میں Rare Earth کی انڈسٹری کا آغاز پروگرام "863" کے نام سے کیا۔ علاوہ ازیں ایک دوسرے پروگرام "973" سے ایک بنیادی تحقیقاتی پروگرام متعارف کرایا کہ کس طرح Rare Earth انڈسٹری کو فروغ دیا جائے۔ 2001ء میں چین کی مرکزی حکومت نے Rare Earth کی صنعت کو مزید بہتر بنانے کے لیے China Northern Care Earths Group Companies اور China Southern Rare Earths Group of Companies کا اجراء کیا جو کہ بڑی حد تک طاقتور مقامی حکام کی مخالفت کے باعث ناکام رہیں۔

چین میں Xu gauqgxian کو Rare Earth انڈسٹری کا بانی مانا جاتا ہے۔ انھوں نے 90ء کی دہائی میں نہ صرف چین کی سائنسی ترقی کے لیے حکمت عملی تشکیل دی بلکہ اپنی قیادت میں چین میں موجود Rare Earth کے ذخائر کو بروئے کار لا کر چین کو Rare Earth انڈسٹری کا مرکز بھی بنا دیا۔ اس وقت چین Rare Earth میں دنیا کا سب سے بڑا سپلائر بن چکا ہے اور رواں سال 2013ء میں چین نے 46,900 میٹرک ٹن خام Rare Earth کو ریفائن کیا ہے۔

اعلیٰ ٹیکنالوجی کے باعث Rare Earth کی اہمیت میں گزشتہ چار دہائیوں کے دوران ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ 2009ء میں Rare Earth کی طلب میں سالانہ 40,000 ٹن کا اضافہ ہوا ہے۔ (United States Geograhpical Survey) کی جانب سے کی گئی ریسرچ کے مطابق اس بڑھتی ہوئی مانگ اور تجارت کے مناسب طریقے نہ ہونے کے باعث دنیا کو Rare Earth کی کمی کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ان خدشات کے پیش نظر چین نے خاص طور پر برآمدات اور سمگلنگ پر کریک ڈاؤن کا اعلان کیا ہے۔ ستمبر 2009ء میں چین نے برآمدات کوٹہ میں کمی کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا اور اپنی برآمدات 35000 ٹن سالانہ پر لے آیا تاکہ اپنے وسائل کو محفوظ رکھ سکے۔ اس سلسلے میں چین کا کہنا ہے کہ پابندیاں ماحولیاتی آلودگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہیں نہ کہ اقتصادی وجوہات کی بنا پر ہیں۔ اس سے Rare Earth کی قیمتوں پر بھی اثر پڑا، یہاں تک کہ Neodyium کی قیمت 129 ڈالر فی پاؤنڈ ہو گئی جو کہ ایک سال قبل 19 ڈالر سے زیادہ نہ تھی۔

چین کی ان پابندیوں کے باعث عالمی سرمایہ کار دیگر ممالک سے جہاں Rare Earth کے ذخائر موجود ہیں، تجارت میں اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں قازقستان بھی شامل ہے جہاں سے رواں سال میں جاپان 30 ٹن Dysprosium خریدنے کا متمنی ہے۔ Rare Earth کی عالمی منڈیوں میں جاپان ایک اہم خریدار ہے، خاص طور پر جب سے اس نے

ہائبرڈ کاروں کی پروڈکشن کا آغاز کیا ہے۔ جاپان نے انڈیا کے ساتھ بھی ایک یادداشت پر دستخط کیے ہیں جس کے مطابق وہ انڈیا سے Rare Earth درآمد کر سکے گا تاکہ کسی حد تک چین پر انحصار کم کیا جائے۔

افغانستان بھی Rare Earth کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ ایک تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق لیپ ٹاپس اور بلیک بیری کی بیٹریاں بنانے کا خام مال یہیں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکا نے افغانستان سے ایک ٹریلین ڈالر کے معدنی ذخائر حاصل کیے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر افغان جنگ کی وجوہ میں افغانستان کے قدرتی وسائل کی اہمیت کو شامل کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پاکستان میں بھی Rare Earth کے ذخائر موجود ہیں۔ چند تصدیق شدہ رپورٹس کے مطابق پاکستان میں Rare Earth کے بیشتر ذخائر ضلع سوات، ہمالیہ کے کرسٹل زون میں کوہاٹ، سلارزئی، نیوشلہ خیبر ایجنسی، شاہ کوٹ قلعہ اور مالاکنڈ ایجنسی میں موجود ہیں۔ ان تمام علاقوں میں جیولوجیکل سروے آف پاکستان Lanthanum, Yttrium, Neodymium, Cerium اور Terbium کی نشاندہی کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ معاشی اعتبار سے Rare Earth کی صنعت ایک ملٹی بلین ڈالر شعبہ ہے جس سے آنے والے چند سالوں میں نئی ٹیکنالوجی کو بدلا جا سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان اپنی کان کنی اور زمینی معدنیات کو سنجیدگی سے دیکھے۔

جیولوجیکل سروے آف پاکستان اپنے قلیل وسائل کے ساتھ خیبر پختونخوا، فاٹا اور بلوچستان پر تحقیقات کر رہا ہے۔ دیگر علاقوں میں موزوں آلات کی عدم دستیابی کے باعث کام نہیں ہو سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی کوشش آئندہ ایک بڑی مارکیٹ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں موجود جغرافیائی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر پاکستان میں کان کنی کے نظام کو بہتر بنایا جائے تو اربوں کی اس صنعت کو دس سال سے بھی کم عرصہ میں کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان افغانستان کے ساتھ مل کر بھی ان وسائل کو اپنا ذریعہ ترقی بنا سکتا ہے۔

اہم نادر زمینی معدنیات اور ان کے استعمال

Scandium ویپر لیمپوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کھیلوں کے مختلف سامان جیسا کہ المونیم بیس بال، سائیکل کے فریموں، سیلوں (Cells) کے ایندھن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

Yttrium ٹیلی ویژن کی پکچر ٹیوب کو رنگ فراہم کرتا ہے۔ مزید مائیکرو ویو، ہیرے اور چینی (کرسٹل) کی بنی ہوئی اشیاء، شیشے کی بنی

ہوائی اشیا اور دیگر ایسی چیزوں میں استعمال ہوتا ہے۔

Lanthanum: کاربن لیمپوں خاص طور پر فلم ٹی وی کے اسٹوڈیو اور دیگر منصوبوں، سگریٹ کے لائیٹرز، مختلف قسم کی بیٹریوں، کیمروں کے لینز اور شیشے کی دیگر مصنوعات میں قابل استعمال ہے۔

Rare Earth Cerium میں سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ ڈیزل انجن میں گاڑیوں کی کاربن مونو آکسائیڈ کے اخراج کو کم کرنے کے لیے، مختلف قسم کی پالش اور خود کار صفائی کا نظام رکھنے والے آلات میں استعمال ہوتا ہے۔

Praseodymium: یہ بنیادی طور پر ہوائی جہازوں کے انجنوں کو مضبوط بنانے والی دھاتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فائبر آپٹک تاروں میں بطور سگنل اس کا استعمال کیا جاتا ہے اور ویلڈنگ کے دوران استعمال ہونے والے چشموں کو مضبوط بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔

Neodymium: بنیادی طور پر کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک، ہوائی ٹربائن، ہائبرڈ کاروں، ہیڈ فون، مائیکرو فون، رنگین شیشوں میں بطور مقناطیس استعمال ہوتا ہے۔

Promethium: قدرتی طور پر زمین میں نہیں پایا جاتا بلکہ مصنوعی طور پر یورینیم کی Fission سے بنایا جاتا ہے۔ نیوکلیئر کی مائیکرو بیٹریوں اور X-Ray کی مشینوں میں استعمال ہوتا ہے۔

Semarium: کو بالٹ کے ساتھ مل کر طاقت ور اور مسلسل قسم کے مقناطیس بنانے میں کام آتا ہے۔ چھوٹے میزائلوں، کاربن لیمپوں اور شیشے کی مصنوعات میں استعمال ہوتا ہے۔

Europium: کمپیوٹر مانیٹر، فلوریسینٹ لیمپ، لیزر اور ٹیلی ویژن کے سیٹس (Sets) میں سرخ فاسفر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

Gadolinium: ایٹمی بجلی گھروں میں استعمال ہونے والی سلاخوں میں استعمال ہوتا ہے۔ طبی آلات میں MRI صنعت میں مختلف دھاتوں کی کام کرنے کی صلاحیت کو مزید بہتر بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔

Terbium: چھوٹے الیکٹرانک ڈیٹرز سے لے کر بڑے Sonar نظام رکھنے والی تمام ٹیکنالوجی اس کی مرہون منت ہے۔ لیزر لائٹ اور ٹیلی ویژن میں سبز روشنی پیدا کرتا ہے۔

Dysprosium: ہائبرڈ کاروں میں hishptensty والی روشنی پیدا کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔

Holmium: بہت زیادہ مقناطیسی طاقت کا حامل ہے۔ نیوکلیئر، ٹھوس لینزوں میں استعمال ہوتا ہے۔

Erbium: فائبر آپٹک تاروں میں، فوٹوگرافک فلٹر اور ایمپلی فائر Emplifire سگنل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ عینکوں اور مصنوعی زیورات بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

Thulium: یہ Rare Earth دھاتوں میں سب سے زیادہ منفرد اور نایاب ہے۔ طبی آلات میں خاص طور پر استعمال ہوتا ہے۔ X-Ray ٹیکنالوجی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

Ytterbium: ایکسرے مشینوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا کمرشل استعمال بہت محدود ہے۔ زلزلہ ریکارڈ کرنے والے آلات، لیزر اور فائبر آپٹک تاروں میں ڈوپنگ ایجنٹ (doping agent) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

Lutetium: پیٹرولیم مصنوعات کی ریفائنری کے عمل میں استعمال ہوتا ہے۔ ■■■

انوکھا پھل

کیلا

غذائیت بھرا

کئی امراض سے تحفظ فراہم کرنے والا سستا پھل
جو ہر عمر کے لیے توشہ خاص ہے

بنت شریف خان

کیلے کا شمار لذیذ ترین پھلوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں شاید آم کے بعد سب سے لذیذ، قوت بخش اور زیادہ کھایا جانے والا پھل بھی ہے۔ یہ ایک خوش ذائقہ، خوشبودار، صحت بخش اور شوق سے کھایا جانے والا پھل ہے۔

کہتے ہیں کہ کیلا قدیم ترین پھل ہے جو زمانہ قبل از مسیح سے زیر استعمال ہے۔ سکندر اعظم نے اسے دریائے سندھ کی وادی میں کاشت ہوتے دیکھا تھا مگر اب یہ کئی ملکوں کے میدانی علاقوں میں کاشت کیا جاتا ہے۔ اب اندرون سندھ اس کی وسیع پیمانے کاشت کی جاتی ہے۔ کیلے کو عربی زبان میں موز، بنگالی میں کل، سندھی میں کیلو، انگریزی میں Banana کہتے ہیں۔

اطبا کی رائے کے مطابق کیلا گرمی سردی کے موسم میں معتدل اور دوسرے درجے میں تر ہے۔ بعض کے نزدیک گرم تر ہے۔

برصغیر پاک وہند میں اس کی کئی اقسام کاشت کی جاتی ہیں۔ کیلے کی ہر قسم کا اپنا الگ ذائقہ، حلاوت، غذائی خصوصیت اور قوت بخش معیار ہوتا ہے۔ ان میں سے چند مشہور اقسام کے نام حسب ذیل ہیں:

انوپان، سہلٹ، ڈھاکا جنگلی، مال ٹھوک، سیون کیلا، بینا، کوگی، رائے کیلا، رام کیلا، چینیہ، گھیرا، مہنگا، چمپا، صغری، بھیسا، بھسی کیلا، ہری چھال کا کیلا اور بیج دار کیلا وغیرہ۔

سائنسی تجزیے کے مطابق آدھا کلو کیلے میں ۳۵۰ حرارے ہوتے ہیں۔ کیلے میں ٹھوس غذا زیادہ اور پانی کم ہوتا ہے۔ صحت بخش شکر کی کثرت اسے زود ہضم بنا دیتی ہے۔ جو لوگ تکان محسوس کریں، ان کے لیے کیلا بہت مفید چیز ہے۔ کیلا آیوڈین کی کمی دور کرتا ہے۔ اس لیے آیوڈین کی کمی سے لاحق ہونے والی تمام امراض میں بھی یہ مفید ہے۔ کچے کیلے میں نشاستہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں فروٹ شوگر بھی خاصی ہوتی ہے۔

کیلے میں غذائی اجزا ۸۰ فیصد ہوتے ہیں۔ اس

میں تقریباً ۳/۴ حصے پانی، ۱/۵ حصہ شکر اور باقی نشاستہ، حل پذیر ریشہ، معدنیات اور حیاتین ہوتے ہیں۔ نشاستہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کیلا کھانے سے کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں گوشت بنانے والا جز نائٹروجن زیادہ ہوتا ہے۔

کیلے میں کیلشیئم (چونا)، میگنیشیئم، فاسفورس، گندھک، لوہا اور تانبا ملتا ہے۔ اسٹرابری کے بعد سب سے زیادہ فولاد اسی میں ہوتا ہے۔ کیلے میں پروٹین اور چربی بہت کم مقدار میں پائی جاتی ہے۔

حیاتین (وٹامن) کے لحاظ سے کیلا مفید ترین پھلوں میں شامل ہے۔ اس میں وٹامن اے، وٹامن بی، اور وٹامن سی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وٹامن ڈی، وٹامن ای بھی پائے جاتے ہیں۔ وٹامن سی کی وجہ سے کیلا مسوڑھوں کے لیے مفید ہے۔

اس میں نشاستہ وافر مقدار میں پایا جاتا ہے، اسی لیے بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔ خشکی دور کرنے کے لیے کیلے کا سفوف دودھ میں ملا کر بچوں کو دیا جائے تو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ ایک ماہر غذائیات کے مطابق جن بچوں پر اس خوراک کا تجربہ کیا گیا، وہ چھے (۶) ماہ کے اندر ہی اپنے قد و قامت اور جسمانی لحاظ سے دوسرے بچوں سے بڑھ گئے۔ ان کے دانت سفید، چمک دار اور مضبوط ہوگئے۔

اسکول جانے والے جو بچے کمزور تھے، روزانہ دو گلاس دودھ اور دو کیلے دینے سے بہت ... ہوا۔ جن بچوں سے ماں کا دودھ چھڑا دیا گیا ہو انھیں ایک عدد پکے ہوئے کیلے کا نصف گودا عمر کے مطابق دودھ میں ملا کر استعمال کرایا جائے تو ... دوسری غذاؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ بچے کی پرورش کے لیے کافی ہے۔ بچوں کو دست آنے کی شکایت میں کیلے کا استعمال مفید ہے۔ پیچش اور دستوں کے مریضوں کو کیلے کے استعمال سے فائدہ ہوتا ہے۔

بطور دوا کیلے کے پھل، جڑ، پتے وغیرہ تمام اجزا استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیلا خشک کھانسی اور گلے کی ... دور کرتا ہے۔ اندرونی اور بیرونی کسی بھی مقام سے خون آنے کو روکتا ہے۔ کثرت حیض روکنے کے لیے ... پیالی اس کے تنے کا رس پلانا فوری علاج ہے۔ پتوں کی راکھ حیض بند کرنے میں نافع ہے۔ کیلا ... کے مریضوں کے لیے بھی بے حد مفید ہے کیونکہ اس میں نمک نہیں ہوتا اور پوٹاشیئم زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔

کیلا دل کو فرحت دیتا اور خون کی کمی دور کرتا ہے۔ مسلسل کھانے سے کیلا بدن موٹا کرتا ہے۔ کمزوری میں کیلا کھانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ ... ہوئے مقام پر اس کا لیپ لگانا جلن، سوزش اور ... کرتا ہے۔ چھلکے کے اندر کے گودے کے لیپ ... اور پھوڑے پھنسیاں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

سانپ کے کاٹے کا علاج

اگر کسی کو سانپ کاٹ لے تو اسے کیلے کے تازہ رس نکال کر فوراً پلا دیا جائے۔ دو پیالے پلانے سے مارگزیدہ اچھا ہو جاتا ہے۔

نکسیر اور پیشاب کی تکلیف

کیلے کے تنے کا رس ناک میں چڑھانے سے نکسیر کا عارضہ جاتا رہتا ہے۔ کیلے کے تنے کا پانی نصف پیالی پینے سے پیشاب کی جلن اور سوزش رفع ہو جاتی ہے۔

آشوب چشم

گرمی کے آشوب چشم کے لیے کیلے کے پتے آنکھ پر باندھنے سے تکلیف رفع ہوتی ہے۔

یرقان دور کرنے کا نسخہ

ایک کیلے کی پھلی چھیل کر اس کے گودے پر بجھا ہوا پان میں کھانے والا چونا لگا دیں اور چھلکا اسی طرح چڑھا دیں جیسا کہ چھیلنے سے پہلے تھا۔ اسے ساری رات اوس (شبنم) میں لٹکا دیں، صبح نہار منہ چھلکا دور کرکے کیلا چونے سمیت کھا لیں۔ یہ عمل تین روز کریں۔ انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

کیلا کھانا کھانے کے بعد استعمال کرنا چاہیے۔ کیلے کھانے کے بعد دودھ پی لیا جائے تو جسمانی نشو ونما میں بہت مدد ملتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں کیلے کا درخت ہو وہاں سانپ نہیں آتا۔

■■■

اندر کیا ہے؟

ایک صاحب چھلکے سمیت کیلا کھانے لگے۔
کسی نے انھیں ٹوکا "اسے چھیل تو لیں۔"
وہ بولے، "چھیلنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے اس کے اندر کیا ہے۔"

☆☆☆

گوشت اور کچا کیلا

گوشت آدھا سیر، دہی آدھا پاؤ، لال مرچ پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ، ادرک اور لہسن ایک بڑا چمچ، کچے کیلے چار عدد، پیاز آدھا پاؤ، نمک ڈیڑھ چائے کا چمچ، گھی آدھی پیالی۔

ترکیب

کیلے کو چھیل کر قتلے کاٹ لیں اور اس کو نمک لگا کر رکھ لیں اور گھی میں سرخ کر کے نکال کر باقی گھی میں پسے ہوئے مصالحے اور دہی ڈال کر بھونیں۔ جب بادامی رنگ ہونے لگے تب گوشت کی بوٹیاں اس میں ڈال دیں۔ اچھی طرح بھونیں۔ جب گوشت لال ہو جائے تو آدھی پیالی پانی ڈال دیں اور گوشت گلنے دیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو اس میں کیلے کے قتلے ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ یہ ایک نہایت لذیذ ڈش ہے۔ حیدرآباد میں بہت پسند کی جاتی ہے۔

(نفیس محمد حسین۔ لاہور)

بادشاہی میں فقیری

ایک درویش صفت، وضع دار اور وطن پر جان چھڑکنے والی شخصیت کا دلربا خاکہ

حبیب اشرف صبوحی

میرے والد محترم (اشرف صبوحی) ہمدرد لاہور کے پہلے افسر تعلقات عامہ اور شام ہمدرد کے منتظم اعلیٰ تھے۔ 1962ء میں ڈاک خانہ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد حکیم محمد سعید صاحب کے اصرار پر "ہمدرد" سے منسلک ہو گئے۔ روح افزا فیکٹری گارڈن ٹاؤن کے منیجر کے طور پر تعیناتی ہوئی۔ 1965ء میں جب حکیم صاحب نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن قائم کیا جس کا مقصد علمی، ادبی، اخلاقی سرگرمیوں کا فروغ تھا، تو والد صاحب کی خدمات ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے حوالے ہو گئیں۔ کچھ دفتری غلط فہمیوں کی بنا پر والد صاحب کو چار سال تک سالانہ ترقی نہ مل سکی۔

چار سال بعد حکیم صاحب کو معلوم ہوا کہ والد صاحب کو چار سال سے ترقی نہیں ملی۔ انھوں نے پوچھا "صبوحی صاحب! آپ کو چار سال تک ترقی نہیں ملی؟ آپ نے اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا اور نہ ہی آپ کی کارکردگی میں فرق آیا۔ کیا آپ کو پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔"

والد صاحب نے کہا "حکیم صاحب! میرے آپ سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میری نظر بھی آپ کی نہیں بلکہ تنظیم کارناموں اور فلاحی منصوبوں پر رہی۔ اگر مجھے تنخواہ نہ ملتی تو میں اس کا بھی ذکر نہ کرتا۔" حکیم صاحب نے اس بات کو بہت سراہا اور اُسے اپ[illegible] میں رکھا۔ چند برس بعد والد صاحب کی بینائی [illegible] تو انھوں نے اپنا استعفیٰ لکھ کر حکیم صاحب کو بھیج[illegible] میں آپ کی خدمت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ [illegible] میں آرام کروں گا۔

حکیم صاحب نے جواب دیا کہ آپ [illegible] نامنظور ہے۔ ہم آپ کو ایک اسسٹنٹ دیتے [illegible] آپ کی راہنمائی کرے گا۔ اسسٹنٹ کا نا[illegible] صدیقی تھا۔ یہی صاحب اپنی محنت اور صلاحی[illegible] باعث کئی سال سے بطور ریجنل منیجر کام کر رہے [illegible]

کچھ سال بعد میرے والد کی قوت سما[illegible] جواب دے گئی۔ میری والدہ جو کراچی میں تھیں [illegible] شکار ہو گئیں اور ڈاکٹروں نے جواب دے [illegible] حالات میں والد صاحب کا لاہور میں رہنا نا[illegible]

ایک روز "شامِ ہمدرد" کے بعد والد صاحب نے حکیم صاحب سے کہا کہ پہلے میری بینائی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد قوتِ سماعت بھی جواب دے گئی، پھر میری اہلیہ کراچی میں شدید علیل ہیں، ان حالات میں میں "ہمدرد" کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا کہ یہ میرا استعفیٰ ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے بڑے زور سے ہونہہ کہا اور بولے "صوفی صاحب تمھاری بینائی تو گئی تھی، ساتھ عقل بھی چلی گئی۔ اپنا استعفیٰ جیب میں رکھو۔ استعفیٰ نامنظور ہے، تمھاری اتنی خدمات ہیں کہ ہم استعفیٰ منظور نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد والد صاحب کراچی چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد پانچ سال تک بقیدِ حیات رہے۔ اس تمام عرصہ میں والد صاحب کو باقاعدگی سے ہر ماہ تنخواہ و سالانہ بونس اور سالانہ ترقی ملتی رہی، جیسے عام حالات میں ملتی تھی۔ وقتاً فوقتاً حکیم صاحب والد صاحب سے ملنے آتے رہتے۔ اس کے علاوہ ان کی صاحبزادی (سعدیہ راشد) اپنے بچوں کو ساتھ لے کر والد صاحب سے ملنے آتیں۔ بچوں کو بتاتیں کہ یہ ہمارے بزرگ ہیں۔ ان کی کیا کیا خدمات ہیں۔ بچوں کے سروں پر ہاتھ پھرواتیں اور ان کے لیے دعائیں کراتیں۔ یہ وضع داریاں، یہ پرخلوص لوگ اب کہاں ملیں گے؟

درویشی کا یہ حال تھا کہ جب وہ سندھ کے گورنر بنے تو ایک پیسہ تنخواہ کا نہ لیتے۔ کوئی پروٹوکول بھی نہیں لیتے تھے۔ گورنر ہونے کے باوجود مریضوں کو وقت دیتے۔ سرکاری کام سے جب بھی لاہور، اسلام آباد اور پشاور وغیرہ جاتے تو کبھی گورنر ہاؤس میں نہیں ٹھہرے ہمیشہ اپنی مقررہ جگہ ٹھہرتے۔

حکیم صاحب کی سیکرٹری نے ایک بار بتایا کہ جب وہ گورنر تھے تو وہ سرکاری فائلیں دستخط کے لیے بھیجی جاتیں۔ وہ سب فائلوں پر دستخط کر دیتے، سوائے ایک فائل کے جو ان کی ذات سے متعلق تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ آپ گورنر سندھ ہیں اور یہ آپ کا استحقاق ہے کہ آپ ایک مرسیڈیز گاڑی بغیر ایکسائز ڈیوٹی کے سرکاری خرچ پر منگوا سکتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے "میں قوم کا پیسا ضائع نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی مجھے اعلیٰ گاڑی کی ضرورت ہے۔"

وہ سچے پاکستانی تھے۔ پاکستان سے بے پناہ محبت کرتے۔ اسلامی طور طریقوں سے محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہمیشہ اچکن اور پاجامہ پہن کر خاص تشخص قائم کیا۔ اپنے ادارے میں حکم دیا کہ دفتری خط و کتابت اُردو میں ہو جو آج تک قائم ہے، کیونکہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے۔ پاکستان 14 اگست 1947ء کو وجود میں آیا تھا۔ یہ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب تھی۔ ان کا اس بات پر زور تھا کہ ستائیسویں روزے کو چھٹی ہونی چاہیے۔ لیکن جب اس پر عمل نہیں ہوا تو انھوں نے اپنے ادارے میں ستائیسویں رمضان المبارک کی چھٹی کا اعلان کر دیا۔ ہر سال ہمدرد کے ادارے میں ستائیسویں رمضان المبارک کی چھٹی ہوتی ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو اپنے ملازمین کو عیدی کا سلسلہ شروع کیا جو تاحال جاری ہے۔

موجودہ حکمرانوں کے لیے حکیم صاحب کی ذات مشعلِ راہ ہے۔ کہاں گئے وہ عظیم لوگ جن کی وضع داریاں، درویشی اور عظیم کارنامے بھولے سے نہیں بھلائے جا سکتے۔ ان عظیم ہستیوں نے بادشاہی میں فقیری کی اور رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ گئے۔ ■■■

کیا اب کوئی جعلی سافٹ ویئر انسٹال ہو سکے گا؟

ونڈوز 8 کی دنیا

نئی پُرکشش، جاذب اور تیز رفتار

عالیہ احمد

امریکا کی مائیکرو سافٹ کارپوریشن نے اکتوبر 2012ء کے آخری ہفتے ونڈوز 8 (Windows 8) جاری کر دی۔ یہ کمپیوٹرز، سمارٹ فون اور ٹیبلٹس کے لیے مائیکروسافٹ کا جدید ترین آپریٹنگ سسٹم ہے۔ ماہرین سے لے کر عام لوگ تک اس پر تبصرے کر رہے ہیں۔ ہر آپریٹنگ سسٹم کی طرح اس کی بھی خوبیاں اور خامیاں سامنے آئی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ونڈوز 8 ایسے کمپیوٹر پر ہی چل سکتی ہے جس میں کم از کم ایک گیگاہرٹز (Gigahertz) کا پروسیسر نصب ہو۔ نیز ایک گیگا بائٹ ریم (Gigabyte RAM) موجود ہو۔ مزید برآں ہارڈ ڈسک (Hard Disk) میں 20 گیگا بائٹس (Gigabytes) جگہ خالی ہو۔ نیز کمپیوٹر میں ڈائرکٹ 9 گرافکس کارڈ مع ڈبلیو ڈی ڈی ایم ڈرائیور بھی لگا ہو۔

سٹارٹ مینو (Start Menu) ختم ہوا

ونڈوز 8 کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سٹارٹ مینو موجود نہیں۔ مزید برآں سابقہ ونڈوز کی خاص نشانی، ڈیسک ٹاپ بھی غائب ہے۔ اس کی جگہ ٹائل نما ڈبوں نے لے لی۔ انھی ڈبوں میں تمام پروگرام نظر آتے ہیں۔ جو پروگرام کھولنا ہو اس پر کلک کیجیے، وہ کھل جائے گا۔ یوں مائیکروسافٹ نے ایک تیر سے دو شکار کیے اور سٹارٹ مینو اور ڈیسک ٹاپ کو یکجا کر دیا۔ اس طرح "منی مائز" اور "میکسی مائز" کے بٹنوں سے نجات مل گئی۔

ٹائل نما ڈیسک ٹاپ سے ہم آہنگ ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے تاہم اسے استعمال کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کو برتنا آسان ہے۔ دراصل یہ تبدیلی اس لیے کی گئی کہ سمارٹ فون اور ٹیبلٹ والے بھی اسے بآسانی استعمال کر سکیں۔ گویا نئی نسل کو رجھانا مقصود ہے جو فی الوقت اپنے سمارٹ فونز میں مختلف آپریٹنگ سسٹم مثلاً اینڈرویڈ اور آئی ایس او وغیرہ برتتی ہے۔ مگر ایکس پی یا ونڈوز 7 استعمال کرنے والے سٹارٹ مینو یا ڈیسک ٹاپ غائب پا کر پریشان ہو سکتے ہیں۔

تیز رفتاری میں آگے

ونڈوز 8 کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ خاصی تیز ہے بلکہ برق رفتار۔ اسی طرح پروگرام بھی کلک کرتے ہی کھل جاتے ہیں۔ اسے استعمال کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ونڈوز 7 کھلنے اور بند ہونے میں تقریباً 30 سیکنڈ لگاتی ہے۔ جب کہ ونڈوز 8 یہی مراحل کمپیوٹر کی طاقت کے حساب سے 15 تا 20 سیکنڈ میں طے کر لیتی ہے۔

چھونے کا احساس

ونڈوز 8 کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسے ٹچ اسکرین والے مانیٹر، ماؤس اور دیگر آلات پر بآسانی

استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ تبدیلی بھی اسی لیے متعارف ہوئی کہ مارکیٹ میں دستیاب سمارٹ فونز کے آپریٹنگ نظاموں کا مقابلہ ہو سکے۔

سکیورٹی میں اضافہ

ونڈوز 8 کو وائرس اور دیگر خبیث سافٹ ویئرز سے بچانے کے لیے بھی نئی خصوصیات شامل کی گئی ہیں۔ ان میں مالاویئر فلٹرنگ اور بلٹ ان اینٹی وائرس سافٹ ویئر قابل ذکر ہے۔ مزید برآں ونڈوز 8 میں ایک یو ای ایف آئی (UEFI) فیچر بھی شامل ہے۔ اس فیچر کی بدولت کوئی جعلی سافٹ ویئر (وائرس، سپائی ویئر وغیرہ) انسٹال نہیں ہو سکے گا۔

روایتی پروگراموں میں جدت

مائیکروسافٹ کے ماہرین نے ونڈوز (Windows) کے روایتی پروگراموں میں بھی جدتیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً میل، کیلنڈر، میسجنگ، نوٹ پیڈ وغیرہ۔ ان کی بدولت بھی ونڈوز 8 پرکشش، جاذب نظر، تیز رفتار اور استعمال میں آسان ہو گئی۔ تاہم ونڈوز 8 کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ابھی مزید اقدامات کرنا باقی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ریلیز کرنے کے صرف ایک ہفتے بعد مائیکروسافٹ نے 170 ایم بی کی بھاری بھرکم اپ ڈیٹ ریلیز کی۔

سوشل میڈیا کی سہولت

ونڈوز 8 کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسے پروگرام موجود ہیں جن کے ذریعے دنیائے انٹرنیٹ میں مائیکروسافٹ کی فراہم کردہ ساری سہولیات کو مجتمع کرنا ممکن ہے۔ اس میں کلاؤڈ (Cloud) کمپیوٹنگ کی سہولت بھی شامل ہے۔ یہ جدت بھی نئی نسل کی خاطر لائی گئی جو سوشل میڈیا پر مرتی اور عموماً اسی کے ذریعے رابطہ رکھتی ہے۔ لہٰذا کمپنی کو امید ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں بڑی تعداد میں ونڈوز 8 کی طرف متوجہ ہوں گے۔

تنقید بھی ہوئی

ونڈوز 8 کے ناقدین کا دعویٰ ہے کہ سٹارٹ مینو کی عدم موجودگی کے علاوہ یہ دراصل ونڈوز 7 ہی ہے۔ لہٰذا جو آخرالذکر آپریٹنگ سسٹم استعمال کر رہے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اسے ہی برتتے رہیں۔ خاص طور پر جو ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر رکھتے ہیں، ان کو ونڈوز 8 خاص فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ مزید برآں اس کا انٹرفیس بنیادی طور پر ٹچ سسٹم رکھتا ہے۔ لہٰذا کی بورڈ اور ماؤس رکھنے والے بھی اسے استعمال کرتے ہوئے عجب محسوس کریں گے۔

تاہم ونڈوز 8 کے چاہنے والوں کا کہنا ہے کہ سٹارٹ مینو غائب کر کے ہی مائیکروسافٹ کے ماہرین نے کمال کر دکھایا۔ یوں ایک نیا اور منفرد آپریٹنگ سسٹم وجود میں آ گیا۔

مائیکروسافٹ نے ونڈوز 8 میں جو جدتیں پیدا کی ہیں، انھیں دیکھا جائے تو یہ جدید ترین آپریٹنگ سسٹم دل کو بھاتا ہے۔ لیکن اسے چلانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس طاقتور کمپیوٹر موجود ہو۔ مزید برآں بہت سے استعمال کنندگان سٹارٹ مینو کی کمی محسوس کریں گے۔ لہٰذا آپ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے گھریلو یا دفتری سرگرمیاں انجام دیتے ہیں تو یہ آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ورنہ پھر ونڈوز 7 یا ایکس پی پر ہی کام جاری رکھیے۔

■■■

ایک انوکھے جہاں کی انوکھی سیر

جگر ہے یا کباڑیا

یہ کچرے کی چیزیں کیوں جمع کرتا رہتا ہے؟

قاضی مظہر الدین طارق

کلاس ٹیچر اپنے شاگردوں کے ساتھ، خیالی جہاز میں سوار ہو کر، ایک بچے کے نظامِ ہضم میں منہ کے راستے داخل ہوا۔ وہ سارا دن معدے اور آنتوں کی انوکھی سیر کرتے رہے۔ آخر میں آنتوں کی خملوں (villi) کے درمیان جہاز کو لنگر انداز کر کے رات بسر کی۔

صبح سویرے میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ فاروق جاگ رہا ہے۔ ہم نے سب بچوں کو جگایا، نمازِ فجر پڑھی اور ناشتے کے لیے بیٹھ گئے۔

میں نے بچوں سے مشورہ کیا کہ اب ہم کہاں جائیں؟ عمر نے کہا "دل (heart) کی طرف چلتے ہیں وہاں سے جہاں چاہیں جا سکیں گے۔" علی نے کہا "نہیں پہلے دماغ (brain) کی سیر کی جائے یہ سب سے اہم ہے۔"

احمد نے کہا "پھیپھڑوں (lungs) میں چلتے ہیں دیکھیں تو خون کس طرح یہاں سے آکسیجن لے کر سب خلیوں تک پہنچا رہا ہے۔"

البتہ فاروق چپ اپنی سوچوں میں گم تھا۔

میں نے کہا یہ سب سہی، مگر ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ ہم کم سے کم وقت میں آسانی سے کہاں پہنچ سکتے ہیں، اس وقت ہمارے لیے دو راستے ہیں، ایک تو ہم 'خملے' (villus) کے بیچ میں موجود lacteal میں داخل ہوں وہاں سے 'لمفی قناۃ' (lymphatic duct) اور درمیان میں کئی 'لمفی عقدوں' (lymph nodes) سے گزرتے ہوئے پہلے اُوپر کی طرف جائیں پھر 'زیر ترقوی ورید' (subclavian vein) کے ذریعہ دل کی دائیں 'اُذین' (atrium) میں داخل ہوں۔ یہ راستہ لمبا بھی ہے اور لمفیٹک سسٹم میں گاڑھے لمف اور جگہ جگہ 'عقدوں' (nodes) میں سفید خلیوں کی بہتات کی وجہ سے راستہ بڑا پُر خطر اور دشوار ہے۔ پھیپھڑوں میں جانے کے لیے مزید آگے، 'داہنے اُذن' (right atrium) سے 'داہنے بطین' (right ventricle) میں داخل ہو کر دل کی دھڑکن کے زور پر 'شُشی شریان' (pulmonary artery) سے گزر کر پھیپھڑوں میں جانا ہوگا، یہ راستہ اور زیادہ دور پڑے گا۔ اسی طرح دماغ میں جانے کے لیے اسی راستے پر اس سے بھی آگے سفر کرنا ہوگا۔

ہم کو تو مختصر اور تیز تر راستہ کا انتخاب کرنا ہے، اس کے لیے ہم کو خون کی شریانوں (arteries) یا وریدوں (veins) میں خون کے بہاؤ کی سمت جانے کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

خون کا بہاؤ ہم کو ۹۰ سیکنڈ میں بدن میں کہیں بھی پہنچا کر واپس اسی جگہ لاسکتا ہے، اس وقت ہم نظام ہضم کے آخری حصہ میں ہیں، یہاں سے 'خملوں' (villi) کے اندر خون کی 'دموی شعریان' (blood capillary) میں داخل ہو کر خون کے بہاؤ کے ساتھ 'جگر بابی ورید' (hepatic portal vein) کے راستے 'جگر' (liver) میں جانا چاہیے اس میں ہم کو دو سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔ سارا خون نظام ہضم سے نکل کر لازماً جگر میں جاتا ہے، جب سب نے اس تجویز کی حمایت کردی تو میں نے جہاز اسٹارٹ کیا اور ہم خون کی ایک 'دموی شریان' میں داخل ہو کر 'جگر بابی ورید' (hepatic portal vein) میں داخل ہوئے! مگر فوراً ہی انجن بند کردیا کیونکہ ہم جگر میں پہنچ چکے تھے۔

یہاں پہنچے تو بچوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ علی نے کہا "لگتا ہے یہ ہمارے بدن کا سب سے بڑا عضو ہے"۔ میں نے کہا ہاں، یہ پسلیوں سے ذرا نیچے سینے کے 'پردہ شکم' (diaphragm) سے لگا ہوا ہے۔ عمر بولا "دیکھو تو ہر طرف کام ہی کام ہو رہا ہے"۔ احمد کیوں چپ رہتا کہا "ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی فیکٹری ہے"۔

میں نے بتایا اس کے بہت سارے شعبے ہیں ہر ایک اپنے کام پر لگا ہوا ہے۔ احمد نے پریشانی سے کہا "ارے! غذا سے حاصل ہونے والا، اتنا سارا گلوکوز جو ہمارے ساتھ خون کے ذریعہ جگر میں آیا تھا کہاں غائب ہو گیا؟" میں نے کہا گھبراؤ مت، وہ دیکھو جگر گلوکوز کو آتے ہی پکڑ رہا ہے اور اس کے سالموں (molecules) کو ایک لمبی زنجیر میں پرو کر 'گلائیکوجن' (glycogen) بنا رہا ہے، پھر اپنے خانوں میں حفاظت سے رکھ رہا ہے اور جب بھی خون میں گلوکوز کم ہونے لگے گا، جگر پھر سے کام کرے گا اور اپنے خانوں سے 'گلائیکوجن' نکال کر دوبارہ 'گلوکوز' میں تبدیل کر کے خون کے حوالے کرے گا۔ گلوکوز کو گلائیکوجن بنانا ہو یا 'گلائیکوجن' کو دوبارہ 'گلوکوز' بنانا ہو قدرت نے ان دونوں کاموں میں مدد دینے کے لئے اس کو الگ الگ قسم کے 'خامرے' (enzymes) عطا کئے ہیں۔

علی نے پھر سوال کیا "اگر گلائیکوجن بنانے کے بعد بھی گلوکوز بچ جائے تو اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے؟" میں نے بتایا کہ اضافی گلوکوز جب خون کے ساتھ دل کی مدد سے دماغ سے گزرتا ہے تو دماغ فوراً چوکنا ہو جاتا ہے اور گردوں کو حکم دیتا ہے کہ اس اضافی گلوکوز کو بھی یوریا اور اضافی پانی کے ساتھ بدن سے باہر کردو! تو گردے ان کو فوراً بدن سے خارج کردیتے ہیں۔

عمر نے پوچھا "سر! یہاں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا "بچو! یاد ہے جب ہم چھوٹی آنت کے ایک حصے 'عفج' (duodenum) میں تھے تو ہم نے دیکھا تھا کہ جگر ایک ہرے رنگ کا شربت 'پت' (bile) بنا کر بھیج رہا تھا جو ہاضمے میں مدد دے رہا تھا"۔ علی نے سوال کیا "سر! یہ 'پت' (bile) کیسے بنا رہا ہے؟" میں نے کہا "ہاں! یہ اچھا سوال ہے، یہ جگر فوت شدہ سرخ خلیوں سے ہیموگلوبن لے کر اس میں سے ایک ہرے رنگ کا مرکب 'لون دانہ' (pigment) سے جس کو 'بلی روبن' (bilirubin) کہتے ہیں، 'پت' بنا رہا ہے، اس میں خون سے 'پت کے نمکیات' (bile salts) بھی لے کر ملاتا ہے یہ 'پت' چکنائی کو کیمیائی طور پر تقسیم تو نہیں کرتا مگر طبعی طور پر (physically) اس کو بہت ننھے ننھے قطروں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کو 'یکجان' (emulsify) کرنا کہتے ہیں تاکہ اس پر 'خامرے' (enzymes) آسانی سے عمل کر کے ان کو glycerol اور fatty acids میں تبدیل کرسکیں۔ یہ نمکیات بچی ہوئی چکنائی کے ساتھ آنتوں کے راستے دوبارہ خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔

"ارے! ارے! یہ امائینو تُرشوں (amino acids) کے ساتھ جگر کیا کر رہا ہے؟" اب کی دفعہ احمد چیخ پڑا۔ مجھے ہی اس کی حیرانی دور کرنی تھی، میں نے کہا "یہ امائینو تُرشوں کو بھی گلائیکوجن میں تبدیل کر رہا ہے۔ اس کام کے دوران جب 'امائینو' (-NH2) الگ کیا جاتا ہے تو یہ 'امونیا' (NH3) بن جاتا ہے جو زندگی کے لیے بہت خطرناک و نقصان دہ ہوتا ہے، جگر اس کو فوراً ہی 'یوریا' [(NH2)2CO] بنا دیتا ہے جو کم نقصان دہ ہے مگر 'یوریا' کو بھی گردے خانوں کے ذریعہ اضافی پانی کی مدد سے بدن سے باہر نکال دیتے ہیں۔

فاروق حسب معمول اپنی سوچوں میں گم تھا مگر ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا اور سب کی باتیں بھی توجہ سے سن رہا تھا۔

احمد نے پوچھا "سر! یہ اربوں سرخ خلیے جو یہاں آکر فوت ہو رہے ہیں کہاں غائب ہوتے جا رہے ہیں؟" "آپ نے دیکھا نہیں کہ جگر ان لاشوں کو بھی کام میں لا رہا ہے۔ اس سے ایک تو مسلسل 'پت' بنا کر اس کو 'پتے' gall-bladder میں جمع کرتا جاتا ہے اور جب معدے کو ہاضمے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے فوراً اس کو یہ 'پت' فراہم کر دیتا ہے۔ دوسرا کام جگر یہ کرتا ہے کہ سرخ خلیوں میں موجود 'ہیموگلوبن' (haemoglobin) سے، جو ایک قسم کے 'لحمیے' (proteins) ہوتے ہیں، ان میں لوہے کا مرکب شامل ہوتا ہے، وہ یہ لوہا نکال کر اپنے پاس محفوظ رکھتا جاتا ہے تاکہ وقتِ ضرورت کام آئے۔ عمر بولا "یعنی کہ یہ کباڑیے کا کام بھی کرتا ہے۔ کچرے سے کام کی چیزیں جمع کرتا ہے"۔

یہ اس کے علاوہ تیل میں حل ہونے والے A اور D 'حیاتین' (vitamins) کو بھی اپنے خانوں میں جمع کر کے رکھ رہا ہے۔ عمر پھر بولا "تو اس کا مطلب یہ بینک کا کام بھی کر رہا ہے"۔

میں نے بتایا ان سب کاموں کو homeostasis کہتے ہیں۔ یہ اندر کے ماحول کو درست رکھنے کا کام ہے۔ جگر کے کاموں کی بڑی لمبی فہرست ہے۔ ہماری زندگی برقرار رکھنے کیلئے یہ نہایت ضروری کام ہیں، جسمی سیال (body fluids) کے ارتکاز اور بناوٹ (concentration & composition) کو ایک خاص حد میں رکھتا ہے، خاص کر خون میں۔ اگر ہم غیر متوازن غذا کھا لیں یا ہمارے کام غیر معمولی ہو جائیں جیسے ہم تیز دوڑ پڑیں یا بہت زیادہ وزن اٹھا لیں یا ذہنی دباؤ میں آجائیں (اچانک خوشی ہو یا غم) تو ہمارے خون کے ارتکاز و بناوٹ میں فرق آجاتا ہے۔ اگر ہمارا یہ محسن جگر، رب کا عطا کردہ خادم اس کو قابو میں نہ رکھے تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔

یہ کام جس کو homeostasis کہتے ہیں اس کام میں جگر اکیلا نہیں اور بھی اعضاء اس کے مددگار ہیں، جیسے ہمارے پھیپھڑے خون میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار کو اس کی حدود میں برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارے جسم کی کھال بدن کے درجۂ حرارت کو کنٹرول کرتی ہے، پھر آپ ابھی گردوں کا کام بھی دیکھ چکے کہ یہ خون کو زہریلے مادوں سے پاک کرتے ہیں، نمکیات و تیزابیت کو حدود کا پابند رکھتے ہیں، پھر یہ سب صفائیاں اضافی پانی کی مدد سے کر کے اس اضافی پانی کو بھی بدن سے خارج کرتے ہیں۔

احمد نے پوچھا "سر! یہ سب کام یہ لوگ کس طرح کرتے ہیں، کون ان کو بتاتا ہے کہ اب کون کیا کام کرے؟" میں نے کہا "ہمارا پورا وجود ایک مربوط نظام ہے، اس کے سارے اعضاء کے کام ایک دوسرے پر منحصر ہیں، سب ایک دوسرے کی مدد سے چل رہے ہیں، پھیپھڑے آکسیجن کا انتظام نہ کریں، سرخ خلیے اس کو تمام خلیوں تک پہنچانے کا فرض ادا نہ کریں، نظام ہضم غذا کو بنیادی اجزاء میں توڑ کر خون کے حوالے نہ کرے، جگر خون کو بیچ نہ کرتا رہے، گردے خون کو صاف نہ کرتے رہیں، دل خون کو گردش دے کر یہ سب کام نہ کرواتا رہے۔ ان میں سے ایک کام بھی نہ ہوتا تو ہم زندہ نہ رہتے.....احمد بیچ میں بول پڑا "سر! سر! میرا سوال؟"..... صبر تو کرو وہی تو بتا رہا ہوں..... ہماری کھوپڑی میں ایک عضو ہے جس کو 'دماغ' کہتے ہیں یہ ان سب کاموں کو مربوط کر کے چلانے کا ذمہ دار ہے، رب نے اس کو ایک مواصلاتی نظام فراہم کر رکھا ہے اس کو 'اعصابی نظام' (nervous system) کہتے ہیں، اس پر تفصیل سے پھر کبھی بات ہوگی، ابھی اتنی بات کافی ہے کہ 'اعصابی نظام' کے ذریعہ دماغ کو اطلاعات ملتی رہتی ہیں کہ کون سے عضو کی کیا ضرورت ہے، پھر دماغ ان ہی اعصابی تاروں کے ذریعہ ہارمونز کی مدد سے احکام جاری کرتا ہے کہ کون سا 'غدہ' (gland) کون سا 'خامرہ' (enzyme) بھیج کر کیا کام کرے؟

فاروق اپنے خیالوں میں گم کہنے لگا "دماغ کو یہ سب تعلیم کس نے دی کہ کس اطلاع پر کس موقع

کے لئے کیا حکم جاری کرے، اس کو ان پیچیدہ کیمیائی مرکبات کی 'کیمیا' کس نے سکھائی۔ اتنا تو ہم انسان بھی نہیں جانتے پھر ان اعضاء کو دماغ کے اشاروں کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا کس نے سکھایا؟"

ہاں ابھی تو ایسا ہے، آج کے پڑھے لکھے نام نہاد 'علم' والے انسانوں نے ایک قیاسی مفروضہ حتمی طور پر طے کر رکھا ہے کہ 'یہ کائنات اور اس میں جو کچھ موجود ہے آپ سے آپ خود بخود اتفاقی و حادثاتی طور پر بن گئے ہیں اس کا کوئی خالق نہیں ہے......'

فاروق بولا "سر! کوئی بھی دیکھنے والا اگر حقیقی رنگ دیکھنا چاہے مگر وہ ایک رنگ کی عینک لگا کر دیکھے تو کیا اس کو حقیقی رنگ نظر آئے گا؟"...... "ظاہر ہے نہیں نظر آئے گا" اب کے عمر بیچ میں بول پڑا۔

میں نے کہا "یہی تو افسوسناک بات ہے، یہ لوگ کتنے بدنصیب ہیں، حقیقت کی تلاش میں کتنی محنت کر رہے ہیں، پیسہ لگا رہے ہیں وقت صرف کر رہے ہیں بلکہ زندگیاں کھپا رہے ہیں نہ صرف زمین کے چپے چپے میں، بلکہ خلاؤں میں خلائی جہاز اور قسم قسم کی دوربینوں کی مدد سے تحقیق میں لگے ہوئے ہیں مگر صد افسوس! ان کے اپنے مفروضوں کی وجہ سے یہ منزل پا ہی نہیں سکتے!!!

احمد اور علی نے ایک ساتھ کہا "اب ہم تھک گئے ہیں آرام نہ کرلیں؟" میں نے کہا "بس تھک گئے! چلو ٹھیک ہے جگر کے کسی خلیے میں پڑاؤ ڈال دیتے ہیں، میں نے تو سوچا تھا کہ تلی یا لبلبہ کا دورہ بھی ہو جاتا، چلو خیر پھر سہی......"

■■■

غزل

ہوا ہے قتل جب سے آخری انسان بستی میں
نہیں باقی کسی تہذیب کا امکان بستی میں

ہلاکت خیز طغیانی کی موجیں بھی غنیمت ہیں
بہا کر ساتھ لائی ہیں بہت سامان بستی میں

اسی رستے سے پہلے تو پہنچ جاتا تھا گھر اپنے
مگر اب کے میں آنکلا کسی انجان بستی میں

بنا کر پھر گرا دوں گھر نئی تعمیر کی خاطر
بھلا ہوگا کہاں مجھ سے کوئی نادان بستی میں

بہت اونچے بہت اعلیٰ مکانوں کی قطاریں ہیں
مگر اک ہو کا عالم ہے اسی ذیشان بستی میں

فصیلوں پہ نظر رکھنے کی زحمت اب نہیں ہوگی
کہیں اندر سے اٹھے گا نیا طوفان بستی میں

سکوں دے کر ہی پائی زندگی میں خرابے میں
ادا کرنا پڑا بھاری مجھے تاوان بستی میں

درختوں میں گھرا گاؤں کسی کو اب نہیں ملتا
کسی بستی کی کھو کر رہ گئی پہچان بستی میں

ذرا سی بات پر یہ کاٹنے کو دوڑ پڑتے ہیں
ہیں انساں کے لبادے میں نرے حیوان بستی میں

(ناصر محمود اعوان)

سرنگ کے انجینئر نے تکمیل سے 2 دن قبل خودکشی کیوں کرلی؟

1326 کلومیٹر ریلوے ٹریک پر 37 سرنگیں

ریلوے سرنگوں میں محبت کی ایک داستان بھی دفن ہے

اسیر عبدالقادر شاہوانی

بلوچستان میں ریلوے لائن کی تعمیر کے لیے 1891ء میں سنگلاخ پہاڑوں کا سینہ چیر کر سرنگوں کا کام شروع کیا گیا اور حیرت انگیز طور پر صرف تین سال کی مختصر مدت میں 1326 کلومیٹر ریلوے ٹریک پر بہت کمال کی خوش منظر 37 سرنگیں مکمل کر دی گئیں۔

ماہر مشاق اور اہل دل باذوق انجینئروں نے ہر سرنگ پر انتہائی خوبصورت نقش و نگار کندہ کرنے کے علاوہ ان سرنگوں پر پتھروں سے بنی ہوئی خوبصورت برجیاں اور تختیاں نصب کر دیں۔

بعض سرنگوں کو متعلقہ علاقے یا کسی نشان وہی کی خاطر کسی نہ کسی نام سے موسوم کر دیا گیا۔ مثلاً بعض سرنگوں پر متعلقہ انجینئروں کے نام کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ بعض پر متعلقہ مقام کا نام اور بعض پر ماحول کی مناسبت سے نام رکھے گئے ہیں۔ جیسے کیس کیڈ، ونڈی کارنر، پیر پنجہ، سربولان، پنیر، کوشک، نشیب اور ایک عاشق انجینئر نے ایک سرنگ اپنی بیوی میری جین کے نام کر کے دنیا والوں کو اپنی محبت کی نشانی دی ہے۔

ناڑی بینک (سبی) سے آگے مشکاف کے پہاڑی سلسلوں میں داخل ہوتے ہی سرنگوں کی ابتدا شروع ہوتی ہے۔ مشکاف کے قریب ہی چار سرنگیں انتہائی مہارت اور خوبصورتی سے ایک ساتھ دوربین کے شیشوں کی طرح بنائی گئی ہیں کہ ایک سرنگ کے باہر کھڑے ہو کر اس سے باقی تین سرنگوں کو یکجا دیکھا جا سکتا ہے۔

پنیر ریلوے اسٹیشن سے 1,609 کلومیٹر کے فاصلے پر "پنیر سرنگ" واقع ہے جو درہ بولان کی 25 سرنگوں میں سب سے طویل ہے۔ اس کی لمبائی 1½ (2.45 کلومیٹر) میل ہے جہاں سے ٹرین گزرتے ہوئے تقریباً تین منٹ لگتی ہے۔ پنیر سے آگے مچ تک کئی چھوٹی چھوٹی سرنگیں واقع ہیں اور پھر مچ ریلوے اسٹیشن سے ہرنک تک تین سرنگیں ہیں۔

محبت کی یادگار سرنگ

ڈزان کے قریب 177 میٹر لمبی سرنگ "میری جین (میری جان)" کے نام سے موسوم ہے۔ میری جین بولان ریلوے منصوبے کے چیف انجینئر مسٹر اوگیلاگن (Ogaflaghun) کی بیوی تھی۔ روایت ہے کہ جب اس سرنگ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، میری جین اپنے شوہر نامدار کے ساتھ سائٹ پر رہ رہی تھی۔ ایک دن سرنگ کا راستہ بنانے کے لیے بلاسٹنگ کی جا رہی تھی کہ دھماکے سے ایک بڑا پتھر اچانک اڑ کر میری جین کو جا لگا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئی۔ انجینئر مسٹر اوگیلاگن کو اپنی بیوی کی ناگہانی موت کا بڑا دکھ ہوا۔ اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور وہ اس کی لاش کو اپنے وطن انگلستان لے جانا چاہتا تھا لیکن اس دور میں انگلستان لے جانے کی سہولت میسر نہیں تھی۔ خاص طور پر لاش کا بروقت انگلینڈ لے جانا ناممکن تھا۔ لہٰذا مسٹر اوگیلاگن نے بامر مجبوری نیم دلی کے ساتھ اسی سرنگ کے اوپر پہاڑ پر اپنی بیوی کو دفن کر دیا۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی کی محبت کی یادگار کے طور پر "تاج اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر" جیسی عظیم عمارت تو نہیں بنا سکتا تھا، البتہ اس سرنگ کو اپنی بیوی (میری جین) کے نام منسوب کر کے تختی نصب کی اور دنیا والوں کو اپنی محبت کی نشانی دے دی۔

کہا جاتا ہے کہ میری جین کی یادگار قبر 1970ء تک اس پہاڑ پر سالم واقع تھی لیکن اس کے بعد کسی دل جلے نے اس قبر کو مسمار کر دیا۔ مگر آج بھی اس مقام پر قبر کے نشان اور کتبہ کے پتھر بکھرے نظر آتے ہیں۔

ونڈی کارنر سرنگ

ڈزان ریلوے اسٹیشن کے ساتھ واقع 127 میٹر لمبی سرنگ ونڈی کارنر کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں پہاڑی درہ بہت تنگ ہو جاتا ہے اور ہوائیں مجتمع ہو کر تیزی سے چلتی ہیں۔ اس لیے سرنگ تعمیر کرنے والے انجینئر نے اس کا نام ونڈی کارنر (گوشہ ہوا) رکھ دیا۔

کیس کیڈ سرنگ نمبر 14

ونڈی کارنر کے بعد تعمیر شدہ سرنگ کو کیس کیڈ کا نام دیا گیا ہے، جو 165 میٹر لمبی ہے۔ یہاں پہاڑ سے چشموں کا پانی بہتا رہتا ہے جو کسی خوبصورت آبشار کا منظر پیش کرتا ہے۔

پیر پنجہ سرنگ نمبر 13/اے

کیس کیڈ کے بعد پیر پنجہ نامی سرنگ واقع ہے۔ یہ سرنگ سب سے چھوٹی یعنی اس کی لمبائی صرف 61 میٹر ہے۔ سرنگ کے جنوبی جانب جرنیلی سڑک پر پیر پنجہ کی زیارت گاہ ہے۔ وہاں ایک سبیل قائم کی گئی ہے جہاں مسافر پانی پی کر مجاور کو حسب منشا پیسے دیتے ہیں۔

سربولان سرنگ نمبر 13

یہ سرنگ ۱۰۱ میٹر طویل ہے۔ یہ چونکہ درہ بولان کے آخری سرے پر واقع ہے، اس لیے اس کا نام

سر بولان رکھا گیا ہے۔ کوتل دروازہ یعنی کوپور کے ساتھ واقع سرنگ کہلاتی ہے۔ اس کی لمبائی 97 رمیٹر ہے اور یہ بولان ریلوے کی آخری سرنگ ہے، لیکن ان کے علاوہ سپوزنڈ پیر جاوا اور کوئٹہ چمن ریلوے لائن پر بھی قابل دید سرنگیں واقع ہیں جن میں سپوزنڈ کے قریب ''لشپ'' اور چمن ٹریک پر کوژک انتہائی اہم اور تاریخی سرنگیں ہیں۔''

خوجک نہیں کوژک سرنگ

خوجک سرنگ کا اصل نام کوژک ہے، جو پشتو اصطلاح میں ٹیڑھے میڑھے یا زگ زیگ کے مترادف ہے۔ انگریزی لہجے میں یہ کوژک سے خوجک مستعمل ہے۔ بہرحال کوژک ٹنل کی کھدائی کا کام 14 راپریل 1888ء کو شروع کیا گیا، جو تین سال کی مسلسل محنت کے بعد 1891ء میں مکمل ہوا۔ اس کی تعمیر میں باصلاحیت، ماہر اور دیانتدار انجینئر کی ٹیم کے ساتھ مختلف علاقوں کے سیکڑوں مزدور شامل تھے۔ یوپی، اتر پردیش، انڈیا کے قیدیوں سمیت سوات، سیستان، قندھار، غزنی، کابل، جلال آباد، بنوں اور کافرستان کے مزدوروں، ہزارہ، منگول، فارسی بان، پنجابی، مکرانی، عربی، سکھ لیبر کے اشتراک عمل سے ٹنل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ مشینوں کے استعمال کے لیے تیل بابر کچھ سے 40 رمیل دور خشن کے مقام سے اونٹوں کے ذریعے لایا جاتا تھا اور پھر ٹرین کے ذریعے شیلہ باغ پہنچایا جاتا تھا۔

سرنگ میں کام کرنے کی رفتار کو تیز رکھنے کی خاطر انگریز قیدی لیبر کو تھوڑی بہت اجرت دیا کرتے تھے۔ ان مزدور قیدیوں کی تفریح کے لیے انگریز سرشام محفل موسیقی، رقص و سرور منعقد کرا دیتے تھے جہاں رقص گرم جوشی سے جاری رہتا اور انگریز انجینئر شراب کے خم لنڈھاتے رہتے اور مزدور قیدی اپنی کمائی کا پیسہ لٹاتے رہتے تھے۔

بلوچستان میں واقع خوجک یا کوژک سرنگ ابتدا میں دنیا کی چوتھی بڑی سرنگ تھی۔ جب کہ اس وقت دنیا کی آٹھویں طویل سرنگ ہے۔ اس کی لمبائی 3.92 رکلومیٹر ہے۔ اسے اس وقت گینتی بیلچے کے ذریعے کھودا گیا اور یہ انجینئرنگ کی کئی مشکلات پر قابو پاکر کھودی گئی ہے۔ یہ سرنگ چمن سے 17 میل پہلے شیلہ باغ اور چمن کے درمیان واقع ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر حکومت پاکستان نے اس کی تصویر پانچ روپے کے کرنسی نوٹ کی پشت پر چھاپی تھی۔

آپ کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ اگرچہ یہ سرنگ بالکل سیدھی ہے مگر اس کے درمیان میں کوہان کی طرح اتار چڑھاؤ ہے اور جونہی ٹرین اس مقام پر پہنچتی ہے، خودکار نظام کے تحت الارم بجتا ہے تاکہ انجن ڈرائیور کو معلوم ہو سکے کہ وہ اس مقام پر پہنچنے والا ہے۔ اس سرنگ میں پانی رسنے کی وجہ سے نمی رہی۔ اس طرح گاڑیاں پھسلتی رہیں۔ اب یوں اس سے بچنے کے لیے اقدام کیے گئے ہیں۔

اس سرنگ کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے اوپر بہت سے چشمے اور ندیاں بہہ رہی ہیں۔ جب کہ کوژک ٹنل ریل انجینئرنگ آرمی کے جنرل سرتھامس کی نگرانی میں 3 رسال کے عرصے میں 1891ء میں مکمل ہوئی تو یہ ٹریفک کے لیے کھول دی گئی تھی۔ اس پر اس وقت 6.82 رملین روپے خرچ ہوئے تھے جس میں ڈبل ریلوے لائن بھی بچھائی گئی ہے۔ اس سرنگ کا نمبر 18 رہے، جب کہ کوژک میں مندرجہ

ذیل 6 رسرنگیں بھی ہیں۔

1۔ سرنگ نمبر 17: 110 رفٹ طویل۔

2۔ سرنگ نمبر 19: 160 رفٹ طویل۔

3۔ سرنگ نمبر 20: 760 رفٹ طویل۔

4۔ سرنگ نمبر 21: 363 رفٹ طویل

5۔ سرنگ نمبر 22: 373 رفٹ طویل

6۔ سرنگ نمبر 23: 793 رفٹ طویل

ان تمام سرنگوں پر سن تعمیر کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ ان سرنگوں کے اختتام پر سنزلہ کا ریلوے اسٹیشن ہے پھر کچھ فاصلے پر چمن کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ چمن اس ٹھیکیدار چمن داس ولد لالہ رام چند کے نام سے منسوب ہے جس نے یہاں پہلی دفعہ چمن نارتھ فورٹ اور ایسٹ فورٹ کا کام کیا تھا۔

سرنگ کی تعمیر کے بعد انگریزوں کا خواب تھا کہ کسی طرح 110 رکلومیٹر آگے چمن سے قندھار کے علاقے تک بذریعہ ریل پہنچا جائے۔ مگر 1878ء میں شاہ افغانستان نے انگریزوں کو اپنی حدود میں داخلے کی ممانعت کردی اور اس کے ساتھ ہی ایک برطانوی افسر کو بھی اس کے عملے کے قتل کردیا گیا تو چمن سے قندھار تک ریلوے اسٹیشن بچھانے کا پروگرام برطانیہ کی گلیڈسٹون حکومت نے منسوخ کردیا اور یوں یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ جب کہ 1893ء میں ڈیورنڈ لائن کے روپ میں افغانستان اور ہندوستان کے درمیان ایک حد فاصل مقرر کی گئی تو اس معاہدے کے تحت لائن آگے نہیں جاتی تھی۔

جب انجینئر نے خودکشی کرلی

آپ کو شاید یہ پڑھ کر حیرانی ہوگی کہ سرنگ کے انگریز انجینئر نے اس کی تکمیل سے تین دن قبل اس وقت خودکشی کرلی تھی جب سرنگ اس کی پیشین گوئی کیے ہوئے وقت میں مکمل نہ ہوسکی تھی۔ دراصل اس نے اس کی تکمیل کا صحیح وقت اس کی کھدائی کے آغاز سے قبل بتا دیا تھا۔ مگر جب معین وقت گزر گیا اور سرنگ کے دونوں سرے آپس میں نہ مل سکے تو اس نے اپنی مارکنگ کو غلط سمجھتے ہوئے کہ شاید دونوں طرف سے کھودی جانے والی سرنگیں کھدائی کے دوران میں غلط اطراف میں نکل گئی ہیں اور تین سال کی محنت ضائع ہو گئی ہے۔ چناں چہ اس نے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کرلی کہ اتنے بڑے انجینئر کو اتنی بڑی غلطی کے بعد دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اس کی خودکشی کے تین دن بعد دونوں سرے آپس میں مل گئے اور سرنگ مکمل ہوگئی۔

شہلا نہیں شیلہ باغ

اس سرنگ کے مشرقی دہانے پر شیلہ باغ کا ریلوے اسٹیشن ہے جو کوژک کی تقریباً نصف بلندی پر واقع ہے۔ یہاں سے ریل گاڑی تو فوراً سرنگ پار کر کے مغرب کی جانب نکل جاتی ہے۔ جب کہ کوژک ٹاپ سطح سمندر سے 7575 رفٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس لیے عام ٹریفک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر پیچ و خم کھا کے اترتی چڑھتی ہے۔

شیلہ باغ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بعض مبالغہ آرائیاں سامنے آئی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ سرنگ کی تعمیر کرنے والے انجینئر کی بیوی کا نام شہلا تھا چونکہ انگریز انجینئر کو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لیے اس نے اپنی محبت کو لافانی بنانے کے لیے اس مقام کا نام ''شہلا باغ'' رکھ دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرنگ کی تکمیل پر پُر مسرت جشن منایا گیا۔ اس جشن

میں شہلا نامی ایک خوبرو رقاصہ نے اپنے رقص سے انجینئر کا دل موہ لیا۔ چنانچہ رقاصہ کی فرمائش پر اس مقام کا نام ”شہلا باغ“ رکھا۔ لیکن یہ سب محض تخیلاتی اور افسانوی باتیں ہیں۔ دراصل ”شیلہ“ پشتو زبان میں پہاڑی ندی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ مقام ایک ندی ”شیلہ“ کے کنارے واقع ہے، اس لیے اس مقام کا نام ”شیلہ باغ“ ہے۔ مقامی ناموں کو بگاڑنا اہل قلم کو زیب نہیں دیتا۔

بنکر نما مورچے

کوژک پہاڑ پر 1940ء میں روس کے خلاف اس کا راستہ روکنے کے لیے حکومت برطانیہ کی جانب سے توپ خانے کے مورچے، مشین گن کے مورچے، فول پروف مورچے، بنکر نما قابل دید اور قابل قدر حفاظتی برج بنائے گئے۔ آر، سی، سی کے بنے یہ برج اور بنکر نما مورچے مضبوطی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی مضبوطی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر برج اور بنکر نما مورچے کی پختہ دیوار تین فٹ موٹی ہے پھر اس میں چار پانچ انچ کے فاصلے پر دو دو انچ لوہے کی موٹی سی سلاخیں عمودی گاڑ دی گئی ہیں تاکہ یہ مورچہ شکن ہتھیاروں سے متاثر نہ ہو سکیں۔ ان سب کا رخ زاروس کی جانب ہے۔

بلوچستان پر بیرونی حملہ روکنے کے لیے کوژک اہم ترین دفاعی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ یہ کوژک سطح سمندر سے 8880 فٹ بلند ہے۔ اس لیے یہاں سے افغانستان کے 20 میل تک کے علاقے کی نقل و حرکت کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ افغانستان میں روسی فوجوں کی مداخلت کے دوران پاکستان نے اپنے دفاع کے لیے اس پر دیدبان چوکیاں اور ریڈار اسٹیشن قائم کیے تھے۔

وہ کوژک کا راستہ وسط ایشیائی ریاستوں کے لیے سمندر تک رسائی کا نزدیک ترین راستہ ہے۔ گوادر ریلوے لائن کی تعمیر سے بین الاقوامی تجارت کے فروغ کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ بلوچستان ریلوے کی یہ طویل سرنگیں کئی مسافروں اور انجینئروں سے داد وصول کریں گی۔

غزل (فیض احمد فیض)

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل
جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں پر
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیار حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

(انتخاب: ناجیہ ملک)

فتح کی علامت

زم زمہ توپ

ایک تاریخی توپ کا تذکرہ۔ 250 سالہ تاریخ اس پر قبضے کے جھگڑوں سے لبریز ہے۔

رانا محمد شاہد

زم زمہ کے کئی معنی ہیں۔ آتش پرست لوگ اپنی عبادت گاہوں میں آگ کی پرستش کرتے ہوئے یا نہاتے ہوئے آہستہ آہستہ جو الفاظ گنگناتے تھے، اسے بھی زمزمہ کہتے تھے۔ گانے کی اصطلاح میں ایک خاص آواز کے ساتھ گنگنانا بھی زم زمہ کہلاتا ہے۔ فارسی زبان میں شیر کی گرج کو بھی زمزمہ کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا کہ فارسی زبان میں اس کے انھی معنوں کی مناسبت سے اس کا نام زمزمہ رکھا گیا ہو کہ جب یہ دوران جنگ دشمن پر گولہ باری کرتی تو شیر کی سی گرج جیسی آواز پیدا ہوتی۔

زم زمہ توپ کی تیاری کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے دور میں ان کے وزیر اعظم شاہ ولی خان نے دو بڑے سائز کی توپیں بنانے کا حکم دیا جن کی تیاری کے لیے جزیہ کے طور پر لاہور کے رہائشی ہر ہندو گھرانے سے دھات کا ایک ایک برتن حاصل کیا گیا۔ یہ شاید اس لیے تھا کہ ہندو پیتل کے برتن زیادہ استعمال کرتے تھے۔ پھر تانبے اور پیتل کے آمیزے کو ملا کر 1757ء میں ایک ہی سائز کی دو بڑی توپیں تیار کی گئیں۔ تانبے اور پیتل کی بنی اسی توپ کو سب سے پہلے احمد شاہ ابدالی نے 1761ء میں پانی پت کی مشہور لڑائی میں استعمال کیا۔ اس جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی کابل جاتے ہوئے دوسری توپ کو اپنے ساتھ لے گیا اور زم زمہ توپ کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکا کیونکہ وہ خاص قسم کی گاڑی تیار نہیں ہوئی تھی جس پر لاد کر اسے لے جایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس توپ کو لاہور میں موجود اپنے گورنر خواجہ عبید کے سپرد کر گیا۔ احمد شاہ ابدالی جو دوسری توپ اپنے ساتھ لے

گیا تھا، وہ بھی دریائے چناب کے راستے میں ہی کہیں گم ہو گئی تھی۔

زم زمہ توپ خواجہ عبید کے پاس ایک سال تک پڑی رہی۔ 1762ء میں ہری سنگھ بھنگی نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ مغل گورنر خواجہ عبید نے اپنا اسلحہ خانہ لاہور سے دو میل کے فاصلے پر موجود موضع خواجہ سعید (موجود کوٹ خواجہ سعید) میں بنا رکھا تھا۔ بھنگی سنگھ نے محاصرہ کر کے اسلحہ خانہ پر قبضہ کر لیا۔ اس اسلحہ خانہ میں زم زمہ توپ بھی شامل تھی۔ ہری سنگھ بھنگی کی وجہ سے ہی اس توپ کا نام ''بھنگیوں کی توپ'' پڑا۔ 1764ء تک یہ توپ یونہی شاہ برج میں پڑی رہی۔ پھر جب سوبھا سنگھ اور گوجر سنگھ بھنگی نے لاہور پر قبضہ کر لیا تو یہ توپ بھی اپنی تحویل میں لے لی۔ کچھ دن بعد ایک اور سردار چیرت سنگھ سکرچاکیہ لاہور آیا، بھنگی سرداروں کو لاہور پر قبضے کی مبارک باد دی اور آخر میں مال غنیمت میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا کیونکہ لڑائی میں چیرت سنگھ نے بھنگی سرداروں کی مدد کی تھی۔ بھنگی سردار اس کے مطالبے پر ناخوش تھے۔ وہ اسے کچھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے ایک ترکیب سوچی، انھوں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا ''وہ زم زمہ توپ لے جائے۔''

بھنگی سرداروں کا خیال تھا کہ اتنی وزنی توپ وہ کہاں لے جا سکے گا اور یوں وہ اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائے گا۔ مگر وہ حیران رہ گئے جب چیرت سنگھ نے اپنے خادموں کو بلایا۔ ان کے ذریعے وہ پہلے توپ اپنے ڈیرے پر لے گئے۔ وہاں سے گوجرانوالہ میں واقع اپنے قلعے میں لے گئے۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ یہ توپ دو چٹھہ سردار احمد خان اور پیر محمد خان نے چیرت سنگھ سے چھین لی اور اپنے علاقے احمد نگر لے گئے۔ اتنی بڑی توپ دیکھ کر اس کے حصول کے لیے ان میں تنازع پیدا ہو گیا۔ احمد خان چاہتا تھا کہ توپ اس کی ملکیت میں رہے جب کہ پیر محمد کی خواہش تھی کہ وہ اس کا مالک ہو۔ جھگڑا اس قدر بڑھ گیا کہ اس لڑائی میں احمد خان کے دو بیٹے اور پیر محمد کا ایک بیٹا مارا گیا۔ اس کی لڑائی کو دیکھتے ہوئے گوجر سنگھ بھنگی، پیر محمد خان کی مدد کو پہنچا۔ چناں چہ ان دونوں نے لڑائی کے دوران احمد خان کو تنگ گھاٹیوں کی طرف دھکیل دیا۔

ایک دن اور ایک رات تک احمد خان کو پانی حاصل کرنے نہ دیا گیا۔ جس کے بعد احمد خان نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور توپ سے دست بردار ہو گیا۔ پھر توپ گوجر سنگھ نے پیر محمد خان کے حوالے کرنے کے بجائے اسے دھوکا دے کر اس پر قبضہ کر لیا اور اپنے صدر مقام گجرات لے گیا۔ یہ توپ دو سال تک گوجر سنگھ بھنگی کے پاس رہی۔ بھنگیوں اور سکرچاکیوں میں اکثر لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ چٹھوں نے 1772ء میں یہ توپ حاصل کر لی اور رسول نگر (اس کا پرانا نام رام نگر تھا) لے گئے۔ اگلے سال 1773ء میں سردار جھنڈا سنگھ بھنگی نے ملتان سے واپس آتے ہوئے ایک بار پھر حملہ کیا اور گوجر سنگھ سے زم زمہ توپ چھین لی۔ وہ اسے امرتسر لے گیا۔ 1802ء تک توپ بھنگیوں کے قلعے میں رہی۔ اسی سال رنجیت سنگھ بھنگیوں کو امرتسر سے چلتا کیا اور توپ اپنے قبضے میں لی۔ رنجیت سنگھ کے دور میں اس توپ کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اسے ''فتح'' کی علامت یا جنگ میں برتری حاصل کرنے کا نسخہ سمجھ لیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے اسے ڈسکہ، قصور، وزیر آباد، سوجان پور اور ملتان کی لڑائیوں میں خوب استعمال کیا۔ مگر 1818ء میں ملتان کے محاصرے کے موقع پر اسے کافی نقصان پہنچا۔ پھر یہ ٹھیک نہ ہو سکی اور اسے لاکر دہلی دروازے کے باہر رکھ دیا گیا۔ زمزمہ 1870ء تک وہیں پڑی رہی۔ اسی سال لاہور میں ڈیوک آف ایڈن برگ کی آمد کے موقع پر اسے انار کلی بازار کے قریب رکھ دیا گیا۔ اس وقت سے یہ توپ وہیں پڑی ہے اور ہر آنے جانے والے کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتی ہے۔

اس توپ کے متعلق ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ

توپ ہندوؤں کے دیوتاؤں میں سے سب سے نمایاں دیوتا ''مہادیو'' کا اوتار ہے۔ اسی عقیدے کی مناسبت سے انگریز دور میں بعض ہندو اس توپ پر چڑھاوے چڑھاتے رہے۔

زم زمہ توپ کی تیاری کے بعد اس کی تھوتھنی پر ایک فارسی عبارت کندہ کی گئی جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے ''شہنشاہ دوراں شاہ ولی خاں کے حکم سے وزیر نے یہ توپ بنام ''زم زمہ'' بنائی جو قلعہ گیر ہے، عمل شاہ وزیر۔'' اس توپ کی پشت کے درمیان میں بھی ایک فارسی عبارت لکھی گئی جس کا ترجمہ یہ ہے ''اس بادشاہ کے دور حکومت میں جو فریدوں کی شان و شوکت رکھتا ہے، تعریف و توصیف کا حق دار اور عدل کرنے والا ہے۔ زمانے کا مولیٰ احمد شاہ، بادشاہ تخت کو تسخیر کرنے والا اور جمشید جیسی شان و شوکت کا مالک ہے۔ بادشاہ کے دربار سے بڑے وزیر کو یہ حکم ملا کہ ہر ممکنہ ہنر بروئے کار لاتے ہوئے ایک ایسی توپ بنائی جائے، جو اژدھے کی طرح خوفناک اور پہاڑ کی طرح بڑی ہو۔ خانہ زاد، سپہر سریر شاہ ولی خان وزیر معاملات نے اس حکم کی تعمیل میں نہایت بہترین کاریگروں کو جمع کیا اور یہ کام مکمل کیا۔ لہٰذا یہ عجیب و غریب زم زمہ توپ تیار ہو گئی۔ اتنی تباہ کن کہ آسمان کے در و دیوار کو ہلا دینے والی۔ آخر کار اس کو بادشاہ کے حوالے کر دیا گیا۔'' اس کے منہ کے سوراخ کی چوڑائی ساڑھے 9 انچ ہے جب کہ توپ کی لمبائی 14 فٹ 4 انچ ہے۔

جب انگریز سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قابض ہو گئے تو تقریباً 1250 توپیں ان کے قبضے میں آئیں۔ ان میں سے 38 پر فارسی کے اشعار کندہ تھے، انہی میں زمزمہ توپ بھی شامل تھی۔

انگریز عہد میں جب پرنس آف ویلز (ولی عہد شہزادہ) ہندوستان آیا تو زمزمہ کو عجائب خانہ کے باہر

چبوترہ بنا کر آرائش کے لیے نصب کر دیا گیا۔ بعدازاں 1977ء میں اس کو مال روڈ لاہور پر نمائش کے لیے نصب کر دیا گیا۔ لاہور کے عجائب گھر میں برطانوی عہد میں ایک انگریز ملازمت کرتا تھا جس کے بیٹے Rudyard Kipling نے اپنے ناول ''KIM'' میں اس توپ کا تذکرہ کیا تھا۔ اس لیے اس کے نام سے زمزمہ توپ کو ''KIM's GUN'' بھی کہا جاتا ہے۔

زم زمہ توپ کا دھانہ سنہری رنگ کا جب کہ باقی توپ پہ زیادہ تر کالا رنگ ہے۔ توپ کو دھکیلنے کے لیے دو بڑے سائز کے پہیوں کے علاوہ پچھلی طرف بھی ایک چھوٹا پہیہ لگایا گیا ہے۔ مختلف جنگوں کے دوران اس توپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ دھکیلنے کے لیے سیکڑوں فوجیوں کو یہ ذمہ داری سونپی جاتی تھی۔ جب اس توپ سے گولہ داغا جاتا تو اس کی گرج دور تک سنائی دیتی۔ شاید یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہوں کہ جب یہ توپ مسلمانوں کے پاس تھی تو بہت سے سکھوں کی موت کا باعث بنی اور جب سکھوں کے ہاتھ آئی تو مسلمان بھی اس کا نشانہ بنے۔ آج یہ توپ لاہور کے مال روڈ پر ایک چبوترے پر موجود ہے۔ اس کے آس پاس فوارے لگے ہوئے ہیں۔ دن کے اوقات میں سیکڑوں کبوتر توپ کے اردگرد ہجوم کی صورت میں ''غٹرغوں'' کرتے نظر آتے ہیں جو زمزمہ توپ کے اردگرد کے ماحول کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

زم زمہ توپ..... لاہور کے چند اہم نوادرات میں سے ایک ہے۔ اسے ایک تاریخی ورثے کی حیثیت حاصل ہے۔ زم زمہ توپ کو ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے لوگ بڑے تجسس اور اشتیاق سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ یہ نہ صرف ڈھائی سو برس سے کئی جنگوں اور واقعات کی گواہ ہے بلکہ ہمارا ایک قومی ورثہ بھی ہے۔ آج بھی بچے جب اس توپ کے پاس سے گزرتے ہیں تو اپنے والدین یا بڑوں سے اس کے بارے میں ضرور سوال کرتے ہیں۔ اکثر بچارے اس توپ کا نام تو جانتے ہیں مگر اس کی تاریخ سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ■■

نامعلوم افراد

پہلے شہر میں آگ لگائیں نامعلوم افراد
اور پھر امن کے نغمے گائیں نامعلوم افراد
لگتا ہے کہ شہر کا کوئی والی ہے نہ وارث
ہر پل اپنی دھوم مچائیں نامعلوم افراد
ہم سب ایسے شہر ناپرساں کے باسی ہیں
جس کا نظم و نسق چلائیں نامعلوم افراد
لگتا ہے انسان نہیں ہیں کوئی چھلاوا ہیں
سامنے ہوں اور نظر نہ آئیں نامعلوم افراد
ان کا کوئی نام نہ مسلک، نہ ہی کوئی نسل
کام سے بس پہچانے جائیں نامعلوم افراد
نامعلوم افراد کے پیچھے ہیں معلوم افراد
کن معلوم افراد کے گائیں نامعلوم افراد

(عقیل عباس جعفری)

اپنی بینائی کو بہتر بنائیے

اس طریقے سے جرمن فوج کے رنگروٹوں نے خوب فائدہ اٹھایا

زبیر وحید

مشہور ناول نگار ایلڈوس ہکسلے (Aldous Huxley) نے اپنے بچپن کے تقریباً اٹھارہ مہینے مکمل اندھے پن میں گزارے تھے اور وہ صرف بریل کی مدد سے پڑھ لکھ سکتا تھا۔ ہکسلے کی بینائی اگرچہ جزوی طور پر بحال ہو گئی لیکن اس کے بعد نظر کی طاقتور عینک کے استعمال کے باوجود پڑھتے وقت وہ بہت زیادہ تھکن اور تناؤ محسوس کرتا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں اس کی دیکھنے کی صلاحیت اچانک خراب ہو گئی۔ اسے تعجب ہوا کہ کیسے وہ اپنے کام نمٹا سکے گا، کیونکہ اسے مکمل حد تک محسوس ہوتا تھا کہ وہ مکمل طور پر نابینا ہو چکا ہے۔ اس صورت حال میں اس نے ہر پہلو پر غور کیا کہ انسانی آنکھیں اتنی کمزور چیز کیوں ہیں کہ کسی بھی حملے سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں اور پھر دوبارہ تندرست نہیں ہو پاتیں؟ جب کہ جسم کے دوسرے اعضاء خودکار میکانیت سے درست ہو جاتے ہیں تو پھر آنکھیں کیوں نہیں درست ہوتیں؟ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں خود بخود جڑ جاتی ہیں، پھٹی ہوئی جلد درست ہو جاتی ہے اور خون کے خلیے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی آنکھوں پر یہ فارمولا کیوں لاگو نہیں ہوتا؟

اس نقطے کے پیش نظر ہکسلے نے دیکھنے کی تعلیم تو کے متعلق شناسی کے ماہر نیویارک کے ایک معالج چشم ڈاکٹر ڈبلیو۔ ایچ بیٹس (W.H.Bates) تھے۔ اس نے بیٹس کی تکنیک کو اپنایا اور کامل اعتماد سے ورزش کرتا رہا اور چند مہینوں بعد اس کا نتیجہ وہ یوں بیان کرتا ہے کہ

''صرف دو مہینے کے عرصے میں میں چشمے کے بغیر پڑھنے کے قابل ہو گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بغیر تھکاوٹ یا تناؤ کے..... ! دائمی تناؤ اور وقتی تھکان ماضی کی بات بن کر رہ گئی۔''

بیٹس کے طریقہ کار کو اپنا کر بہت سے لوگ بینائی کو بہتر بنا چکے ہیں اور چشموں سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ اس طریقے کی کامیابی کی وجہ عموماً یہ خیال کی جاتی ہے کہ بصری نقائص اکثر بنیادی طور پر عملی ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے نہ صرف ان کو کم کیا جا سکتا ہے بلکہ

ان کا با آسانی علاج بھی کیا جا سکتا ہے۔ آنکھوں کی خرابی کی بڑی وجہ اس میں عملی طور پر عضوی تبدیلی کا پیدا ہونا ہے۔ نظر کے چشمے انعطافی درستگی کے لیے تجویز کیے جاتے ہیں جو آنکھوں کے بوجھ کو کم کرتے ہیں۔

بیٹس کا کہنا ہے کہ ان واقعات کا تسلسل اکثر معکوس ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں تناؤ اکثر دیکھنے کی صلاحیت میں خرابی کے نتیجے کے مقابلے میں اس کا سبب ہوتا ہے۔ آنکھوں کا علاج چشمے کے استعمال کے بجائے تناؤ کو کم کر کے کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ چشمے بینائی کے لیے بیساکھیوں کا کام دیتے ہیں۔ یہ بینائی میں نقص کی وجہ کو دور نہیں کرتے چنانچہ ان کو استعمال کرنے والوں کو ہمیشہ ان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ آنکھوں کے نازک نظام کو ان کے استعمال میں مناسب حد تک کمی لا کر بہتر بنایا جا سکتا ہے جس سے جسم کو آنکھوں کی خرابی کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اس نظریے کی کامیابی کا یہ منہ بولتا ثبوت ہے کہ ہزاروں لوگوں نے اس طریقہ کار کو اپنایا اور انہیں اس سے بہت زیادہ فائدہ بھی ہوا۔ جرمنی میں بہت سے "Seeing-school" کھولے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ایک جرمن سرجن نے بتایا کہ آنکھوں کے استعمال کی تربیت سے فوج کے بہت سے رنگروٹوں کو فائدہ ہوا۔ ان کی بینائی میں کافی حد تک بہتری آئی اور ان کی نشانہ بازی کی صلاحیت چشموں کا استعمال ترک کرنے کے باوجود بہتر ہو گئی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں کی آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں، انہیں فوراً چشمہ نہیں لگوانا چاہیے بلکہ پہلے آنکھوں کے استعمال میں کمی لا کر انھیں بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بہت سے لوگ صرف یہ سیکھ کر کہ اپنی آنکھوں کو کیسے قابلیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے، اچھا خاصا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ بہت زیادہ تناؤ کی حالت میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے آنکھوں پر بوجھ پڑتا ہے۔ آنکھوں کی بہترین صحت کے لیے شرط اول کو جاننا ضروری ہے اور یاد رکھیے کہ سکون شرط اول ہے، یہ ایک اور طرح کا نفسی حرکی فن ہے، جیسے کہ جمناسٹک، گائیکی اور گولف ہے۔ جب ہم بہت کوشش کرتے ہیں تو ہمیں بہت زیادہ تناؤ ہوتا ہے اور اس کا اثر ہماری کارکردگی پر بھی پڑتا ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو غصے میں دیکھیں تو غصے میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ ہمیں آنکھوں کو صرف دیکھنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے نہ کہ ان کو دیکھنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ آنکھوں کے غلط استعمال کا نقصان ہمارا اپنا ہی ہو گا۔ کسی بھی آرٹ گیلری میں آویزاں تصویر کو آگے بڑھ کر دیکھنے کے بجائے کوشش کرنی چاہیے کہ دور کھڑے ہو کر دیکھی جائے۔ تصویر اس انداز سے دیکھیں کہ یہ آپ کی جانب بڑھے۔ ایک مشہور شخص کا قول ہے کہ "دریا کو مت دھکیلیں اسے اپنی ڈگر پر بہنے دیں۔"

آنکھوں پر تناؤ کبھی فائدہ مند نہیں ہوتا۔ صاف دیکھنے کے لیے ہمیں اپنی آنکھوں کو متحرک رکھنا چاہیے۔ اگر ہماری آنکھیں کسی شے پر کافی دیر جمی رہیں تو ہمارے ادراک کا عمل ہلکا پڑ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم انگلیوں کو میز پر رکھیں تو تھوڑی دیر بعد ہمیں اس بات کا احساس نہیں رہتا کہ ہماری انگلیاں کہاں ہیں۔ ان دونوں قسم کے واقعات میں انگلیوں یا آنکھوں کی حرکت ہماری آگاہی میں اضافہ کرتی ہے۔ آنکھوں کے متحرک رہنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہم ۱۳۰ ملین سے زائد روشنی کے لیے حساس خلیوں (Receptor Cells)

کی مدد سے دیکھتے ہیں جو راڈز (Rods) کونز (Cones) کہلاتے ہیں۔ یہ خلیے آنکھوں میں یکساں طور پر منقسم نہیں ہوتے۔ پردۂ چشم کی بیرونی جانب راڈز کثرت سے ہوتے ہیں۔ یہ خلیے مدھم روشنی میں بہتر طور پر کام کرتے ہیں۔ رات کے وقت جس شے کو ہم صاف دیکھنا چاہتے ہیں اسے دیکھنے کے لیے ہمیں محیطی بصارت (Peripheral Vision) کی ضرورت ہوتی ہے۔ پردہ بصارت کے درمیانی حصے میں بڑی تعداد میں کونز (Cones) ہوتے ہیں۔ جو دن کی روشنی میں دیکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ جب ہم زرد نقطہ (Macula Lutea) پر نظر مرکوز کرتے ہیں تو ہمیں تیز بصارت حاصل ہوتی ہے، یعنی ہم بہتر طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ زرد نقطہ پردہ چشم کی پچھلی جانب موجود ہوتا ہے جہاں پر کونز کا زیادہ ارتکاز ہوتا ہے اور راڈز مکمل طور پر غائب ہو جاتے ہیں۔ پردہ چشم کے کچھ حصوں میں ایک عصبی ریشہ ۱۰۰ مختلف الگ الگ راڈز اور کونز کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ لیکن زرد نقطہ پر ہر کون اپنا عصبی ریشہ رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم زرد نقطہ پر نظر کو مرکوز کرتے ہیں تو ہم بہت تفصیل کے ساتھ تصویر کو دماغ میں منتقل کرتے ہیں۔ صاف دیکھنے کے لیے ہمیں زرد نقطہ پر اپنی نظر کو بہتر بنانے کا فن سیکھنا چاہیے۔ ہم کسی نظارے کو مکمل طور پر ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ سکتے لیکن ہمیں اس کی ایک مرکب تصویر بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ٹی وی کی تصویر نقاط کے ڈھیروں تسلسل سے بنتی ہے۔ گھور کر دیکھنے سے آنکھوں کی آزادانہ تجزیاتی حرکت میں کمی آتی ہے۔ گھور کر دیکھنے سے بصارت کی تیز فہمی میں بھی کمی آتی ہے اور اس کے ساتھ ہم انتہائی کوشش سے دیکھنے سے زیادہ تناؤ اور دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔

ایلڈوس ہکسلے اپنی تصنیف "دیکھنے کا فن" (The Art of Seeing) میں لکھتا ہے کہ "گھورنے والی نظر ہمیشہ موضوع کو الٹ دیتی ہے۔" کیونکہ زیادہ دیکھنے کے بجائے، ایک شخص جو اپنے حسی اعضاء کو غیر متحرک کر چکا ہوتا ہے (حسی اعضاء کو غیر متحرک کرنا ایک ایسا عمل ہے، جس میں انسان اپنی قریبی باہمی توجہ بھی غیر متحرک کر دیتا ہے) اس سے اس کی دیکھنے کی قوت خود بخود کم ہو جاتی ہے۔

بدقسمتی سے ہم آنکھوں سے کرنے والے بہت سے کاموں میں آرام سے دیکھنے کے بجائے گھورنے اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے عمل کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس سے آنکھوں پر غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے۔ جب ہم کار چلاتے ہوئے، ٹیلی ویژن دیکھنے کے دوران، کتاب پڑھتے ہوئے، یا سوئی دھاگے سے کوئی نفیس اور باریک کام کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کو غیر عضویاتی انداز سے استعمال کرتے ہیں۔ جس سے آنکھوں پر دباؤ پڑتا ہے اور تناؤ محسوس ہوتا ہے۔ عضلات ہمیشہ اس وقت تکلیف محسوس کرتے ہیں جب انھیں کافی دیر تک ایک ہی حالت میں سکڑے رہنا پڑے، جیسے کہ پین کو دیر تک پکڑے رکھنے، سوٹ کیس اٹھانے اور زیادہ دیر جھکے رہنے سے عضلات تھک جاتے ہیں۔ چلنے، تیرنے اور ناچنے جیسے قدرتی افعال میں عضلات پر نسبتاً کم تناؤ ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کی حرکات میں عضلات سکڑتے بھی ہیں اور سکون بھی حاصل کرتے ہیں۔ عضلات کا اس طرح متبادل حالتیں حاصل کرنا رگوں، ٹانگوں، بازوؤں، دل اور آنکھوں کے لیے بہت مفید ہے۔

آنکھوں کے ڈھیلے کی حرکت کو چھ عضلات کنٹرول کرتے ہیں۔ بغور نظر جما کر کافی دیر تک کام کرتے رہنے سے منشی روگ (Writer's Cramp) لاحق ہو سکتا ہے۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ آنکھوں کو ادھر ادھر گھمائیں۔ اگر ایسا کرنے سے بھی صورت حال میں فرق نہیں آتا تو کام کے وقفوں اور پڑھنے کے اوقات میں تبدیلی پیدا کر کے تناؤ سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ آنکھوں سے کیے جانے والے کاموں کے دوران وقفوں سے نظریں ہٹا ہٹا کر عضلات میں مستقل سکڑاؤ سے پیدا ہونے والے درد کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اسی بات کا اطلاق آنکھوں کے اندر مژگانی عضلات (Ciliary Muscles) پر بھی ہوتا ہے جو آنکھوں کے عدسے کے خم اور نتیجتاً عدسے کی فوکس کرنے کی طاقت کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جب ہم دیر تک کسی شے پر نظروں کو مرکوز رکھتے ہیں تو اس سے ان عضلات پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔

بینائی قدرت کا حسین ترین عطیہ ہے اس لیے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی قدرتی جسمانی نظام نے خود لیا ہوا ہے۔ آنکھوں کے جھپکنے کے عمل سے آنکھیں محفوظ رہتی ہیں اور ان میں پڑنے والی خاک اور ذرات صاف ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں کے جھپکنے کے دوران ایک نمکین مائع نکلتا ہے جو آنکھوں کی صفائی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آنکھوں کے جھپکنے کا دورانیہ ایک سیکنڈ کے 3/10 ویں حصے کے برابر ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھیں ایک منٹ میں اوسطاً 20 دفعہ جھپکتی ہیں۔ اس سے پردہ چشم کے خلیات کو سکون ملتا ہے۔ ٹکٹکی باندھ کر کام کرنے سے آنکھوں کے جھپکنے میں کمی آتی ہے۔ اس لیے کام کرتے وقت چاہیے کہ آنکھوں کو جھپکتے رہیں تاکہ غیر ضروری درد، تکلیف اور تناؤ سے بچا جا سکے۔

کائنات کے مالک اور خالق نے ہمیں کانوں کو بند کرنے کے لیے ڈھکنے نہیں دیے لیکن آنکھوں کو غیر ضروری روشنی سے بچنے کے لیے پلکیں ضرور عطا کی ہیں جنھیں بوقت ضرورت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب آنکھیں استعمال میں نہ ہوں تو انھیں بند ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس جب آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو انھیں مکمل طور پر کھلی ہونا چاہیے۔ ہم اپنے مشاہدے کے عمل کو تیز کر کے اپنے دیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ بینائی کا انحصار دماغ کی طرف بھیجی گئی ترجمانی پر ہوتا ہے اور اس کا انحصار ذخیرہ شدہ بصری یادداشتوں پر اسی طرح ہوتا ہے جیسے رواں بصری محرکات پر ہوتا ہے۔ اگر آنکھیں خراب عادات کی وجہ سے تناؤ کا شکار ہوتی ہیں یا اگر کم روشنی کی صورت میں ان کے استعمال سے تھکاوٹ محسوس ہو یا تیز چمکدار روشنی میں آنکھیں چندھیا جائیں تو:

1۔ آنکھوں کو ملنا نہیں چاہیے۔ اس کے بجائے مندرجہ ذیل تکنیکوں کو بروئے کار لائیں اور ان پہ آنکھوں پر چشمہ لگائے بغیر عمل کریں۔

2۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپ کر آرام و سکون دیں۔

آنکھوں کو کچھ سیکنڈ ڈھانپے ہوئے یہ محسوس کریں کہ آپ ایک ایسے کمرے میں موجود ہیں جس کی دیواروں پر گہرے مخملیں کپڑے لٹکائے گئے ہیں۔

3۔ تب آنکھیں کھولیں اور پلکوں کو تیز تیز اور ایک ترتیب سے جھپکیں۔ اس سے آنکھوں کے اردگرد کے عضلات متحرک ہو جائیں گے۔

4۔ چہرے اور آنکھوں کے اردگرد کے عضلات کو ورزش کرائیں، پہلے آنکھوں اور بھوؤں کو سکیڑیں اور بعد میں ڈھیلا چھوڑ دیں۔ اس ورزش کو کئی دفعہ دہرائیں۔

5۔ آنکھ کے چھ مداری عضلات میں تناؤ کو کم کرنے کے لیے سر کو بالکل ساکت رکھیں۔

6۔ پہلے آنکھوں کو گھڑی وار (Clockwise) گھمائیں اور بعد میں خلاف گھڑی وار (Anticlockwise) سمت میں گھمائیں۔ ایسا کئی بار کریں۔

7۔ پھر ایک انگلی کو آنکھوں سے آٹھ انچ کے فاصلے پر ہو کر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں۔ اس ورزش کو بھی کئی بار کریں۔ اس سے ہمارے مژگانی عضلات میں تناؤ ختم ہو جائے گا۔

جو لوگ آنکھوں میں تھکن اور تکلیف محسوس کرتے ہیں وہ ان سادہ ورزشوں کو بار بار دہرا کر استفادہ کر سکتے ہیں کیونکہ دوسری جسمانی ورزشوں کی طرح آنکھوں کی ورزشیں بھی ضروری ہیں۔

■■■

"ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ"

دنیا بھر کے مسلمانوں میں کارلائل کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جاتا ہے، اس لیے انگلستان میں وہ پہلا شخص ہے جس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس کو ان تعصبات سے بلند ہو کر دیکھا جو اس کے عہد میں دشمنان اسلام نے عام طور پر پھیلا رکھے تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں یورپ کے پادریوں نے اسلام اور رسول پاک ﷺ کے متعلق ایسی غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن باتیں مشہور کر رکھی تھیں کہ آج پڑھیں تو خون کھولنے لگتا ہے۔ تعصب اور جہالت کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں کارلائل پہلا شخص تھا جس نے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" لکھ کر دشمنی اور کذب و افترا کے بادل چاک کیے۔ (۱۸۴۰ء میں تھامس کارلائل نے جب "ہیرو ورشپ" لکھی، اس وقت اس امر کا کھلے بندوں اعتراف کرنا کہ محمد ﷺ دنیا کے تمام پیغمبروں کے ہیرو ہیں، بڑے دل گردے کا کام تھا۔) اس کتاب میں ایک جگہ تھامس کارلائل لکھتا ہے:

"یہ وہ شخص ہے جس کے گھر میں مسلسل کئی مہینے چولھے میں آگ نہیں جلتی تھی، جو پیٹ بھرنے کے لیے جو کی روٹی کھا کر آدمیوں کی طرح محنت مزدوری کر کے اپنی روزی کماتا تھا۔ تیس سال تک صبح و شام اور دن رات یہ شخص ان تند مزاج عربوں کے درمیان کام کرتا رہا جو سخت کینہ پرور، خوں آشام اور بات بات پر تلواریں کھینچ لینے والے لوگ تھے۔ اس کی زندگی کی کوئی رمز ان لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی۔ اس کے باوجود ان اکھڑ مزاج اور غضب ناک عربوں نے جس خلوص و عقیدت سے محمد ﷺ کے آگے گردنیں جھکائی ہیں، دنیا کے بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کے آگے بھی اس طرح لوگوں کی گردنیں نہیں جھکیں۔ میں یقیناً اس شخص کو پیغمبروں کا ہیرو سمجھتا ہوں۔"

(چند یادیں، چند تاثرات از عاشق بٹالوی)

انتخاب: آسیہ عبدالصمد، لاہور

5 ہزار ایسے لوگوں پر تحقیق کے دلچسپ نتائج جن کی عمر 100 سال سے زیادہ تھی۔

طویل عمری

درازئ عمر کیا واقعی آپ کے ہاتھ میں ہے؟

ڈاکٹر اظہر اے انور

ایک نکتہ جس پر تقریباً سب ماہرین فعلیات (Physiologists) متفق ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری عمروں کا تعلق جسمانی صلاحیتوں، جسم کے نظام کار اور ہماری مجموعی صحت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ صحت و تندرستی میں اضافہ کر کے زندگی کو طویل بنایا جا سکتا ہے۔

موجودہ صدی کی ابتدا میں ایک اوسط امریکی مرد سنتالیس سال کی عمر تک زندہ رہنے کی توقع رکھتا تھا۔ لیکن 1950ء تک امریکا میں اوسط عمر مڑسٹھ سال تک پہنچ گئی۔ اگر ہم خطرناک اور جان لیوا بیماریوں پر مکمل قابو پالیں تو زندہ رہنے کی توقعات میں مزید پانچ سال کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی حادثات سے بچاؤ کے بعد اس میں چھ مہینے اور بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن بیماریوں کے علاج میں ترقی سے ہماری زندگیوں میں اور طرح کی تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں۔ پاولوف (Pavlov) روس کا ایک عظیم عضویات دان تھا، اس کا خیال تھا کہ اگر ہم میں سے ہر ایک خود کو تندرست و توانا رکھنے کے لیے محنت کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ سو سال تک زندہ نہ رہ سکے۔ اس کا کہنا ہے کہ "شراب خوری بے قاعدگی اور ورزش کا فقدان خرابی صحت کا باعث ہے۔" تازہ ترین تحقیق کے مطابق ہمارے ملک پاکستان میں اوسط عمر 47 سال ہے۔

اکثر قوموں کے افراد اپنے لوک سورماؤں (Folk Heroes) کو یاد کرتے ہیں، جو اپنی عمر کے آخری حصوں میں جرأت، بہادری اور طاقت کے غیر معمولی جوہر دکھاتے تھے۔ روس نے جارج ہیکن شمٹ (George Hacken Schmidt) عالمی ریسلنگ چیمپئن پیدا کیا جو 85 سال کی عمر تک مکمل صحت مند تھا۔ وہ اپنے آپ کو چاق چوبند رکھنے کے لیے کرسی کی پشت سے 50 چھلانگیں لگاتا تھا۔ یوگوسلاویہ نے فینی کوپ لینڈ (Fanny Copeland) پیدا کی جو 88 سال کی عمر میں اپنے ملک کی 9400 فٹ بلند ترین چوٹی ٹرگ لیو (Triglav) پر چڑھ سکتی تھی۔ امریکا میں 105 سالہ پیر لیری لوئس (Larry Lewis)، اپنی تمام عمر میں پورا دن کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور سات میل روزانہ دوڑ لگاتا تھا۔ پاکستان کے پہاڑی علاقوں مثلاً چترال اور کیلاش میں عموماً ایسے بوڑھے ملتے ہیں، جن کی عمر سو سال سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ مکمل فٹ ہوتے ہیں۔ سب کچھ کھا کر ہضم کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس قدر متحرک نہیں ہوتے جس قدر ایک نوجوان ہوتا ہے۔ کیا ایسے افراد اعجوبہ ہیں؟ کیا اس طرح کی غیر معمولی صلاحیت ہم سب کی دسترس میں ہے؟ اس سوال کے جواب کی غرض سے پانچ ہزار کے قریب سو سال عمر پانے والے امریکیوں پر تحقیق کی گئی۔ اس تحقیق کے مطابق ان لوگوں نے طویل عمر اس وجہ سے نہیں پائی کہ وہ کسی حیاتیاتی حادثے سے دوچار نہیں ہوئے بلکہ ان کی درازئ عمر کی وجہ روزمرہ کے معمولات اور پریشانیوں سے احسن طریقے سے نبرد آزمائی تھی۔

جو یقیناً ایک طویل اور صحت مند زندگی کے رازوں میں سے ایک ہے۔ تندرستی اور درازئ عمر کے لیے باقاعدہ ورزش، تازہ ہوا، کھانے میں باقاعدگی اور خیال اور عمل میں اعتدال بہت ضروری ہے۔ مرجان فلوز کا کہنا ہے کہ "ہر آدمی جو 40 سے 50 سال تک کی عمر کو پہنچتا ہے یا تو وہ بے وقوف ہوتا ہے یا پھر اپنا طبیب خود بن جاتا ہے۔" ماہرین درازئ عمر اور صحت کے لیے ہر عمر میں ورزش کا مشورہ دیتے ہیں۔

جارجیکن جیرونٹولوجی سنٹر کے ڈائریکٹر نے کوہ قاف کی پہاڑیوں پر سو سال یا اس سے زیادہ عمر پانے والوں کے متعلق بتایا کہ اس نے ایسا بوڑھا نہیں دیکھا جو فارغ بیٹھا ہو۔ ان لوگوں کی پوری زندگی کام، آرام اور کھیل پر مشتمل ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح کی ایک اور تحقیق ولکا بامبا (Vilcabamba) پر کی گئی، جو ایکویڈر (Ecuador) کی ایک بڑی وادی ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں کے سو سالہ افراد میں زیادہ تر لوگ مرنے تک کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتے رہتے ہیں۔ ان تمام شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے روس میں بڑھاپے کے ایک ادارے نے نتیجہ اخذ کیا کہ "جو شخص درازئ عمر چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ کام کرتا رہے۔" اس طریقے پر عمل کر کے عورتیں اور مرد دونوں لمبی عمر پا سکتے ہیں۔

ذہنی سکون بھی لمبی عمر کا باعث بنتا ہے، بہت سے سو سال عمر پانے والے مستقل عادات پر زور دیتے ہیں، اور وہ اس بات کا بھی دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ ہمیشہ خوش ہی رہے ہیں۔ ایسے افراد اپنی زندگی میں بنیادی قناعت پسندی پر گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کوہ قاف کے قریب رہنے والوں میں جتنے بھی حضرات کی عمر سو سال سے زیادہ تھی، ان میں سے ایک بھی کنوارہ نہیں تھا، اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ازدواجی زندگی کے خوشگوار ہونے کا تذکرہ نہ کرتا ہو۔ ایک نے کہا "میری چھ بیویاں تھیں جو سب کی سب زبردست قسم کی خوش مزاج تھیں۔" اس نے کہا "اگر آدمی کی شادی مہربان اور شفیق قسم کی عورت سے ہو جائے تو وہ بآسانی سو سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔" اپنی چھ بیویوں کی تعریف کرنے کے بعد ساتویں بد مزاج بیوی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اس عورت سے

شادی کے بعد اس کی زندگی میں مثبتی تبدیلیاں آئیں اور وہ یک دم اپنی اصل زندگی سے دس سال پہلے ہی بوڑھا ہو گیا یعنی اس کی صحت میں جو تبدیلیاں دس سال بعد آنی تھیں، وہ ایک دم آ گئیں۔

زندہ رہنے پر توجہ اور اس طرف رجحان بھی اہم ہے۔ ہمیں زندگی میں مرنے تک ہر روز اپنی حفاظت کرنی ہوتی ہے۔ یوں تو انسان اپنی پوری زندگی میں کسی بھی وقت اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مکمل ہے۔ ہر وہ آدمی جو ہمیشہ جوان اور تندرست و توانا رہنا چاہتا ہے اسے ژنگ (Jung) کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ نصیحت اس نے اپنی زندگی کے اس حصے میں کی جب اس کی عمر 76 سال تھی۔ اس نے کہا کہ "ہر دن اس طرح گزاریے کہ آپ سو سال مزید زندہ رہیں گے۔ یوں آپ حقیقی معنوں میں طویل عمری کی آخری حد تک زندہ رہ سکتے ہیں۔"

جدید دوائیں درازی عمر کے لیے کافی نہیں ہیں کیونکہ ہمیں اپنی زندگی کے دورانیہ کو بڑھانے کے لیے محض زندہ ہی نہیں رہنا، بلکہ ان سالوں کو زندگی سے بھرپور بھی بنانا ہے۔

■■■

ایک سیکنڈ

سیکنڈ وقت کی بہت ہی معمولی سی مدت کو کہتے ہیں۔ یہ بہت جلد گزر جاتا ہے۔ اس کی اہمیت ہماری زندگی میں کتنی ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں:

انسانی اور حیوانی اجسام میں بعض عمل اتنی تیزی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگتا ہے۔

کسی شخص کا ہاتھ بجلی کے تاروں کو چھو جائے تو وہ سیکنڈ کے آٹھویں حصے کے اندر ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ یہ ایک غیر ارادی فعل ہوتا ہے۔

انسان سیکنڈ کے چالیسویں حصے میں پلک جھپکا لیتا ہے۔

انسانی چھینک کا عمل ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

ایک مشہور ناول نگار کا کہنا ہے کہ یورپ کے دو پہلوان کشتی لڑ رہے تھے۔ دس سیکنڈ میں ایک نے دوسرے کو پچھاڑ دیا اور اس عرصے میں میرا ذہن ایک مکمل ناول کا خاکہ ترتیب دے چکا تھا۔

ایک مینڈک سیکنڈ کے چالیسویں حصے میں اپنی خوراک یعنی کیڑے کو چٹ کر جاتا ہے۔

گرگٹ نہ صرف رنگ بدلنے میں مشہور ہے بلکہ زبان بھی اتنی پھرتی سے چلاتا ہے کہ شاید ہی کوئی اور جانور اس پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہو۔

گرگٹ اپنے سے ایک فٹ اوپر اڑتی مکھی کو نصف سیکنڈ سے بھی کم وقت میں چٹ کر جاتا ہے۔

چیتا غصے کی حالت میں ایک سیکنڈ میں ایک سو تیس فٹ لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔

(الطاف اللہ لطف۔ کا گجرہ شب قدر)

اگر آپ روزانہ ہشاش بشاش رہنا چاہتے ہیں، تو ضروری ہے کہ غذائیت (Nutrients) سے بھرپور غذا کھائیے۔ غذائیت سے مراد وہ حیاتین، معدنیات اور دیگر غذائی اجزا ہیں جن کی ہمارے بدن کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہی عناصر ہماری جسمانی مشین کا ایندھن ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستانیوں کی اکثریت غذائیت بخش غذا نہیں کھاتی بلکہ تلی و مرغن غذائیں، مٹھائیاں، کباب، بوتلیں، نمکین چٹخارے کھانے وغیرہ ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق روزانہ پاکستانی "50 فیصد حرارے" انہی غذاؤں سے پاتے ہیں مگر یہ غذائیں لوگوں کو امراض سے محفوظ نہیں رکھتیں اور نہ ہی انھیں کوئی فائدہ پہنچاتی ہیں۔

ذیل میں ایسے 6 عناصر کا تعارف پیش ہے جنھیں روزانہ بذریعہ غذا حاصل کرنا ضروری ہے۔

حیاتین

حیاتین (وٹامن ڈی)

ہماری ہڈیوں کی مضبوطی اور تندرستی کے لیے ضروری ہے۔ مزید برآں یہ ہمارے نظام استحالہ (Metabolism) کی کارکردگی بڑھاتا، غیر معمولی بھوک کم کرتا اور ہارمون (Immune) نظام کو تقویت پہنچاتا ہے۔

سورج حیاتین کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسم سرما میں جب سورج گہری دھند کے پیچھے چھپ جائے اور ہمیں مناسب دھوپ نہ ملے، تو ہم متفرق بیماریوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ یاد رہے اگر ہم پندرہ منٹ دھوپ میں کھڑے

رہیں تو ہمیں حیاتین کی یومیہ مقدار مل جاتی ہے۔

تحقیق و تجربات سے انکشاف ہوا ہے کہ انسان باقاعدگی سے حیاتین ڈی کی مطلوبہ مقدار لے تو وہ جلد سینے اور غدہ قدامیہ (Prostate) کے سرطان سے بچا رہتا ہے۔ مزید برآں کیلشیم اور میگنشیم کے ساتھ مل کر ہڈیوں کی افزائش کرتا اور قلبی نظام کو مضبوط بناتا ہے۔

اگر آپ تندرستی، جوانی اور طویل عمر پانا چاہتے ہیں، تو حیاتین ڈی کی یومیہ مقدار ضرور حاصل کیجیے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دن میں کچھ وقت دھوپ میں گزاریے یا پھر غذاؤں سے پائیے۔ حیاتین ڈی مچھلیوں، گھونگھوں، جھینگوں، انڈوں اور کھمبیوں میں ملتا ہے تاہم غذاؤں میں اس حیاتین کی مقدار معمولی ہوتی ہے۔ لہٰذا سورج ہی سے اسے پائیے جو ہمیں مفت عطا کرتا ہے۔

اومیگا تھری کا تیزاب

گزشتہ چند برس میں چکنائی کے اومیگا تھری تیزابوں پر تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ ہمیں تندرستی عطا کرنے کی زبردست صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ دراصل یہی تیزاب ہمارے جسم میں چکنائی (Fats) بناتے ہیں جو بڑا اہم غذائی عنصر ہے۔ مزید برآں جسمانی سوزش ختم کرنے، خون میں تھکے (Clots) بننے کا عمل روکتے، خلیوں کی جھلی بناتے اور انھیں صحت عطا کرتے ہیں۔

اومیگا تھری تیزاب دراصل چکنائی کی اچھی قسم، پولی ان سیچوریٹڈ بناتے ہیں۔ نیز یہ خون میں نقصان دہ کیمیائی مادے، ٹرائی گلیسرائیڈز کم کرتے اور ایل ڈی ایل کولیسٹرول گھٹاتے ہیں۔ یوں ہمارے نظام قلب کی حالت بہتر ہوتی ہے۔

ہمارا جسم اومیگا تھری تیزاب پیدا نہیں کرتا، چنانچہ انھیں غذاؤں سے پانا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے یہ مقدار میں کم پائے جاتے ہیں، لہٰذا انھیں زیادہ مقدار میں کھانا ضروری ہے۔ یہ تیزاب چربیلی مچھلیوں سالمن، ٹونا، سارڈین، میکرل، اخروٹ، السی کے بیجوں اور سن کے بیجوں (Hempseeds) میں ملتے ہیں۔

حیاتین ای

یہ حیاتین ضد تکسیدی (Antioxidant) مادہ ہے۔ چنانچہ یہ ہمارے جسم میں دنگا فساد مچانے والے آزاد اصلیے (Radicals) مارتا ہے۔ یاد رہے، یہ آزاد اصلیے ہی ہیں جو ہمارے جسمانی خلیوں کو مارتے، ہمیں رفتہ رفتہ امراض کا شکار بناتے اور بوڑھا کرتے ہیں۔ مزید برآں حیاتین ای ہمیں سرطان اور الزائمر مرض سے بھی بچاتا ہے۔

یہ چکنائی میں حل ہو جانے والے ان چار بنیادی حیاتین میں سے ایک ہے، جو ہماری جسمانی کارکردگی کا اعلیٰ سطح پر لے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستانیوں کی اکثریت بذریعہ غذا حیاتین ای مطلوبہ مقدار میں حاصل نہیں کرتی اور خوش قسمتی یہ ہے کہ یہ حیاتین کئی غذاؤں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سورج مکھی کے بیج، خالص گندم، مونگ پھلیاں، زیتون کا تیل، پستہ، ساگ، بند گوبھی، کیوی پھل، آم اور خوبانی نمایاں ہیں۔

کیلشیم

اس معدن کے متعلق مشہور ہے کہ یہ وٹامن ڈی کے ساتھ مل کر ہڈیاں مضبوط کرتا ہے۔ لیکن کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ یہ ہمارے نظام اعصاب کو بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ مزید برآں ہمارے خون کا دباؤ (بلڈ پریشر) معمول پر رکھتا ہے۔ جو انسان کم کیلشیم لے، وہ بلند فشار خون کا نشانہ بن جاتا ہے۔

کیلشیم کی گولیاں بھی دستیاب ہیں لیکن بہتر ہے کہ یہ غذاؤں کے ذریعے حاصل کیجیے۔ نوجوانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزانہ 1000 ملی گرام کیلشیم لیں۔ 50 سال کی عمر کے بعد یہ مقدار 1200 ملی گرام ہو جاتی ہے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کو مزید کیلشیم درکار ہوتا ہے۔

یہ اہم معدن دودھ، ڈیری مصنوعات، گہرے سبز پتوں والی سبزیوں، مالٹوں، مغزیات، مچھلیوں، خوبانی اور انجیر میں ملتا ہے۔

میگنشیم

ہماری ہڈیاں مضبوط و توانا کرنے میں میگنشیم بھی کام آتا ہے لیکن پاکستانیوں کی اکثریت اپنے بدن میں یہ ضروری معدن نہیں رکھتی۔ کیلشیم کے مانند یہ بھی ہمارے کئی جسمانی افعال تندرست رکھتا ہے۔ مثلاً خون کی روانی بحال رکھتا اور شریانوں پر سے دباؤ ہٹاتا ہے۔ مردوں کو چاہیے کہ وہ روزانہ بذریعہ غذا 420 ملی گرام میگنشیم لیں۔ خواتین کو 320 ملی گرام لینا چاہیے۔

یہ معدن سورج مکھی کے بیجوں گہرے سبز پتوں کی سبزیوں، گہری چاکلیٹ، کھیا کدو، کھیرا، مغزیات اور خالص اناج اور پھلوں میں ملتا ہے۔

حیاتین سی

یہ بھی ضد تکسیدی ہے اور جسم میں زہریلے کیمیائی مادے ختم کرتا ہے۔ دیگر اہم معدنیات اور حیاتین کی طرح یہ بھی ہمارے کئی جسمانی افعال ٹھیک رکھتا ہے۔ یوں وہ اپنا کام بخوبی کرتے ہیں۔ حیاتین سی ہمارا نظام مامون بہتر بناتا، زخم ٹھیک کرتا، ہمیں سرطان سے بچاتا اور آزاد اصلیوں سے پہنچنے والا نقصان دور کرتا ہے۔

ان خصوصیات کے باعث حیاتین سی روزانہ لینا ضروری ہے۔ پھر یہ جسم میں ذخیرہ نہیں ہوتا، لہٰذا اس کو ہر روز لینا پڑتا ہے۔ ایک بالغ مرد کی یومیہ مطلوبہ مقدار 75 ملی گرام ہے جب کہ خواتین کو 95 ملی گرام درکار ہوتا ہے۔ یہ مقدار ایک پیالی گوبھی کے برابر ہے۔ یہ حیاتین لیموں، مالٹا، ٹماٹر، سبز مرچ، سٹرابیری، امرود، پپیتا وغیرہ میں ملتا ہے۔

دبلا کرنے والے پکائی کے طریقے

فربہ مرد یا عورت دبلا ہونا چاہے تو وہ سب سے پہلے ہوٹل بازی ترک کر کے گھر کے کھانے استعمال کرنے لگے۔ دراصل ہوٹلوں میں عموماً الم غلم کھانے ملتے ہیں اور انسان کا دل انھی کو دیکھ کر للچاتا ہے۔ جب کہ گھر میں اہل خانہ مفید صحت بخش غذائیں پکواتے ہیں لہٰذا وہ موٹاپے بھگانے میں کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

دوسرے کھانا پکانے کا طریقہ کار بھی انسانی صحت خراب یا ٹھیک کر سکتا ہے۔ ذیل میں پکائی کے ایسے طریقے درج ہیں جو ہمیں صحت بخش کھانے فراہم کرتے ہیں۔

بھوننا (Roasting)

جب اوون یا تندور کے اندر غذا پکائی جائے، تو یہ عمل بھوننا یا روسٹنگ کہلاتا ہے۔ اس طریقے سے مچھلی، گوشت، روٹی حتیٰ کہ سبزیاں بھی پکائی جا سکتی ہیں۔ طریقہ کار یہ ہے کہ اوون گرم کیجیے اور پھر اندرونی درجہ حرارت مطلوبہ ٹمپریچر تک لے جائیے۔ پھر اوون میں رکھے جانے والے برتن میں غذا رکھیے اور مطلوبہ وقت تک پکائیے۔

بریاں کرنا (Broiling)

اس طریقہ کار میں غذا اوون کے اندر جلتی آگ کے نزدیک رکھ کر پکائی جاتی ہے۔ چونکہ غذا براہ راست آگ کی زد میں ہوتی ہے لہٰذا گوشت اور مچھلی عموماً چند منٹ میں پک جاتی ہیں۔

بریاں کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اوون جلا کر چھ سات منٹ اسے گرم کر لیں۔ بعد ازاں غذا ایسی طشتری یا برتن میں رکھیے جو شدید تپش برداشت کر سکے۔ پھر برتن آگ سے پانچ چھ انچ دور رکھ دیجیے۔ زیادہ موٹا گوشت یا کوئی اور غذا اس طریقے سے نہیں پکانی چاہیے۔

گوشت یا مچھلی کی موٹائی کے حساب سے غذا 5 تا ۱۰ منٹ کے عرصے میں پلٹتے رہیے یا جب آگ کے قریب موجود غذا سنہری گندمی ہو جائے تو اسے پلٹ دیجیے۔ دوسری سمت بھی اتنے ہی عرصے تک پکائیے۔

تیزی سے تلنا (Sauteing)

پکائی کے اس طریق کار میں عموماً سبزی یا گوشت کڑھائی میں تھوڑا سا تیل ڈال کر تیزی سے پکایا جاتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ پہلے درمیانی شدت کی آگ پر خالی کڑاہی رکھیے تا کہ وہ گرم ہو جائے۔ جب کڑاہی یا کسی گہرے برتن کا پیندا تپنے لگے تو اس میں بس اتنا تیل ڈالیے کہ وہ گیلا ہو جائے۔ پھر کچھ دیر ٹھہریے تا کہ تیل بھی گرم ہو جائے۔ بعد ازاں غذا ڈال دیجیے پھر غذا کو چمچ سے ہلاتے رہیے تا کہ وہ پیندے سے نہ لگے اور وہ اچھی طرح پک جائے۔

بھاپ سے پکانا (Steaming)

غذا کی غذائیت (Nutreients) برقرار رکھنے اور اسے کراری (Crispy) بنانے کا یہ طریق کار بہترین ہے۔ واضح رہے کوئی بھی غذا اگر پانی میں ابالی جائے تو اس کی بیشتر غذائیت ضائع ہو جاتی ہے۔

بھاپ میں غذا پکانے کے لیے پہلے صاف ستھری سبزی یا گوشت کاٹ لیجیے۔ بہتر ہے کہ غذا یکساں حصوں میں کاٹی جائے تا کہ پکائی بھی یکساں ہو۔ بعد ازاں ایک بڑے سے برتن میں دو انچ گہرا پانی بھریے اور اسے چولہے پر رکھ دیں۔ جب پانی ابلنے لگے تو برتن میں بھاپ جمع کرنے والی ٹوکری رکھیے۔ غذا بھی اندر رکھیے اور پھر انھیں ڈھانپ دیجیے۔

غذا کو اتنی دیر بھاپ میں رکھیے کہ وہ مطلوبہ حد تک پک جائے۔ جب پکائی مکمل ہو تو احتیاط سے ڈھکن کو اٹھائیے کیونکہ بھاپ آپ کا ہاتھ و بازو جلا سکتی ہے۔ غذا پک چکے تو بہتر ہے کہ اسے جلد تناول کر لیا جائے۔ ■

باہر کھانے کا چسکا

ماہرین کا کہنا ہے کہ "جنک فوڈ" یعنی برگر اور تیل بھری اسی قسم کی اشیا کھانے سے پوری دنیا میں لوگ موٹاپے، ذیابیطس اور امراض قلب کا شکار ہو رہے ہیں۔ اب ایک اور خطرہ سامنے آیا ہے اور وہ ہے "ریستوران"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ریستورانوں میں بھی زیادہ تر کھانے چکنائی، نمک اور چینی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اسی لیے ماہرین اب مشورہ دیتے ہیں کہ ہفتے میں صرف ایک بار ریستوران کا کھانا کھائیے۔ نیز تب بھی صحت مند غذاؤں کا انتخاب کیجیے مثلاً سبزی، سلاد اور ایسے کھانے جو تیل میں تلے ہوئے نہ ہوں۔

[illegible]

ذیابیطس

کا آنکھوں پہ حملہ

10 سال کے اندر ہونے والے لازمی حملے سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

امِ فریحہ

بڑھاپے میں نظر کی حفاظت

انسان جب بوڑھا ہونے لگے تو اس کے جسمانی اعضا کمزور ہو جاتے ہیں۔ اہم ترین اعضا میں ہماری آنکھیں بھی شامل ہیں۔ ماہرین امراض چشم کی رو سے بڑھاپا سب سے پہلے پردہ بصارت (Retina) پر اثر انداز ہوتا ہے۔

پردہ بصارت آنکھوں کے ڈھیلوں کی پشت پر موجود ایک جھلی ہے۔ اس جھلی میں ہی روشنی کے حساس خلیے ہمیں نظر آنے والا منظر پیدا کرتے ہیں۔ یہ منظر پھر کیمیائی اور برقی پیغام بن کر بصری نس (Optic nerve) کے ذریعے دماغ میں پہنچتا ہے۔ یوں ہم منظر دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

بڑھاپے میں عموماً ذیابیطس بھی حملہ کرتا ہے۔ اگر یہ قابو سے باہر ہو جائے، تو آنکھوں کی ایک بیماری "ذیابیطس شبکیہ مرض" (Diasetic retinopathy) جنم دیتا ہے۔ اس بیماری میں عصبی نس اور پردہ بصارت پر خون کی نئی غیر معمولی رگیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

خون کی یہ ابنارمل رگیں اکثر پھٹ کر آنکھوں میں خون پھیلا دیتی ہیں، تاہم یہ درد پیدا نہیں کرتیں۔ جو بوڑھے 10 سال یا زیادہ عرصہ ذیابیطس کا شکار رہیں، ان میں ذیابیطس شبکیہ مرض کی کوئی نہ کوئی صورت جنم لیتی ہے۔

اس مرض کے ابتدائی مرحلے، پس منظر شبکیہ مرض (Background retinopathy) میں نظر معمول کے مطابق رہتی ہے۔ تاہم مرض کی شدید حالت، کثیرزا ذیابیطسی (Proliferative Diabetic) شبکیہ مرض اچانک حملہ کرتی ہے..... اگر بروقت علاج نہ ہو تو انسان اندھا بھی ہو سکتا ہے۔

ماہر امراض چشم ڈاکٹر کامران زاہد کا کہنا ہے "اگر

یہ مرض جلد دریافت ہو جائے تو سرجری یا لیزر کے مروجہ علاجی طریقوں سے اس پر قابو پانا آسان ہے۔" تاہم یہ مرض اس لحاظ سے خطرناک ہے کہ یہ بہت جلد اور تیزی سے مریض کو دبوچتا ہے۔ حتیٰ کہ نظر دھندلا جاتی ہے۔ چنانچہ اس مرض پر قابو پانے کا گر یہ ہے کہ اسے جلد شناخت کر لیا جائے۔

بیش تناؤ یا ہائپرٹینشن بھی متوسط عمر سے مرد و زن کو عموماً چمٹ جاتا ہے۔ یہ بیماری بھی پردہ بصارت کو نقصان پہنچاتی اور "بیش تنشی" (Hypertension) قلبیہ مرض پیدا کرتی ہے۔ اس بیماری میں بھی خون کی ابنارمل حسیں جنم لیتی اور اکثر پردہ بصارت یا عصبی نس سوج جاتی ہیں۔ کبھی کبھی پردہ بصارت کی شریانوں میں خون کی فراہمی نہیں ہو پاتی۔ ایسی صورت میں بصارت ختم ہو سکتی ہے۔ اس مرض کا علاج بیش تناؤ دور کر کے کیا جاتا ہے۔ نیز شریانیں بند ہوں، تو بذریعہ سرجری یا لیزر ان کا علاج ہوتا ہے۔

بڑھتی عمر کے باعث ایک بیماری "جھبڑک اور روشنیاں" (Flashes & Floaters) بھی انسان کو نشانہ بناتی ہے۔ اس مرض میں دیکھتے ہوئے متحرک دھبے سامنے آ جاتے اور منظر میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ مرض بصارت کو نقصان نہیں پہنچاتا لیکن یہ ایک خطرناک بیماری، شبکیاتی علیحدگی (Retina Detachment) کی ابتدائی علامت ہو سکتی ہے۔ اس بیماری میں پردہ بصارت پر شگاف پڑتا ہے کہ آنکھ کا محلول اسے ڈھیلے سے جدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہ عمل جب مکمل ہو جائے، تو انسان کی بینائی جاتی رہتی ہے۔

اگر شبکیاتی علیحدگی چمٹ جائے یا پردہ بصارت جھبڑک پڑے تو سرجری یا لیزر طریقہ علاج کے ذریعے صحت یابی ملنا ممکن ہے۔ بعض اوقات ایک سے زیادہ آپریشن بھی ہوتا ہے تا کہ خرابی مکمل طور پر کافور ہو جائے۔ اس بیماری کا بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ نظر کمزور کر دیتی ہے۔ چنانچہ بڑھتے مرد و زن کو چاہیے کہ وقتاً فوقتاً اپنی آنکھوں کا معائنہ کراتے رہیں۔

50 برس سے بڑے خواتین و حضرات میں بیماری کا ایک خلل "منسلک بہ جلدی انحطاط (ge related macular degenration)" بھی ہے۔ اگر مریض سگریٹ نوشی کرتا اور موٹا ہے، وہ امراض قلب میں مبتلا ہے، تو یہ مرض چمٹ چمٹنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی علامات میں نظر دھندلا جانا اور انکاز (قوس) میں خرابی شامل ہیں۔

اس بیماری میں ڈھیلے کی جلد سوج جاتی ہے اور خون بھی رستا ہے۔ ماہرین امراض چشم ایک ٹیسٹ "فلوریسین انجیوگرافی" (luorescien Angiography) کے ذریعے یہ بیماری دریافت کرتے ہیں۔ بطور علاج آپریشن ہوتا ہے تاہم ادویہ بھی دستیاب ہیں جو آنکھوں میں ڈالی جاتی ہیں تا کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔

اس مرض میں مبتلا مرد و زن کو چاہیے کہ وہ سگریٹ نوشی فوراً بند، نیز سمارٹ ہونے کی کوشش کریں۔ بعض ڈاکٹر وٹامن کھلاتے ہیں تا کہ بیماری جلد کافور ہو جائے۔ مزید برآں مریض کو چاہیے کہ وہ ایسی سبزیاں کھائے جو مفید ثابت ہوتی ہیں۔

آخر میں یاد رکھیے، سال میں ایک مرتبہ آنکھوں کا طبی معائنہ ضرور کرائیے۔ بینائی قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ اسے کھو کر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ اس کی حفاظت آپ کا فرض ہے۔

چہل قدمی

روزانہ 30 منٹ کی سیر 25 بیماریوں سے بچا لیتی ہے۔

عنیا حالب

ماہرین نے گزشتہ 4 برس میں 40 تحقیقات کا جائزہ لے کر انکشاف کیا ہے کہ اگر انسان روزانہ صرف 30 منٹ پیدل چلے، تو 25 مختلف بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ راز یہ ہے کہ آپ جتنا زیادہ چلیں گے، اتنا ہی زیادہ فائدہ ہو گا۔ چلنے کے نمایاں فوائد یہ ہیں:

وزن میں کمی: اگر 60 کلو وزن والا آدمی یا عورت روزانہ آدھ گھنٹہ تیزی سے چلے، تو اس کے 150 حرارے جلیں گے۔ یوں یہ عمل بھی اسے فربہ نہیں ہونے دے گا۔

آنتوں کے سرطان سے تحفظ: سرطان (کینسر) کی جدید تحقیق کرنے والے برطانوی رسالے، برٹش جرنل آف کینسر میں یہ تحقیق شائع ہوئی ہے کہ جو مرد و زن باقاعدگی سے پیدل چلیں اور ورزش کریں، ان کی آنتوں یا معدے میں ایسے کیڑے جنم نہیں لیتے جو بعد ازاں سرطانی گٹھلیوں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

امراض قلب میں کمی: ماہرین کا کہنا ہے کہ امراض قلب کی بیشتر اقسام غیر متحرک رہنے سے جنم لیتی ہیں۔ چنانچہ چہل قدمی دل کی بیماریاں دور رکھتی ہیں۔

ازدواجی زندگی میں فائدہ: عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مردوں میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن آدمی جسمانی طور پر مستعد رہے تو وہ بڑھاپے میں بھی اپنی طاقت خاصی حد تک بحال رکھتا ہے۔

ہڈیوں کی مضبوطی: چلنے سے ہڈیوں کی ورزش ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ خصوصاً خواتین ہڈیوں کی بوسیدگی (اوسٹیوپوروسیز) مرض کا نشانہ نہیں بنتیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہڈیاں مضبوط کرنے کی خاطر ہفتے میں 180 منٹ چلنا کافی ہے۔

بھلکڑپن کی دوری: بڑھاپے میں یادداشت جاتے رہنا ایک عام خلل ہے۔ ماہرین نے تحقیق سے دریافت کیا ہے کہ جو بوڑھے مرد و زن روزانہ کم از کم 1.6 کلومیٹر پیدل چلیں، ان کی یادداشت اچھی رہتی ہے۔ دراصل چلنے سے ہمارے دماغ کا حرام مغز بڑھتا ہے، یوں یادداشت کو ضعف نہیں پہنچتا۔

طاقتور مامون نظام: چہل قدمی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ ہمارے مامونی نظام (Immune System) کو تقویت دیتی ہے۔ چنانچہ انسان خصوصاً موسمی بیماریوں مثلاً نزلہ، زکام، کھانسی وغیرہ میں جلد مبتلا نہیں ہوتا۔

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟

بعد از آزادی لاہور کے پہلے دس سال، ان زمانوں کو اب کون لوٹا سکے گا!

ڈاکٹر اسد اریب

پاکستان بن جانے کے بعد پہلے تین چار برس لاہور ہی کا کیا، اس خطۂ زمین کا عالم ہی کچھ جدا تھا، جسے اب ڈھونڈنے سے لاکھوں کہیں مل نہ پائے۔ مروت اور محبت عام تھی، ہر چہرہ ایک دوسرے کا آشنا لگتا تھا، نہ کسی کو لٹنے کا خوف تھا، نہ سر جانے کا دھڑکا، نہ سرِعام کسی کا بال بیکا ہوتا۔ کوئی خبر قتل کی، کوئی اطلاع چوری کی کہیں نہ تھی۔ مختلف نسلوں، عقیدوں، تہذیبوں کے لوگ اس طرح باہم دگر تھے کہ گندہ انجمن گوالمنڈی لاہور کے قریب وشنو اسٹریٹ کے ایک متروکہ مکان میں جالندھر کے چوہدری غلام نبی انسپکٹر پولیس کے الاٹ شدہ دو کمرے ایسے تھے کہ ہمارے صحن کو عبور کر کے وہ اپنے کمروں تک رسائی پاتے، ان کے خاندان کے مرد اپنے کمروں کی طرف جانے سے پہلے کھنکارتے، اتنے میں ہماری مستورات سنبھل جاتیں اور وہ سر جھکائے سلام کہتے آگے بڑھ جاتے۔ سید ضمیر جعفری اردو کے صاحب طرز مزاح نگار نے کچھ ایسے ہی ایک منقسم اور مشترک رہائشی گھر کا منظر دیکھ کر کہا ہوگا۔

ے دیکھا اگر اُدھر تو بہانا مری طرف
کھلتا تھا ان کے غسل کا خانہ مری طرف

ہمارے اس گھر کا بھی یہی عالم تھا۔ صحن مشترک، دروازہ مشترک، غسل خانہ ایسا مشترک کہ آدھا ان کی

طرف کھلتا تھا اور آدھا ہماری طرف۔ ہمارے دھوون کا پانی ان کی نالی سے گزر کر باہر گلی میں جا نکلتا تھا۔

یہ کہانی ہے اس وقت کی جب آزادی کے پھل کا رس لاہور کے در و دیوار سے ٹپکا پڑتا تھا۔ گلی کوچے لاشرقیہ لاغربیہ کا منظر نامہ لگتے تھے۔ گرمیوں کی حبس اور برسات کی امس جب جی جلاتی تو ان مکانوں کے مکین سرد گلیوں میں چارپائیاں بچھا کر ایک دوسرے کے سرہانے سے سرہانا اور پائنتی سے پائنتی ملائے آ لیٹتے اور صبح منہ اندھیرے اپنے اپنے دروازوں سے اندر ہو لیتے۔ نہ لڑتے، نہ جھگڑتے، نہ خوف کھاتے، نہ خوف دلاتے۔ مفاہمت، دستگیری، تعاون، برداشت اور ایثار کی وہ وہ مثالیں دیکھنے کو ملتیں شاید کہ انصار و مہاجرین مدینے کے جن کو بھی دیکھا کیے تھے۔ یہ خالص ش، ق والی اردو کے گنگا جمنی لوگ، انبالے اور لدھیانے والی آدھی پنجابی آدھی اردو کے لب و لہجے والے اور امرتسر کی اصل پنجابی بولنے والے، یہ سب سنی، شیعہ، یہ پٹھان، یہ مغل، یہ جاٹ، یہ سید، یہ شیخ، صرف اور صرف مسلمان بن کر جی رہے تھے۔ پاکستان نے انھیں اپنے سینے پہ سلانے کے لیے بلایا تھا۔ جی چاہتا ہے سب وہ مناظر، یہاں کھول کے رکھ دوں۔ تاریخ کے اوراق پر بکھرے ہوئے ہر ہر چپے پر روح آزادی کی سرسراہٹ ہر شخص کو قریب رگ جاں محسوس ہو۔ اے کاش! ہم پھر پہلے جیسے ہی ہو جائیں۔

52ء میں الاٹمنٹ کے محکمہ میں کچھ اصلاحات ہوئیں، لاہور کا ایک بڑا دفتر محکمہ آبادکاری کا گوالمنڈی میں اس جگہ تھا جس پر حکیم جمال سویدا دہلوی کا حکمت خانہ اور امتیاز علی تاج کے والد سید ممتاز علی کا دارالاشاعت تھا۔ چوک گوالمنڈی سے برف خانے کی طرف جانے والی یہ سڑک اب ویسی جنگلی چوڑی اور پرشکوہ تو نہیں رہی مگر ان دنوں مشرقی پنجاب اور یوپی، سی پی، بہار کے مہاجرین کی چہل پہل سے ایسی آباد تھی، جیسی اب شاید شاہ عالمی بھی نہ ہو۔ لٹے پٹے مہاجرین کو اس وقت جو کام سامنے آتا کرنا پڑتا، مستورات الاٹمنٹ کے دفتروں کا چکر لگاتیں، مرد روزگار کی طرف جاتے، بچے مدرسوں کا رخ کرتے، میری بڑی پھوپھی جو ہمارے خاندان میں سب سے پہلے پاکستان آئیں نیاز بیگ کے ایک زنانہ اسکول میں بطور ٹیچر ملازم ہوگئیں، الاٹمنٹ ان کے نام تھا۔ ایک دن ایک ہرکارہ آبادکاری کے دفتر کا آیا، انھیں دفتر بلایا اور بتلایا گیا کہ اب وہ وشنو گلی والے مکان سے ذرا بہتر (علیحدگی کے ساتھ) دوسرے مکان کی لائق ہوں گی۔ یہ بہتر مکان کیا بہتر تھا بس یونہی کوئی ٹھکانہ داؤ پیچ تھا لیکن یہ مکان بہتر ہو یا نہ ہو، اس کا اڑوس پڑوس ضرور بہتر تھا۔ چند مکان اوپر گلی میں جہاں آغا بشیر احمد قوال امرتسری کا بورڈ لگا ہوا کبھی ہم پڑھتے، نصف تصرف والا یہ مکان اب ہمارا بھی تھا۔ آغا جن کی آواز ریڈیو پاکستان سے ہم صرف سنا کرتے، اب ہم صبح و شام انھیں دیکھا بھی کرتے۔ اب وہ مرحوم ہوگئے۔ پیارے چہرے، خوبصورت، خوش وضع انسان تھے۔ وہ اور ان کے ہم نوا گھر پر کبھی ریاض کرتے تو ہمیں بھی بلا لیتے۔ اس مکان کے نیچے سعید امرتسری کلچے والے کا تندور تھا، ایک آنے کا ایسا عمدہ کلچہ لگاتا کہ گھر لاتے لاتے راستے میں کھا جانے کو جی چاہے۔ تندور سے جب وہ سرخی مائل بھلبھری چہرے والا کلچہ تندور سے باہر آتا، سعید پارہ اس پر چھینٹا دے کر سفید تلوں کی بوچھاڑ کرتا ہم اوپر اپنے گھر ہی میں بیٹھے بیٹھے لذت احساس کے طفیل بغیر کوئی اجرت دیے ایسے کوئی دو چار کلچے تو ہر روز ضرور ہی کھایا کرتے۔

آزادی کے بعد لاہور میں پہلے آٹھ دس برس

محبت، بھائی چارے، وفاداری، خاطر ایمان، اخلاص اور اخوت کے وہ سنہری ورق ہیں، جس کا دیکھنا اب محض ایک خواب سا ہوا جاتا ہے۔ اس ریلوے اسٹیشن سے جس کی پیشانی پہ انھی دنوں وحدت اسلامی کا مظہر کلمہ لکھا گیا، جو بھی اترتا جس کا جہاں جی لگ سا جاتا چلا جاتا، نہ کوئی روکتا نہ ٹوکتا۔ محض کوئی دور پار کا سابق وطن، محلے، عقیدے، کاروبار، تعلیمی ہم نشینی، ہم زبانی کا معمولی سا تعلق بھی ڈھونڈ پاتا، وہ چولا بنا کر وہاں جا نکلتا اور کچھ دن بعد کوئی نہ کوئی ٹھکانا سر چھپانے کا تلاش ہی کر لیتا۔ یہ جس وشنو اسٹریٹ کا ذکر رہا ہوں، وہ دیال سنگھ کالج کے ساتھ ساتھ بہنے والے گندے نالے، کچا نسبت روڈ پر، راجہ رام موہن رائے ہوسٹل کی عقبی کھڑکیوں کے سامنے تھی۔ اور دیال سنگھ لائبریری کی عالی شان عمارت سے آ کر لگ کھڑی ہوئی تھی۔ اللہ اللہ کیا کیا لوگ اس میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ایک لاہور مسلم اسکالر علامہ حافظ کفایت حسین کا گھر بھی اس گلی سے متصل ایک اونچے صحن والے میدان میں تھا۔ حافظ صاحب قبلہ کو سامنے شریف ڈیوڑھے جو کبھی اس گلی کے موڑ پہ تھا، سبزی کی ایک پوٹلی اٹھائے خریداری کے بعد اپنے گھر کی طرف جاتے دیکھا بہت عظیم المرتبت عالم تھے، سر پر سفید کپڑے کی معمولی لپیٹ کا ایک صافہ سا باندھتے، کوئی ایک بڑے چوڑے پائنچے والا پاجامہ پہنتے، سادہ سی معمولی ترکی کی گرگابی پاؤں میں ہوتی، ہم ان گلیوں میں انھیں اکثر دیکھا کرتے۔ اس گلی کے بالکل اوپر حکیم عثمانی کا گھر تھا جو ذرا ہٹ کر احمد ندیم قاسمی رہتے تھے۔ خالد بٹ جو آج امریکا کے ایک نامور سرجن ہیں جو میرے اور ایس ایم اسمٰعیل کے مشترک دوست تھے، یہیں رہتے تھے۔ یہ جن دوست ایس ایم اسمٰعیل کا میں نے نام لیا یہ بعد میں اسلام آباد کے ڈپٹی کمشنر رہے، مامون الرشید (وائس آف امریکا کی اردو سروس والے) میں (اسد اریب)، اسمٰعیل اور خالد بٹ انھی گلیوں میں کھڑے ہو کر اپنے شاندار مستقبل کے خواب تقریباً ہر روز ہی دیکھا کرتے۔

لاہور نے کس کس کو پروان چڑھایا؟ خاص طور پر انھیں جو بالکل بے سروسامانی میں یہاں آئے، انھیں آگے بڑھنے کی ہمت دلائی۔ سستا زمانہ، اچھے لوگ، پُرسکون مسجدیں، دردمندی کی دنیا، محفوظ گلی کوچے، گویا یہ شہر ایک سراپا رحمت تھا۔

ان گلیوں میں کون کون آباد تھا، کیسے لوگ یہاں سے گزر کر نکلے کسے کیا معلوم تھا۔ یہ ملک ان کی تقدیر کا ستارہ کس کس طرح روشن رکھے گا، دیال سنگھ کالج کے نالے کے سامنے اوپر آنے والی گلیوں میں کیا کیا لوگ تھے، مسجد نور سے متصل ایک خوش نما مکان تھا۔ یہاں سے ہر روز صبح ایک پُروقار شکیل، خوش وضع لڑکی اپنی بیساکھیوں کے سہارے اترتی، اسے پولیو کے آزار نے بھی بے ہمت نہ ہونے دیا، وہ انسٹھ، ساٹھ کی دہائی میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں میری ہم جماعت بنی، یونیورسٹی اورینٹل کالج کی سیڑھیاں کس جرأت و ہمت سے طے کر کے اوپر کلاس روم تک پہنچتی یہ منظر ایسا ہمت افزا ہوتا کہ بڑے بڑے جی داروں کو رشک آ جائے۔ شبنم شکیل بھی یہ منظر نہ بھولی ہوں گی کہ یاسمین کے ساتھ شانہ بشانہ انھی سیڑھیوں پر چڑھ کر وہ بھی اپنی اس ہم جماعت کے ساتھ کبھی کبھی کلاس روم تک آیا کرتیں۔ یہی باہمت خاتون اردو اور پنجابی کے مشہور اہل قلم، ایک سینئر بیوروکریٹ سے بیاہی گئیں اور یاسمین شیخ کہلائیں۔ جہاں بھی ہوں خدا انھیں خوش رکھے۔ نالے کے ساتھ ساتھ آنے والی سڑک جو بڑی نسبت روڈ سے آ ملتی ہے۔ اس راستے سے گزرتے

ہوئے وہ نمایاں لوگ تو اس دور کے ہر شخص کو یاد ہوں گے۔ ایک ان میں روہیلہ پٹھانوں کی بھرپور وجاہت لیے، ہاتھ میں تھیلا لٹکائے دراز قد بھری بھری مونچھوں والے خان صاحب ہاتھ میں ایک بڑی موٹھ کا ڈنڈا پکڑے، چوڑے پائنچے کا پاجامہ پہنے نہایت تمکنت کے ساتھ یہاں سے گزرتے تو محلے کے کم سن بچے ہیبت کے سبب ایک طرف ہوجاتے۔ یہ خان صاحب قبلہ ہمارے نامور استاد، اردو کے نقاد، عبادت (یار خاں) بریلوی کے والد محترم تھے۔

ایک اور صاحب جنھیں پاکستان کی دنیائے خطابت نے مسند اقتدار کا ہم نشین بنایا وہ بھی انھی گلیوں کی خاک پیروں سے مس کرتے ہوئے جایا کرتے۔ لکھنؤ کے خاندان اجتہاد کے فرزند تھے ویسی ہی عبا قبا پہنے، کالا عمامہ سر پر کسے رہتے۔ رٹز سینما کے قریب اچھے پرلیس ان کی منزل نشست ہوا کرتی، دیکھنے والوں کو اس نئے خلیے کا یہ شخص عجیب سا معلوم ہوتا۔ کم و بیش روزانہ ہی یہ منظر علم ہمارے سامنے سے گزرتا کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ شخص زمانہ آئندہ کا ایک نامور خوش بیان، خطیب، نصیر الاجتہادی ہوگا۔

آغا بشیر احمد قوال امرتسری والے مکان میں ہمیں آئے ہوئے کوئی ایک ماہ ہی گزرا تھا۔ انسپکٹر بحالیات (مسٹر میکسول) ہمارے سامنے والے مکان کی پڑتال کے لیے آئے، وہ مکان الاٹ ہوا تھا امرتسر کے ایک معروف اہل قلم شہزادہ نعمت اللہ جان امرتسری کو۔ جو ایک کشمیری عالم تھے، ان کے گھر والوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی دھلی دھلائی آسمانی مخلوق آسمان سے زمین پر ابھی ابھی اتر آئی ہو۔ مسٹر میکسول نے شہزادہ صاحب والی گلی سے نیچے آتے ہوئے ہماری خیر خیریت بھی پوچھی۔

مسٹر میکسول انسپکٹر بحالیات بداؤں یوپی سے آئے ہوئے ایک عیسائی مہاجر تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم کے وقت پاکستان کو اوپٹ کیا اور لاہور چلے آئے۔ پاکستان کی نئی نسل کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان بنانے میں صرف مسلمان ووٹ ہی نہیں مسٹر میکسول جیسے کچھ ایسے عیسائیوں کے ووٹ بھی شامل ہیں، جنھوں نے ہندوستان کی برطانوی حکومت سے پاکستان میں رہنے اور وہاں کی حکومت میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مسٹر میکسول نے مہاجرین کی آبادکاری میں دل و جان سے خدمت کی 1955ء تک۔ اس محلے میں ان کا ہونا، مجھے معلوم رہا۔ پھر اللہ جانے کہاں گئے؟ معلوم نہ ہو سکا۔ 1955ء کا آخر تھا۔ قلعہ گجر سنگھ بازار کے ایکلسن روڈ والے دہانے پر بھی ایک ٹکڑا سبزہ زار ہوتا تھا۔ اس سبزہ زار کو ایک طرف ایکلسن روڈ چھوتی تھی اور دوسری طرف میکلوڈ روڈ اس کو چھوتے ہوئے گزرتی تھی۔ میکلوڈ روڈ پر سبزہ زار کی اس نکڑ کے سامنے جناح لائبریری تھی۔ یہ لاہور کی ایک یادگار شخصیت علامہ عقیل لاہوری کا مکان تھا، جسے انھوں نے جناح لائبریری کا نام دے رکھا تھا۔ ایک دن فرمانے لگے مسٹر میکسول نے جس طرح مہاجرین کی آبادکاری میں انتھک جدوجہد کی ہے کیا کسی سے ہو سکے گی؟ میں اس نام پر ایک مرتبہ چونکا بات آئی گئی ادھر ادھر ہو گئی۔

علامہ عقیل لاہوری: زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا! مرحوم ہو گئے، مگر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ مسکراتے، سولا ہیٹ پہنے، پینٹ قمیص زیب تن کیے کندھے سے کمر تک لٹکی ہوئی آڑی بیلٹ میں ویبلے کا پستول لگائے، کبھی کبھی مجھے اب بھی میری یادوں کی نظر آجاتے ہیں۔

علامہ عقیل لاہوری، لاہور میں رہتے ہوئے

لاہوری کہلائے تھے۔ ان کا کہنا تھا وہ اصلی لاہوری ہیں۔ ان کے اجداد افغانستان یا ہرات سے عہد محمود غزنوی میں یہاں آئے تھے ان کا علامہ ہونا، شاید منبر نشینی کے سبب تھا کہ وہ ذاکر حسین بھی تھے۔ ان کے لائبریری ہال میں جو مشاعرے ہوتے، اس کے شرکاء میں سیف زلفی، قمر صدیقی، نصرت قریشی، بیدل حیدری، ہارون رشید ارشد (مامون الرشید، وائس آف امریکا والے، کے والد گرامی) بیضا خاں سروقی ایرانی، شفق بریلوی، ثاقب زیدی، حشمت آرا حجاب وغیرہ اسمائے گرامی میرے ذہن میں اب تک محفوظ چلے آتے ہیں۔

میکلوڈ روڈ اس وقت تک ادب کے حوالے سے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اس پر چٹان کا دفتر تھا، رتن پارک کی فلمی دنیا آباد تھی، لکشمی بلڈنگ پر سردار عبدالرب نشتر گاہے گاہے مسلم لیگ کے دفتر میں آبیٹھا کرتے۔ آگے ریلوے اسٹیشن کی طرف آتے ہوئے لاہور ہوٹل کے بالکل آگے سڑک کی طوالت کے ساتھ ساتھ اخبار فروشوں کی بساطیں بچھی ہوتیں۔ اخبار ایسے رخ پر رکھے ہوتے کہ صرف سرخیاں پڑھی جا سکیں، صبح کے وقت سیکڑوں لوگ سرخیوں پر ایک نگاہ غلط ڈالتے ہوئے اپنے اپنے اطراف نکل جاتے۔ ان دنوں نوائے وقت، آفاق، پاکستان ٹائمز، امروز اور زمیندار کا دور دورہ تھا۔

"زمیندار" سے مجھے یاد آیا، 1953ء کی بات ہے مرزا ابراہیم مزدور لیڈر تھے۔ اس وقت ریلوے کی مزدور یونین پاکستان کی سب سے بڑی یونین تھی۔ بشیر صاحب واپڈا یونین والے تو اس وقت تک کسی خاص نام کے طور پر ابھرے نہ تھے۔ مزدوروں کی مملکت کے بے تاج بادشاہ مرزا محمد ابراہیم کو سمجھا جاتا تھا۔ ایک دن ایمپریس روڈ مسلم لیگ ہائی اسکول سے ہم نویں آٹھویں جماعت کے طالب علم حسب معمول ٹولیوں کی شکل میں نولکھا چوک سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جاتے تھے کہ راہ میں ریلوے مزدور یونین کا جلوس "زمیندار" کے دفتر کی طرف جا رہا تھا، ہم بھی شریک ہوئے۔ مجھے اپنے ان مسلم لیگرز میں منیر (اسکرین کی دنیا کا چاچا ٹائم پیس، منور ظریف کا بھائی) رشید جو بعد میں میڈیکل اسٹور ایسوسی ایشن لوہاری دروازے کے صدر بھی رہے، وزیر بھٹی قلعہ گوجر سنگھ کے سماجی رہنما ہوئے، فیصل تحسین سیمن جو ملتان ڈویژن کے کمشنر بنے، یہ سب ہم دوست ہاہو کرتے غل غپاڑہ مچاتے نولکھا چرچ کے پیچھے سے دفتر "زمیندار" جا پہنچے۔ یہ جو ریلوے گراؤنڈ اور پولیس اسٹیشن سے متصل میکلوڈ روڈ پر ایک تاریخ ساز عمارت تھی۔ ہماری سیاسی اور صحافتی تاریخ کا المیہ دیکھیے بعد میں ہماری کم نصیبی سے زمیندار ہوٹل بن گئی۔ میں ملتان میں ہوں، اب وہ کیا ہے مجھے معلوم نہیں۔ اخبار زمیندار کے دفتر اس جلوس کے پہنچنے کا حال لکھ رہا تھا۔ ہم سب دوست جلوس کے پچھلے حصے میں تھے، وہاں پہنچے تو دیکھا سڑک کی طرف نکلی ہوئی شہ نشین پر مولانا ظفر علی خاں، جناح کیپ لگائے شیروانی پہنے تشریف فرما ہیں۔ بہت ضعیفی کا عالم تھا۔ زیادہ متحرک نہ تھے ضعف کے سبب صرف اس قابل تھے کہ مجمع کو اپنا چہرہ دکھا سکیں، کچھ بول نہ پائے، پندرہ بیس منٹ تک محض صورت تصویر بنے بیٹھے رہے۔ مرزا ابراہیم تقریر کرتے جاتے اور مولانا تھوڑی تھوڑی جنبش سر سے کبھی کبھی انھیں دیکھ بھی لیا کرتے۔ یہ تصویر عبرت اس شخص کی تھی جس نے اپنی شعلہ بیانیوں اور اپنے آتش خیز اداریوں سے برطانوی پائے اقتدار کی چولیں ہلا رکھی تھیں۔

ایسے لوگ کدھر گئے؟ ان زمانوں کو اب کون لوٹا سکے گا؟ وہ شب و روز وہ ماہ و سال کہاں؟

■■■

۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء فرینکلن ڈیلانو روز ویلٹ (امریکا کا بتیسواں صدر)
۱۲ اپریل ۱۹۸۰ء زبیدہ خاتون (معروف افسانہ نگار)
۱۲ اپریل ۲۰۰۸ء زکی شان ساحل (مشہور شاعر)
۱۲ اپریل ۲۰۰۵ء مقبول جلیس (معروف صحافی)
۱۳ اپریل ۱۹۸۷ء میاں محمود علی قصوری (نامور ماہر قانون و سیاستدان)
۱۳ اپریل ۱۹۸۷ء اکرم پہلوان (بھولو پہلوان کے بھائی)
۱۳ اپریل ۲۰۰۱ء انجم رومانی (معروف شاعر)
۱۴ اپریل ۱۸۶۵ء ابراہام لنکن (معروف امریکی صدر)
۱۴ اپریل ۱۸۸۰ء مولانا قاسم نانوتوی (مشہور عالم دین)
۱۴ اپریل ۱۹۹۴ء ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی (نامور سائنس دان)
۱۵ اپریل ۱۹۰۳ء میر مہدی مجروح (مشہور شاعر)
۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء ممتاز شاہنواز (بیگم جہاں آرا شاہنواز کی صاحبزادی)
۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء منظر عالم (کراچی کے مسلم لیگی رہنما)
۱۶ اپریل ۱۸۵۰ء مادام میری تساؤ (لندن میں موم کے مجسموں کا عجائب گھر بنایا)
۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء علامہ آرزو لکھنوی (ممتاز اردو شاعر)
۱۶ اپریل ۱۹۹۰ء منصور قیصر (افسانہ نگار اور صحافی)
۱۷ اپریل ۱۹۰۷ء جناح پونجا (قائد اعظم کے والد محترم)
۱۷ اپریل ۱۹۰۲ء نواب فتح علی خان (ممتاز سیاستدان)
۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء آئن اسٹائن (عظیم سائنسدان)
۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی (ممتاز مرثیہ نگار)
۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء نشاط النساء بیگم (اہلیہ مولانا حسرت موہانی)
۱۸ اپریل ۱۹۸۸ء کلب علی خان فائق (ممتاز ادیب، محقق، نقاد)
۱۹ اپریل ۹۶۰ء ابوبکر احمد بن الحسین بیہقی (مشہور محدث، فقیہ)
۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء سید امتیاز علی تاج (اردو کے ممتاز ڈرامہ نگار)
۱۹ اپریل ۱۸۸۲ء چارلس ڈارون (مشہور سائنس دان)
۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء سید سبط حسن (اردو کے معروف صحافی، ادیب)
۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء شکیل بدایونی (نامور اردو شاعر)
۲۰ اپریل ۱۹۷۴ء فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (پاکستان کے سابق صدر)
۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء پروفیسر ابوبکر احمد حلیم (جامعہ کراچی کے پہلے وائس چانسلر)
۲۱ اپریل ۱۷۱۹ء فرخ سیر (مغل بادشاہ)
۲۱ اپریل ۱۹۱۰ء مارک ٹوین (مشہور امریکی مصنف، ادیب)
۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء علامہ محمد اقبال (شاعر مشرق، حکیم الامت)

۲۲ اپریل ۱۹۹۴ء رچرڈ نکسن (سابق امریکی صدر)
۲۲ اپریل ۱۹۹۰ء اشرف صبوحی (اردو کے صاحب طرز ادیب)
۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء حکیم فقیر محمد چشتی نظامی (نامور طبیب اور عالم)
۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء ولیم شیکسپیئر (انگریز شاعر اور ڈرامہ نگار)
۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء سروانتے (اسپین کے مشہور ادیب، شاعر، ڈراما نگار، ناول نگار)
۲۳ اپریل ۱۸۵۰ء ولیم ورڈزورتھ (مشہور انگریز شاعر)
۲۳ اپریل ۱۹۸۲ء عبدالجبار خان (سابق اسپیکر قومی اسمبلی)
۲۳ اپریل ۱۹۶۸ء بڑے غلام علی خان (نامور موسیقار)
۲۴ اپریل ۱۹۸۴ء مولانا محمد شفیع اوکاڑوی (نامور عالم دین، خطیب)
۲۴ اپریل ۱۹۸۷ء حسن طارق (نامور فلمی ہدایت کار)
۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء امیر امان اللہ خان (افغانستان کے بادشاہ)
۲۵ اپریل ۱۹۹۵ء جی ایم سید (مشہور سیاستدان)
۲۶ اپریل ۱۵۸۹ء تان سین (مشہور و نامور موسیقار)
۲۶ اپریل ۱۷۳۱ء ڈینیل ڈیفو (رابنسن کروسو کا خالق)
۲۷ اپریل ۱۹۶۲ء مولوی فضل الحق (شیر بنگال، قرارداد پاکستان پیش کی)
۲۷ اپریل ۷۹۸ء امام ابو یوسف (تاریخ اسلام کے پہلے چیف جسٹس)
۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء مرزا فرحت اللہ بیگ (اردو کے نامور مزاح نگار)
۲۷ اپریل ۱۹۴۲ء سر عبداللہ ہارون (نامور سیاستدان)
۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء آغا حشر کاشمیری (اردو کے نامور ڈراما نگار)
۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء شاہ فواد (مصر کا بادشاہ، شاہ فاروق کا والد)
۲۹ اپریل ۱۲۳۶ء التمش (ہندوستان میں خاندان غلاماں کا بادشاہ)
۲۹ اپریل ۱۹۷۶ء منور ظریف (پاکستان کے نامور مزاحیہ اداکار)
۳۰ اپریل ۱۹۹۲ء غلام فاروق (پاکستان کے مشہور بیوروکریٹ)
۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء سلطان محمود غزنوی (عظیم مسلمان سپہ سالار)
۳۰ اپریل ۱۹۱۲ء ولبر رائٹ (ہوائی جہاز کا موجد)
۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء [illegible]
۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء آغا بیدار بخت (اردو اور فارسی کے شاعر)

سقراط

ایک حرف بھی نہ لکھنے والا، اتنا بڑا فلسفی سمجھتا تھا کہ اسے کچھ بھی نہیں آتا

محمد سلیم الرحمٰن

کہا جاتا ہے کہ یونان کے فلسفی سقراط (469 ق م۔ 399 ق م) نے خود کبھی ایک حرف بھی نہیں لکھا لیکن اس کے لفظوں اور تعلیمات نے معاشرہ پر اتنے گہرے نقوش مرتب کیے کہ وہ یونانی ادب کے اہم ترین مشاہیر کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ٹھہرا۔ فلسفہ کی تاریخ میں تو ظاہر ہے اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر افلاطون اور زینوفون جیسے اہل قلم اس کی شخصیت کی عکاسی اور افکار کے انشراح کا بیڑا نہ اٹھاتے تو اس کے نام سے قدیم یونان کی تاریخ کے محققین کے سوا شاید ہی کوئی واقف ہوتا۔ اپنے اصولوں پر سر مٹنے والے تو بہت گزرے ہیں لیکن ہر کسی کو افلاطون جیسا صاحب اسلوب اور ارادت مند کہاں نصیب ہوتا ہے۔

سقراط کا باپ سنگ تراش اور ماں دایہ تھی۔ دونوں مل کر جو کماتے تھے وہ ان کی گزر بسر کے لیے کافی تھا۔ سقراط کو نوجوانی میں کبھی فکر معاش لاحق نہ ہوئی۔ اس نے متداول فلسفہ میں درک حاصل کیا۔ ابتدا میں اسے طبیعی فلسفہ سے لگاؤ تھا جو رفتہ رفتہ بالکل سرد پڑ گیا اور اس کے بجائے یہ معلوم کرنے کی چیٹک لگی کہ زندگی بسر کرنے کی وہ روش کون سی ہے جسے انسانوں کے لیے سب سے مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے۔

خاصی عمر کا ہو جانے کے بعد اس نے زین تھیپی نامی ایک عورت سے شادی کی۔ اس کا نام ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور جہیز میں کچھ نہ کچھ نقدی بھی لائی ہوگی۔ زین تھیپی کی بدمزاجی اور جھنجھل کے افسانے بہت مشہور ہیں۔ تند خوئی کے یہ قصے شاید روایتی ہوں کہ درویش منش لوگوں کی بیویوں کو عموماً تنکی دکھایا جاتا ہے۔ بہرحال، سقراط ایسا شوہر یقیناً نہیں ہوگا جس کے ساتھ نباہ کرنا آسان ہو۔ یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ زین تھیپی کو سقراط کی غیر دنیادارانہ مصروفیات کی وجہ سے تنگی ترشی سے گزارا کرنا پڑتا ہوگا اور اس طرح کی آئے دن کی جھکھٹ آدمی کو چڑچڑا بنانے کے لیے کافی تھی۔ سقراط نے اپنے آبائی پیشے پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ وہ اپنے نوجوان شاگردوں سے، جن میں بہت سے ایتھنز کے امیر کبیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، معاوضہ لینا تو درکنار ان کے پیش کیے ہوئے تحائف قبول کرنے سے بھی ہچکچاتا تھا۔ زین تھیپی سے اس کے تین لڑکے ہوئے

لیکن ان میں سے کوئی بھی نام پیدا نہ کر سکا۔

کیا چہرہ مہرہ اور کیا ڈیل ڈول، کسی طور سقراط کی کوئی کل سیدھی نہ تھی: بھونڈا سا چہرہ، پیپا چپٹی ناک، لبوترا سر، مینڈک کی طرح باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں، توند نکلی ہوئی، قد ٹھگنا۔ مگر تھا بڑا توانا۔ تھکنا تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔ برداشت کا مادہ بہت تھا۔ موسموں کے شدائد کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جاڑوں میں بھی ایک پھٹی پرانی چادر اوڑھے پھرتا رہتا۔ ایک فوجی مہم کے دوران ایک بار وہ برف پر ننگے پاؤں ہی چلتا رہا۔ اسے جب بھی فوجی خدمات کے لیے بلایا گیا اس نے انکار نہیں کیا اور لڑائیوں میں غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا۔

فوجی مہمات سے قطع نظر، سقراط نے کبھی اپنی مرضی سے ایتھنز سے باہر جانے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ اسے یہ علم بھی نہ تھا کہ شہر کے آس پاس کون کون سے قابل دید مقامات ہیں۔ اس کے پاس جو تھوڑی بہت جائیداد تھی وہ اس کی بھی ٹھیک طرح سے دیکھ بھال نہ کر سکا۔ بس وہ ایتھنز میں ادھر ادھر گھوم پھر کر لوگوں سے، اعلیٰ ادنیٰ کی تخصیص کے بغیر، ان کے عقائد اور اخلاقی تصورات کے بارے میں سوال جواب کرتا رہتا۔ بحث میں اس کے سامنے کسی کی پیش نہ چلتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی ماں کا پیشہ اپنا لیا ہے اور افکار جنانے کا کام انجام دیتا رہتا ہے۔

سقراط کی زندگی کا ایک تابناک پہلو یہ ہے کہ ان صبر آزما دنوں میں جب پیلوپونے سوی جنگ میں شکست کے بعد ایتھنز والوں پر جھنجھلاہٹ اور جنون طاری تھا اور انھوں نے اخلاقی اور سیاسی پستیوں کو چھو لیا تھا اس نے ہر بار، جان ہتھیلی پر رکھ کر، حق و انصاف ہی کا ساتھ دیا۔

سقراط پر بعض وقت جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ پہروں اس میں ڈوبا رہتا تھا۔ ۴۳۲ق م میں ایک مہم کے دوران وہ ایک صبح سے اگلی صبح تک ایک ہی بے حس و حرکت محویت کے عالم میں کھڑا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ کبھی کبھی ایک غیبی آواز اسے بعض کاموں سے رکنے کی تاکید کرتی ہے۔ موت کے بعد جزا و سزا کے تصورات عوام میں رائج تھے وہ انھیں مانتا تھا۔ وہ تناسخ کا بھی قائل تھا اور سمجھتا تھا کہ آدمی کو گزشتہ جنموں کی چھوٹی باتیں یاد آسکتی ہیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ روح جسم سے آزاد ہوئے بغیر مکمل پاکیزگی حاصل نہیں کر سکتی۔

ڈیلفی کے مشہور ہاتف کدے (معبد) میں ایک بار کسی نے استفسار کیا کہ آیا کوئی آدمی سقراط سے بڑھ کر دانش مند ہے۔ جواب ملا: کوئی نہیں۔ اس جواب نے سقراط کو حیرت زدہ کر دیا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ اپولو غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ خود دانش کی الف ب سے بھی واقف نہیں۔ اس چیستان کو سمجھنے کے لیے اس نے ان اشخاص سے رجوع کیا جو اہل دانش کہلاتے تھے اور معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے رہنمائی چاہی۔ پتا یہ چلا کہ لوگوں کے ذہن پراگندہ خیالی سے اٹے ہیں۔ انجام کار سقراط اس نتیجے پر پہنچا کہ دیوتا [illegible] دیتا ہے اور اس نے سقراط کی فراست پر صاد کر کے صرف یہ جتایا ہے کہ جس دانائی پر انسانوں کو ناز ہے وہ محض پوچ ہے۔ ہاتف نے سقراط کا نام مثال کے طور پر لیا ہے۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ وہی شخص سب سے دانش مند ہے جو سقراط کی طرح اپنی نادانی اور کم علمی کا فہم رکھتا ہے۔

399ق م میں سقراط پر فرد جرم عائد کی گئی کہ وہ نوجوانوں کا اخلاق بگاڑتا رہا ہے اور شہر کے دیوتاؤں کے بجائے خود ساختہ خداؤں پر ایمان رکھتا ہے۔ استغاثہ نے مطالبہ کیا کہ اسے موت کی سزا دی جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایتھنز میں جمہوریت کی بحالی کے بعد عام معافی کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ اس لیے مخالفین سقراط پر سیاسی نوعیت کے الزام عائد نہ کر سکے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سقراط پر جو الزامات لگائے گئے تھے وہ بالکل بے بنیاد نہیں تھے۔ ارسٹوفانیس نے اپنے ڈراما "بادل" میں سقراط کو ہوا کی پرستش کرتے دکھایا تھا۔ یہ تسلیم کہ ارسٹوفانیس نے مبالغے سے کام لیا ہوگا لیکن کوئی بات ہو تبھی بتنگڑ بنتا ہے۔ لوگوں نے یہ فراموش نہیں کیا تھا کہ سقراط کو کسی زمانے میں طبیعی علوم سے شغف تھا اور طبیعی فلسفیوں کو عام طور پر دہریے سمجھا جاتا تھا۔ دو باتوں نے خاص طور پر اسے بہت نقصان پہنچایا۔ ایک تو اس کا سوال جواب کا طریق کار جس سے بڑے بڑوں کا پول کھل جاتا تھا۔ لوگوں کو یہ بات نہایت ناگوار گزرتی تھی کہ کوئی شخص کہتا ہے تو یہ کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا اور پھر باتوں باتوں میں الٹا انھیں کو کھودن ثابت کر دے۔ دوسرے سقراط کے شاگردوں اور ہمدردوں کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ انھیں جمہوریت سے کد ہے۔ اس کے بیشتر شاگرد امیر گھرانوں کے چشم و چراغ ہونے کے ناتے اس تصور کو عزیز رکھتے تھے کہ حکومت کرنے کا حق فقط اعلیٰ طبقے کے چیدہ چیدہ افراد کو ہے۔ عوام کو صرف کان دبا کر کہنا ماننا چاہیے۔ بدقسمتی سے اس کے دو خاص شاگردوں نے بڑی اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دیا۔ الکی بیادیس نے پیلوپونے سوی جنگ کے دوران ایتھنز سے غداری کی۔ ایک اور شاگرد کریٹیاس، ان تیس قہرمانوں (Tyrants) میں شامل تھا جنھیں اہل اسپارٹا نے فتح حاصل کرنے کے بعد ایتھنز پر مسلط کر دیا تھا۔ ان قہرمانوں نے شہر والوں پر بڑے ظلم ڈھائے۔

یہ سمجھنے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ سقراط کو خود بھی جمہوریت سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور اس کی تعلیمات نے نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جو قانون اور آزادی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ سقراط جرح و قدح کے زور سے بنیادی اصولوں کے پرخچے تو اڑا دیتا لیکن ایسے کوئی اصول پیش نہ کرتا جو ان کی جگہ لے سکیں۔ یہ طریق کار عام لوگوں کو قطعی طور پر تخریبی معلوم ہوتا تھا۔

اپنی صفائی میں سقراط نے عدالت کے روبرو جو کچھ کہا وہ سب سے مربوط شکل میں افلاطون کی زبانی ہم تک پہنچا ہے۔ اس "اعتذار" میں افلاطون نے اپنی طرف سے کچھ بڑھایا گھٹا دیا ہو تو عجب نہیں۔ سقراط نے عائد کردہ الزامات کی پرزور تردید کی اور کہا کہ اگر استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑا ہے تو عدالت میں موجود اس کے سابق شاگردوں یا ان شاگردوں کے باپوں اور بھائیوں کو استغاثہ کی طرف سے گواہی دینے کے لیے طلب کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ سقراط نے یہ بھی کہا کہ "ایتھنز کے لوگو! میں تمھارا احترام اور تم سے محبت کرتا ہوں لیکن فرماں برداری میں خدا ہی کی کروں گا، تمھاری نہیں۔"

جب رائے شماری ہوئی تو جیوری کے 281 افراد نے اسے مجرم قرار دیا اور ۲۲۰ ووٹ اس کی برأت کے لیے پڑے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ پیش ہوا کہ سزا کیا دی جائے۔ بعض جرائم کی سزا قانون میں متعین تھی لیکن باقی صورتوں میں مجرم قرار دیا جانے والا شخص اس سزا کی جگہ جس کا استغاثہ نے مطالبہ کیا ہو کوئی اور سزا تجویز کرنے کا حق رکھتا تھا۔ اس کے بعد جیوری کے ارکان دونوں سزاؤں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ سنا دیتے تھے۔ سقراط اگر موت کی سزا کے مقابلے میں جلاوطنی کی سزا تجویز کرتا تو امکان یہی تھا کہ اسے جلاوطن کر دیا جاتا۔ لیکن

وہ بالکل ٹس سے مس نہ ہوا۔ شاید وہ یہ سمجھتا ہو کہ اتنی سخت سزا تجویز کرنا اعتراف جرم کے مترادف ہوگا۔ دوستوں سے صلاح مشورہ کے بعد، جنھوں نے بلاشبہ اسے کوئی معقول رویہ اپنانے کو کہا ہوگا، اس نے کہا تو یہ کہ وہ تو سمجھتا ہے کہ عوامی محسن کے طور پر وہ ریاست کی طرف سے تاحیات وظیفہ پانے کا مستحق ہے۔ تاہم اپنے احباب کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے وہ تین ہزار درہم کا جرمانہ تجویز کرتا ہے۔ سب کو پتا تھا کہ سقراط کے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ اگر اس کا تمام اثاثہ بھی بیچ دیا جاتا تو سو سے زیادہ درہم وصول نہ ہوتے۔ سقراط کے لاابالی پن کا جیوری نے بہت بُرا مانا اور جب رائے لی گئی تو 501 ارکان میں سے تین سو نے کہا کہ اُسے موت کی سزا دی جائے۔

اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ اس کے لیے فرار ہو جانا ممکن تھا۔ اس کے ایک دوست نے رشوت دے کر زندان کے داروغہ کو ساتھ ملا لیا۔ اس میں دقت اس لیے بھی نہیں ہوئی کہ ایتھنز کے عمائدین میں سے کوئی بھی دل سے سقراط کی موت کا خواہاں نہ تھا۔ لیکن سقراط نے یہ کہہ کر فرار ہونے سے انکار کر دیا کہ "کیا میں ان قوانین کی اطاعت نہ کروں جنھوں نے اب تک مجھے تحفظ فراہم کیا ہے؟" اور زہر کا پیالہ پی کر جان دے دی۔

خود سقراط نے تو کچھ نہیں لکھا۔ چناں چہ اہم سوال یہ ہے کہ جن معاصرین نے اس کی شخصیت یا افکار کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے ان پر کس حد تک تکیہ کرنا جائز ہے؟ اس ضمن میں پہلا نام افلاطون کا ہے جسے سقراط کا شاگرد رشید ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کا خاصا امکان ہے کہ ابتدائی افلاطونی مکالمے اچھی بھلی تاریخی سچائی کے حامل ہیں۔ بہرحال، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ افلاطون نے بھی سقراط کی وفات کے کئی سال بعد لکھنا شروع کیا تھا۔

البتہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مکالمے کے دوران نکات جستہ جستہ قلم بند کرتا رہا ہو۔ لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ "مکالمات" میں سقراط کہاں پر ختم اور افلاطون کہاں سے شروع ہوتا ہے۔

دعویٰ تو کسینوفون کو بھی یہی ہے کہ وہ سقراط کے بہت قریب تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بعض اہم شواہد کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسینوفون کا "منادمہ" افلاطون کے "منادمہ" کے بعد قلم بند کیا گیا تھا اور افلاطونی تصنیف کا سطحی سا چربہ ہے۔ کسینوفون نے اپنی تحریروں میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ سقراط روایتی مذہبی عقائد اور رسوم پر کاربند تھا، خود بھی روایتی انداز میں نیک آدمی تھا اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرتا تھا۔ فضول دانشوری و بحث کے خلاف تھا۔ مختصر یہ کہ کسینوفون نے سقراط کو ایسا شریف اور معقول آدمی بنا کر پیش کیا ہے جس کے ہر قول و فعل سے بورژوائی کورذوقی کی بُو آتی ہو۔ اگر سقراط ایسا ہوتا تو اس پر مقدمہ ہی کیوں چلایا جاتا! اس خیالی سقراط کی ذہنی دلچسپیاں بعینہ وہی ہیں جو خود کسینوفون کی ہیں۔

ارسطو نے بھی سقراط کا ذکر کیا ہے لیکن وہ پیدا ہی سقراط کی وفات کے بعد ہوا تھا اور اسے وہی کچھ معلوم ہوگا جو اس کے استاد افلاطون نے بتایا یا اِدھر اُدھر سے سننے میں آیا۔ ارسطوفینس نے بھی اپنے ڈراما "بدلیاں" میں سقراط کا خاکہ اڑایا تھا۔ اس نے سقراط کو اس طرح پیش کیا تھا جیسے وہ خیالی دنیا میں رہنے والا، خطابت پردازی بگھارنے والا، اخلاق سے بیگانہ، خبیث سوفسطائی ہو۔ دراصل ارسطوفینس نے نئے انداز کی تعلیم کے خلاف محاذ قائم کر رکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ سوفسطائی شرفا کی اولاد کو خراب کر رہے ہیں۔ یہ تاثر عوام الناس کے ذہن سے کبھی زائل نہ ہو سکا۔

سقراط کے فلسفیانہ خیالات پر نظر ڈالنے سے پہلے مختصر سا جائزہ اس دور کے علمی و عقلی رجحانات کا بھی لینا چاہیے۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے ایتھنز میں طبیعی علوم سے اہل دانش کی دلچسپی کم ہو گئی تھی اور توجہ خالص فلسفیانہ موضوعات پر مرکوز ہو چلی تھی۔ اس تبدیلی میں ان پیشہ ور معلموں کا خاصا ہاتھ تھا جو سوفسطائیوں کے نام سے مشہور تھے اور یونانی دنیا میں شہر بہ شہر گھوم پھر کر بھاری فیس کے بدلے مختلف موضوعات کی تعلیم دیتے تھے۔ ان موضوعات میں خطابت پردازی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

فلسفیانہ مباحث میں زیادہ زور اخلاقیات کے مطالعہ یا اس سوال پر تھا کہ علم کیا ہے اور کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں محکم دلائل اور مربوط فکر کے ذریعے سے بنیادی اصولوں کا پتا چلانے کی بڑی کاوش کی گئی۔ لیکن چونکہ ابتدا میں ایسے بنیادی مفروضوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا جو سب کو قبول ہوں اس لیے نتیجہ تشکک اور بے یقینی میں اضافے کے سوا کچھ نہ نکلا۔ تمام علم اضافیت کا شکار ہو گیا بلکہ سکڑ سکڑ کر عینیت (Solipsism) کے کوزہ میں بند ہونے لگا۔ ایک مفکر نے تو یہ ثابت کرنا چاہا کہ اول تو کچھ موجود ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو ہم اسے جان نہیں سکتے اور اگر جان بھی لیں تو اپنے علم میں دوسروں کو شریک نہیں کر سکتے۔ یہ بے یقینی اخلاقیات اور خود دینی معاملات پر بھی اثرانداز ہوئی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ حق اور انصاف محض اضافی اصطلاحیں ہیں۔ بات اسی کی مانی جاتی ہے جس کے پاس طاقت ہو۔ سوفسطائیوں کے بارے میں تو عام خیال یہی تھا کہ انھیں سچائی اور انصاف کا کوئی پاس نہیں، صرف مال و زر کی خاطر خطابت پردازی کے زور سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرتے ہیں اور کسی بھی معاملے کے حق میں یا خلاف یکساں آسانی سے دلائل دے سکتے ہیں۔ یہ وہ ذہنی فضا تھی جس میں سقراط کو پہلے دن سے سانس لینا پڑا۔

سقراط ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ خود اسے کچھ بھی معلوم نہیں اور اگر وہ دوسروں سے زیادہ عقلمند ہے تو صرف اس اعتبار سے کہ اسے اپنے جہل کا شعور ہے اور دوسرے اپنی لاعلمی سے بے خبر ہیں۔ سقراطی طریق کار کا بنیادی نکتہ ہم کلام کو اس بات کا قائل کرنا تھا کہ درحقیقت اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ جہل کا اعتراف علم کے حصول کی طرف ایک ناگزیر پہلا قدم تھا کیوں کہ وہ شخص علم حاصل کرنے پر آمادہ ہی کیوں ہوگا جو اس وہم میں مبتلا ہو کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ سقراط لوگوں سے بات چیت کر کے انھیں یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ محض جاہل بلکہ جہل مرکب ہیں۔ اس لیے تعجب ہی کیا جو وہ نامقبول تھا۔ ایتھنز والے غلطی سے اسے سوفسطائیوں کی قبیل کا آدمی سمجھ بیٹھے۔ سوفسطائیوں کا کہنا تھا کہ مکمل علم ناممکنات میں سے ہے۔ سقراط یہ ثابت کرتا پھرتا تھا کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ لیکن حقیقت میں دونوں نقطۂ ہائے نظر میں بڑا باریک فرق ہے۔ سقراط کا عمل اس پُرجوش یقین کا آئینہ دار تھا کہ علم کا حصول ممکن ہے لیکن اس کی تلاش میں نکلنے سے پہلے ان کچے پکے اور گمراہ کن خیالات کے کاٹھ کباڑ کو ہٹانا ضروری ہے جس سے بیشتر انسانوں کے ذہن اٹے پڑے ہیں۔ جب منزل کا راستہ صاف نظر آنے لگے تو سب مل کر صحیح سمت میں قدم اٹھا سکتے ہیں۔

اس اخلاقی ابتری میں، جس نے سقراط کے عہد پر پنجے گاڑ رکھے تھے، ایک بات اسے بالکل واضح طور پر شرانگیز نظر آتی تھی۔ لوگ بھانت بھانت کی اصطلاحیں استعمال کرنے کے عادی تھے، خصوصاً وہ اصطلاحیں جنھیں انصاف، شجاعت، میانہ روی وغیرہ کی تعریف قرار دیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب سقراط نے لوگوں سے پوچھ گچھ کی تو ان میں سے کوئی بھی ان صفات کی جامع تعریف نہ کر سکا۔ اب اگر کسی شخص کو عقل مندی یا انصاف یا نیکی کا مطلب ہی معلوم نہ ہو تو وہ کس منہ سے کہے گا کہ عقل مندی یا انصاف سے

کام لینا چاہیے یا نیکی کرنی چاہیے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مختلف آدمی ایک ہی لفظ سے مختلف معنی مراد لیتے ہیں تو پھر وہ ایک دوسرے کا مفہوم خاک سمجھیں گے۔ اس طرح تو ذہنی اور اخلاقی افراتفری پھیل جائے گی۔ سقراط کے ذہن میں یہ مسئلہ بالکل صاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ملکہ یا مہارت ہی اصل علم ہے یعنی جو کام کرنا ہو اس کی تمام اونچ نیچ کا پہلے پتا ہونا چاہیے۔ سقراط کو پورا یقین تھا کہ اگر یہ نکتہ انسانوں کے پلے پڑ جائے تو وہ خود بخود صحیح راستہ چن لیں گے۔ بقول سقراط، خیر کو سمجھنا خیر کو اپنا لینے کے مترادف ہے۔ علم ہی تقویٰ ہے بالکل جیسے اس کا الٹ یعنی بے علمی شر ہے۔ ہر انسان فطری طور پر اپنی بھلائی کا خواہاں ہوتا ہے۔ غلط کام اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے کے مانند ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان غلط کام صرف بے علمی کی وجہ سے کرتا ہے۔

جس فلسفیانہ روش کا وہ داعی تھا اس میں سقراط نے انسانی روح کو سب سے بلند مقام پر رکھا ہے۔ روح کی عظمت کے بارے میں اس کا ایقان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ دیکھا جائے تو سقراط کا یہ فیصلہ اس زمانے کے معاشرہ کی پٹی یونانی اشرافی اقدار کے منہ پر طمانچہ تھا۔ سقراط کے فکری نظام میں انسان کی اہمیت کا تعین امارت یا اقتدار یا شہرت کے حوالے سے ممکن نہیں۔ روح کا علو ہی انسان کے شرف کا ضامن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے پاس روح سے زیادہ بیش بہا چیز کوئی نہیں۔ اس بنا پر روح کی نگہداشت انسان کا سب سے بڑا فرض بھی ہے۔

سقراط نے اپنی توجہ طبیعی کائنات سے ہٹا کر اخلاقی مسائل پر مرکوز کردی۔ اس کا بنیادی مقصد معلومات فراہم کرنا نہیں تھا۔ وہ دوسروں کو سوچنے سمجھنے پر اکسانا چاہتا تھا تاکہ وہ اپنے طور پر بہتر انسان بن سکیں۔ استادانہ زعم اسے چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ شاگردوں کو وہ اپنا دوست گردانتا تھا۔ سقراط کے مقاصد واضح اور کلی طور پر اخلاقی تھے۔ اس نے خواہ جان بوجھ کر یا اتفاق سے، اخلاقیات اور سیاسیات کے مابین لکیر کھینچ دی۔ اس نے کہا کہ وہی حکمران اقتدار کی راہ دکھا سکتا ہے جو بصیرت پر مبنی ہو۔ جس کا انحصار مانگے تانگے کی معلومات پر ہو اس سے روشنی ملتی۔ اس نے اپنی مثال سے ثابت کیا کہ فلسفہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کے آرزومندوں کو پہلے تمام ترجیحوں اور خواہشوں کو بالائے طاق رکھنا ہوگا تاکہ وہ آزادی سے سوچ بچار کرسکیں۔ سقراط کی اس تاکید سے فرد کی آزادی اخلاقیات کا مسئلہ بن گئی اور انسان کی اخلاقی خودفرمائی کا آغاز ہوا۔ یہ ہے کہ سقراط نے ڈیلفی کے ہاتف کدے (معبد) کے مشہور پند "اپنا آپ پہچان" میں رچی ہوئی دانائی پر جس یکسوئی سے عمل کیا اس کی کوئی نظیر یونان میں اس سے پہلے نہیں مل سکتی۔

فرہنگ

جھنجھل:	خفگی، غصہ
چیستان:	پہیلی، معما، بجھارت
اعتذار:	عذر کرنا
تشکک:	شک کرنا، شبہ
چیٹک:	لگن، دھن، شوق
جھنجھٹ:	پریشانی
چڑچڑا:	بدمزاج
تنومند:	مضبوط
منادمہ:	(کتاب کا نام ہے)
اجہل:	بڑا جاہل
منادمت:	ہم نشینی

وہ ناقابلِ فراموش ہرن

خوبصورت سینگوں والے ایک نو ہرن کی کہانی۔ زندہ رہنے کی بے پناہ اُمنگ نے اُسے امر کردیا تھا۔

جیری ملے / صبا شفیق

ہم قریباً اس شہر میں رہتے تھے جب کہ میرے دادا اور چچا قریباً اس کے دیہی علاقے میں رہتے تھے۔ جس کے قریب وسیع و عریض جنگل، فارم اور چراگاہیں تھیں۔ مجھے ہمیشہ انتظار رہتا کہ کب ہم گاؤں جائیں اور میں چراگاہوں اور جنگل میں گھوموں اور اس ندی میں اپنے چچیرے بھائیوں کے ساتھ نہاؤں جو چچا کے گھر سے تھوڑی ہی دور تھی۔ میں بہت چھوٹا تھا جب میرے دادا کا انتقال ہوگیا۔ وہ بہت بڑے شکاری تھے اور شکار کا شوق میرے والد اور چچا کو ورثے میں ملا تھا۔ دادا کے گھر ان کی بڑی سی شیشے والی الماری میں، میں نے ہمیشہ آٹھ نو مختلف طرح کی بندوقیں لگی دیکھیں۔ میرے چچیرے بھائی ابھی بہت چھوٹے تھے جب میرے چچا نے انھیں چھروں والی چھوٹی چھوٹی بندوقیں لا دیں۔ مگر انھیں شکار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مگر جب میں گاؤں گیا تو میری خوب موجیں ہوگئیں۔ میں سارا دن چھروں والی بندوقیں لے کر باہر گھومتا رہتا اور بیچاری معصوم چڑیوں پر نشانہ بازی کی مشق کرتا رہتا۔ کبھی کبھی میرے والد صاحب میرا ہاتھ تھام کر مجھے نشانہ باندھنے اور لگانے کی عملی تربیت دیتے۔

جس دن میں نے پہلی بار واقعی ایک چڑیا کو مار گرایا تو اس کو دیکھ کر میں رونے لگا تب میرے بابا نے مجھے سینے سے لگایا اور سمجھایا "بیٹا شکار کرنے کے لیے دل بڑا ہونا چاہیے۔ اگر تمھیں ایک اچھا شکاری بننا ہے تو تمھیں بے حد بہادر ہونا پڑے گا اور اپنے دل کو بے حد مضبوط کرنا پڑے گا...... ورنہ تم شکاری بننے کا خیال دل سے نکال دو۔" میں بہت چھوٹا تھا مگر بابا کی بات سمجھ گیا۔ میں نے چڑیا کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور بابا سے کہا،

"بابا آپ کا بیٹا بہت بہادر ہے اور آپ کے بیٹے کو بہت بڑا شکاری بننا ہے۔" میں نے بابا سے کہا کہ مجھے ایک بندوق لے دیں اور پھر چند دن بعد ہی میری سالگرہ پر بابا نے مجھے تحفے میں بندوق لے دی۔

اگلی بار جب میں گاؤں گیا تو میں نے بے شمار چڑیاں شکار کیں۔ ایک دن ایک فاختہ دیوار پر بیٹھی تھی۔ میں نے اسے بھی اپنی بندوق کا نشانہ بنا ڈالا۔ میرا اگلا شکار دادا کے باغ میں آنے والی ایک گلہری تھی۔ جنگل سے اکثر خرگوش دادا کے باغ میں آ جاتے تھے۔ میں نے انھیں شکار کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں ان کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک جاتا۔ مگر وہ قابو نہ آتے۔ ایک دن میں اپنے چچیرے بھائیوں کے ساتھ جنگل میں گیا اور بہت کوشش اور تگ و دو کے بعد ہم ایک خرگوش شکار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں بہت فخر محسوس کر رہا تھا۔ چچا اور بابا نے مجھے بہت شاباش دی، سب بہت خوش تھے۔ چچا نے کہا، "آج رات ہم بھی خرگوش کھائیں گے۔ آؤ جان! اس کی کھال اتاریں اور گوشت کاٹیں۔" میں ہچکچایا تو چچا بولے، "بیٹا جی! اچھا شکاری بننا ہے تو شکار کی کھال اتارنے اور گوشت کاٹنے کا کام بھی سیکھنا پڑے گا۔" میرا دل بہت خراب ہوا جب میں نے خرگوش کی کھال اتاری مگر چچا اور بابا میری رہنمائی کر رہے تھے۔ سو میں نے جلد سیکھ لیا۔ خرگوش کو روسٹ کیا گیا اور وہ بے حد لذیذ تیار ہوا۔ سب نے کھانا کھاتے مجھے تھپکیاں اور شاباش دی۔ میرے چہرے پر فخر اور خوشی سے سرخی دوڑ رہی تھی۔ شاید یہ تعریف و توصیف ہی تھی کہ میرا شکار کا شوق مزید پروان چڑھا۔ اس وقت میری عمر صرف گیارہ سال تھی۔

ٹیکساس کی چراگاہیں اور جنگل ہرن کے [illegible] لیے مشہور ہیں۔ میرے دادا کو ہرن کا گوشت پسند تھا۔ اس لیے جب ان کا دل ہرن کا گو[illegible] کھانے کو چاہتا وہ بندوق اٹھا کر جنگل میں جاتے۔ وہ ماہر شکاری تھے اس لیے کبھی خالی ہا[illegible] لوٹتے۔ وہ علاقے سے اچھی طرح واقف تھے سو [illegible] پتا ہوتا تھا کہ انھیں کہاں گھات لگا کر بیٹھنا ہے۔ [illegible] کے شکار کے لیے بہترین طریقہ ہرن کی گزرگا[illegible] گھات لگا کر بیٹھنا ہے کیونکہ ہرن کی حسیات [illegible] تیز ہوتی ہیں کہ وہ پاؤں کی ہلکی سی دھمک بھی محسو[illegible] لیتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔

میری عمر چودہ سال تھی جب میں نے بابا سے [illegible] کہ میں ہرن کا شکار کرنا چاہتا ہوں۔ میری بات [illegible] پہلے تو بابا بہت ہنسے پھر کہنے لگے، "یار تھوڑے بڑے ہو جاؤ پھر چلیں گے ہرن کا شکار کرنے۔" [illegible] دن بعد ہم گاؤں گئے تو بابا نے مسکرا کر چچا کو میرے شوق سے آگاہ کیا۔ چچا کہنے لگے، "بھائی جان! [illegible] پیدائشی شکاری ہے۔ تیاری کریں، کل جنگل میں چ[illegible] ہیں۔ اب کی بار میرا بھتیجا ہمیں ہرن کا گوشت کھ[illegible] ہی جائے گا۔" میں بے انتہا خوش ہو گیا۔ تمام [illegible] مارے جوش اور خوشی کے مجھے نیند نہ آئی۔ چچا نے [illegible] بیٹوں کو ساتھ چلنے کو کہا مگر انھوں نے دلچسپی ظا[illegible] کی۔ سو اگلی صبح میں بابا اور چچا، کیمپ اور [illegible] سازوسامان کے ساتھ دادا کی شکاری جیپ میں [illegible] کی طرف روانہ ہوئے۔

میرے چچا نے بہت بار دادا کے ساتھ ہر[illegible] شکار کیا تھا۔ اس لیے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہرن کس جگہ مل سکتے ہیں سو ہم مطلوبہ مقام پر پہ[illegible]

جیپ سے اترے اور پیدل چلنے لگے۔ کیونکہ جیپ کی آواز سے تو تمام ہرن بھاگ جاتے۔ تقریباً ستر گز تک ہم پیدل چلے اور پھر چچا نے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے پاس ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہاں رک گئے اور ہرنوں کا انتظار کرنے لگے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی مگر ہم نے ایک بھی ہرن نہیں دیکھا۔ دوپہر کو ہم نے اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا اور چائے پی اور تھوڑی دیر وہیں لیٹ کر سستانے لگے۔ میں نے چچا سے کہا کہ ہمیں آگے بڑھ کر ہرن ڈھونڈنے چاہییں۔ مگر چچا نے کہا کہ "ابھی انتظار کرو بیٹا! شکاری کے لیے صبر سیکھنا بہت ضروری ہے۔" جھاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آنے لگی اور میں اونگھنے لگا کہ اچانک بابا نے میرا کندھا ہلایا۔ میں نے ان کی جانب دیکھا تو انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ جب میں نے ان کی انگلی کی سمت میں دیکھا تو مجھے کافی دور درختوں کے جھنڈ سے ایک ہرن ہماری سمت آتا دکھائی دیا۔

میں نے بابا سے سرگوشی میں کہا، "بابا میں نشانہ لوں؟" بابا اور چچا مجھے دیکھ کر مسکرائے اور مجھے تھپکی دیتے ہوئے کہا، "بالکل آج ہمارا ننھا شکاری ہی نشانہ لے گا۔" میں بے حد پُرجوش ہو گیا۔ اس دوران ہرن اور قریب آ چکا تھا۔ اب ہرن کے اور ہمارے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ بابا نے کہا، "تسلی سے اور پوری توجہ سے نشانہ باندھو۔ کیونکہ بے صبری اور جلد بازی میں باندھا گیا نشانہ اکثر خطا ہو جاتا ہے۔" درختوں سے نکل کر ہرن اب کھلے میدان میں عین ہمارے سامنے تھا اور گھاس چرنے میں مگن تھا۔ ہم ابھی تک جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہرن چرتے چرتے اور قریب آ گیا۔ اب ہمارے اور ہرن کے درمیان تیس گز کا فاصلہ تھا۔ اس دوران میں نے تسلی سے نشانہ لیا اور پھر گولی چلا دی۔ میرا نشانہ بالکل ٹھیک لگا اور ہرن وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں بابا کے گلے لگ گیا۔ میری خوشی دیدنی تھی۔ بابا اور چچا نے باری باری مجھے گود میں اٹھایا اور خوب پیار کیا۔ پھر چچا نے ہرن کو درخت سے لٹکایا اور اس کی کھال اتارنے لگے پھر چچا نے ہرن کا خون میرے گالوں اور ماتھے پر لگایا اور بولے، "ننھے شکاری..... یہ ہماری روایت ہے..... آج سے تم پکے شکاری بن گئے ہو۔" میں نے اپنا کیمرہ نکالا جو میں ایسے ہی کسی لمحے کے لیے ساتھ لے کر گیا تھا اور چچا اور بابا نے ہرن کے ساتھ میری ڈھیر ساری تصویریں بنائیں۔ پھر ہم نے ہرن کو جیپ میں ڈالا اور گھر لوٹ آئے۔ میرا شاندار استقبال کیا گیا۔ امی، چچی، دادی اور تمام کزنز نے مجھے گلے لگا کر مبارک باد دی۔ میرے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ فخر و انبساط اور کامیابی کا نشہ کیا ہوتا ہے یہ میں نے اب جانا تھا۔ میری عمر صرف چودہ سال تھی اور میں کامیابی سے ایک ہرن شکار کر چکا تھا۔ میری اس کامیابی نے میرے شکار کے شوق کو اور بھی بڑھا دیا۔

اب میں نے تیر کمان سے شکار کرنے کی مشق بھی شروع کر دی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں تیر کمان سے ہر چھوٹا بڑا شکار کرنے کی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ ہر تین چار مہینوں بعد جب ہم گاؤں جاتے تو واپسی پر میرے شکار کی فہرست میں اضافہ ہو جاتا۔ میری عمر

انیس سال تھی جب ایک ہرن نے مجھے ناکوں چنے چبوا دیے۔ مادہ ہرن کے سینگ نہیں ہوتے۔ جب کہ نر ہرن کے سینگ ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ اپنے شکار کردہ ہرن کی سینگوں والی کھوپڑی اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنا کر بہت فخر سے اپنے شکار کی داستانیں سناتے ہیں۔ میرے ڈرائنگ روم میں بھی ایک نہایت خوبصورت اور شاندار ہرن کی کھوپڑی سجی ہے۔ مگر اس کے شکار کی داستان واقعی بے حد دلچسپ ہے۔ میرے بابا چاہتے تھے کہ میں کوئی بڑا ہرن شکار کروں۔ ٹیکساس میں ایک بہت بڑا جنگل پارک ہے۔ جہاں بہت بڑے بڑے اور خوبصورت ہرن ملتے ہیں۔ پارک میں شکار کے لیے باقاعدہ لائسنس اور پرمٹ ملتے ہیں۔ سو بابا نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے اسی پارک کا انتخاب کیا۔ ہم پارک میں پہنچے تو شام ہو رہی تھی سو ہم نے خیمہ لگا کر آرام کرنے کو ہی بہتر جانا۔ اگلے دن ابھی سورج طلوع ہو رہا تھا جب میری آنکھ کھل گئی۔ یہ منظر بہت دلفریب تھا۔ ہم نے خیمہ ایک ہری بھری چراگاہ کے قریب لگایا تھا۔ جس کے قریب ہی ایک ندی بھی بہتی تھی۔ بہت دیر تک میں گہرے گہرے سانس لے کر منظر کی خوبصورتی کو اپنے اندر اتارتا رہا۔ اتنی دیر میں بابا بھی جاگ گئے تھے۔ ہم نے ناشتہ کیا اور پھر اپنی بندوقیں لے کر پارک کے جنگل والے حصے کی طرف بڑھے۔ یہاں اونچی نیچی پگڈنڈیاں تھیں اور چٹانیں بھی تھیں۔ بابا نے کہا کہ جنگل کے اوپری حصے میں چلتے ہیں وہاں زیادہ بڑے ہرن ملنے کے امکانات ہیں۔ سو ہم اوپر کی جانب بڑھنے لگے۔ اچانک ہمیں پہاڑ سے نیچے اترتے چند ہرن دکھائی دیے۔ ہم وہیں رک کر ایک چٹان کے پیچھے چھپ گئے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ آٹھ عدد مادہ ہرن تھے اور ان کے پیچھے ایک نہایت ہی جوان اور شاندار نر ہرن تھا۔ وہ یوں اُن کے ساتھ چل رہا تھا جیسے ان کا محافظ ہو۔ میں اور بابا دوربین سے ان کا جائزہ لینے لگے۔ سورج پوری طرح نکل آیا تھا سورج کی شعاعیں دوربین کے عدسے سے منعکس ہو رہی تھیں اور اب ہمیں دوربین سے ٹھیک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہرن ہم سے تقریباً ستر گز دور تھے۔ ہوا کا رخ ان کی جانب سے ہماری طرف تھا اور وہ ہماری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس لیے میں نے اور بابا نے انتظار کرنا مناسب خیال کیا تاکہ نشانہ تیس یا چالیس گز سے لیا جا سکے۔ مگر ہمیں یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ راستہ نہ بدل جائیں اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ مادہ ہرن اچانک دوسری سمت کو مڑ گئے تو نر ہرن ان کی جانب دوڑا۔ مجھے لگا کہ وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اچانک بابا نے اپنے منہ سے نر ہرن کی آواز نکالی جو کہ دادا نے انھیں ان کے بچپن میں سکھائی تھی۔ نر ہرن رک گیا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں بھی حیرت و استعجاب سے بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرائے اور سرگوشی کی "میرے لاڈلے یہ بھی ایک طریقہ ہوتا ہے ہرن کو متوجہ کرنے کا۔" پھر بابا نے ایک دو بار وہی آواز نکالی۔ نر ہرن اب مادہ ہرنوں کو بھول کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔ بابا کی آواز نے کام کر دکھایا تھا۔ مگر پھر اچانک نر ہرن رک گیا۔ جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے مادہ ہرنوں کے ساتھ جانا چاہیے یا آواز کی سمت میں بڑھنا چاہیے اور پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا اور مڑنے لگا۔ اس دوران میں میں نشانہ باندھ چکا تھا۔ اِدھر وہ مڑا اور اُدھر تیر میری

کمان سے نکلا اور اس کے دائیں کندھے کو چیرتا ہوا سامنے صنوبر کے درخت کے تنے میں پیوست ہو گیا۔ ہرن خوفزدہ ہو کر بھاگا۔ مادہ ہرن بھی قلانچیں بھرتے چند سیکنڈوں میں وہاں سے غائب ہو گئیں۔ میں اور بابا بھاگ کر اس جگہ پہنچے جہاں تیر ہرن کو لگا تھا اور یہاں موجود خون کی خاصی موٹی دھار نے یہ ثابت کر دیا کہ میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ تیر نے ہرن کو گہرا زخم پہنچایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہرن زیادہ دور نہیں جا پائے گا اور چند گز دور جا کر ہی ڈھیر ہو جائے گا۔ مگر بابا نے مجھے بتایا کہ نر اور جوان ہرن بعض اوقات حیران کن حد تک سخت جان ثابت ہوتے ہیں اور شکاری کو ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں اور کچھ ہی دیر بعد بابا کی بات صحیح اور میرا اندازہ محض میری خوش فہمی ثابت ہوا۔ مجھے تیر چلائے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب تک ہرن خون بہنے سے ختم ہو چکا ہو گا۔ سو ہم خون کی دھار کا پیچھا کرتے ہوئے ہرن کی جانب بڑھنے لگے۔ ہم چالیس گز ہی دور گئے تھے کہ ہمیں ہرن ایک درخت کے پیچھے بیٹھا نظر آیا اس کا ہلتا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے اور گہری سانسیں لے رہا ہے۔ بابا نے مجھے کہا کہ ہمیں رک کر مزید انتظار کرنا چاہیے۔ مگر میں ناتجربہ کار اور بے صبرا تھا میں جلد سے جلد اس ہرن کے خوبصورت سینگوں پر ہاتھ پھیرنا چاہتا تھا جو بے حد خوبصورت تھے۔ سو میں نے بابا کی بات نہیں مانی اور مجبوراً بابا کو میرے ساتھ آگے بڑھنا پڑا۔ ہم ہرن سے تقریباً بیس گز دور تھے جب اچانک اس نے شاید ہماری آہٹ پا لی وہ ایک دم اُچھل کر کھڑا ہوا اور چوکڑیاں بھرتا ہوا غائب ہو گیا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ جس جگہ ہرن نے آرام کیا تھا وہاں اس کے خون نے زمین کو رنگین کر دیا تھا یعنی ہرن کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں مزید حیران اور متعجب ہوا کہ اس قدر خون بہہ جانے کے باوجود وہ کس طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا ہماری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا تھا۔ تب بابا مسکرائے اور میرے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے بولے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

میں مسکرانے لگا۔ میرے بابا کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند تھی وہ کبھی ہمت نہیں ہارتے تھے اور میری اس طرح ہمت افزائی کرتے تھے کہ میں بالکل تازہ دم ہو جاتا تھا۔ ان کی بصارت، مہارت، ان کی حس مزاح کا میں ہمیشہ سے قائل تھا۔ بے شک وہ پیشہ ور شکاری نہیں تھے۔ مگر میرے دادا جیسے ماہر شکاری کے ساتھ شکار کے تجربوں سے انھوں نے وہ تمام گُر سیکھ لیے تھے جو ایک کامیاب شکاری کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اپنی ہی مہارت اور تجربہ وہ نہایت محبت اور طریقے سے مجھے منتقل کرتے رہتے تھے۔ وہ کبھی مجھے گھر پر بیٹھ کر شکار کے طریقے نہیں بتاتے تھے اور شکار پر لیکچر نہیں دیتے تھے مگر جب ہم شکار کر رہے ہوتے تو اس وقت وہ ایک شفیق استاد کی طرح میری رہنمائی کرتے۔ سو اب بھی وہ میری ہمت بڑھا رہے تھے۔ ہم کچھ دیر وہاں رکے اور پھر اٹھ کر خون کی دھار کا پیچھا کرنے لگے۔

خون کی دھار مزید گہری ہوتی جا رہی تھی اور یہ اب پارک کی سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ ہم اسی سمت جا رہے تھے کہ سڑک کے حفاظتی جنگلے کے

ساتھ ہمیں ہرن لیٹا اور گہرے سانس لیتا نظر آیا۔ میں تھک چکا تھا۔ سو میں نے کمان پر تیر چڑھایا تا کہ ہرن کا کام مکمل کر سکوں۔ مگر اس کی حسیات ابھی بھی پوری طرح کام کر رہی تھیں ہم اس سے پندرہ گز دور تھے مگر وہ ہماری آہٹ پا چکا تھا۔ وہ اٹھا اور چھلانگ لگا کر جنگلے سے کود گیا اور دوسری جانب سڑک پر گر گیا۔ مگر یہ صرف ایک لمحے کے لیے تھا وہ فوراً اٹھا اور سڑک پار کرتا ہوا دوسری جانب لگے حفاظتی جنگلے سے کود کر جنگل کے دوسری جانب درختوں میں غائب ہو گیا۔ اب تو میری حیرانی کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ جنگلے کے قریب جہاں ہرن لیٹا تھا۔ خون کا تالاب بنا ہوا تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور پھر میرے منہ سے نکلا: ''بابا یہ ہرن ہے یا کوئی چھلاوہ......!'' بابا نے میری حالت دیکھ کر بے ساختہ قہقہہ لگایا اور بولے: ''میں نے کہا تھا ناں کہ یہ تمہاری سوچ سے بھی کہیں زیادہ جاندار ثابت ہو سکتا ہے...... ہمت کرو اور صبر سے کام لو...... آؤ ہم بھی جنگل کی دوسری طرف چلیں۔'' میں اور بابا جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جنگلے میں دروازے بنائے گئے تھے جو ہر کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ اس لیے ہم نے چھلانگ لگا کر جنگلے سے کودنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ جنگلا کافی اونچا تھا اور ہم زخمی بھی ہو سکتے تھے۔ سو ہم دروازے کی طرف بڑھے اسے کھولا سڑک پار کی اور دوسری جانب کے دروازے کو کھول کر جنگل کے دوسری طرف داخل ہو گئے۔ یہاں بھی خون کی دھار ہماری معاون ثابت ہو رہی تھی۔ جواب خاصی پتلی ہو گئی تھی اور پھر یہ قطروں میں تبدیل ہو گئی۔ اب ہمیں نہایت باریک بینی سے زمین کا معائنہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دوسری طرف کوئی پانچ سو گز دور جانے کے بعد ایک اور حفاظتی جنگلے کے پاس مجھے ہرن نظر آیا۔ اس نے اسے پھلانگنے کی کوشش کی مگر اس کی ہمت اور خون شاید ختم ہو چکا تھا۔ سو وہ اس جنگلے سے کود نہ سکا تھا۔ ہم جب ہرن کے قریب پہنچے تو بابا بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ ابھی تک زندہ تھا اور آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند لیں۔ بابا کی حس مزاح پھڑکی اور وہ مسکراتے ہوئے بولے: ''شاید یہ مرنے سے پہلے ایک نظر اپنے قاتل کو دیکھنا چاہتا تھا۔'' میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور بابا کے گلے لگ گیا۔ میرا شکار کردہ شاندار ہرن میرے سامنے تھا۔ میں بے حد پرجوش ہو گیا۔ بابا نے ہرن کے ساتھ میری ڈھیر ساری تصویریں بنا ڈالیں۔

میں ہرن کے خوبصورت سینگوں پر ہاتھ پھیر کر یقین کرنے لگا کہ واقعی یہ شاندار ہرن میں نے شکار کیا ہے۔ اس کے بعد بھی میں نے زندگی میں بہت سے ہرن شکار کیے۔ مگر اس ہرن کی ہمت اور زندہ رہنے کی اُمنگ اور آخری سانس تک جدوجہد کرنے کی اعلیٰ مثال ہمیشہ ایک سبق بن کر میرے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی سینگوں والی کھوپڑی میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں ٹنگی ہے جو شک...... میرے لیے اب بھی یہ ہرن کے شکار کی ایک ناقابل فراموش داستان ہے۔ ■■■

صرف 5 منٹ

شامی اخوان المسلمون کی خونیں سرگزشت

ہبہ الدباغ کی خودنوشت "صرف پانچ منٹ" کا مطالعہ

محمد تقی الاسلام ندوی (نئی دہلی)

سرزمین شام، جس سے اسلامی تاریخ کی عظمت رفتہ وابستہ ہے، گزشتہ دو سال سے خونِ مسلم سے لالہ زار ہے۔ یہاں انسان نما وحشی درندے ظلم و جبر، قتل و غارت گری اور انسانیت سوزی کی بدترین داستانیں رقم کر رہے ہیں۔ رپورٹوں کے مطابق تیس ہزار سے زیادہ افراد لقمۂ اجل بن چکے۔ بستیوں کی بستیاں ویران ہو گئی ہیں اور لاکھوں افراد ہجرت کر کے پڑوسی ممالک میں قائم پناہ گزین کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہبہ الدباغ کی خودنوشت قصص و حقائق و حسب، جس کا اردو ترجمہ 'صرف پانچ منٹ' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ دستاویزی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ شام کے اسلام پسند عوام پر انسانیت سوز مظالم کا یہ سلسلہ نیا نہیں ہے بلکہ گزشتہ چالیس سال سے برابر جاری ہے۔

اس کا آغاز شام کے موجودہ حکمران کے باپ حافظ الاسد نے کیا تھا۔ اس کا تعلق اشتراکی نظریات کی حامل بعث پارٹی سے تھا۔ اسی طرح وہ گمراہ علوی نصیری فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں مغربی کلچر اور اشتراکیت کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی اور اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے فوج اور انتظامیہ میں علویوں کو بھر دیا جب کہ شام کی غالب اکثریت سنی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی بنیادیں

بہت گہری تھیں اور وہ غیر اسلامی کلچر اور اقلیتی غلبہ سے سخت متنفر تھے۔

شامی اخوان المسلمون، جن کی سرگرمیاں مصر میں اس تحریک کی تاسیس (1964ء) کے کچھ عرصہ بعد ہی شروع ہو گئی تھیں۔ حافظ الاسد کے منصوبوں اور عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ وہ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ہر جگہ اس کی مخالفت میں پیش پیش رہتے تھے۔ اس لیے حافظ الاسد ان کی سرکوبی کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ 1970ء میں سنی مسلمانوں اور نصیریوں کے درمیان فرقہ وارانہ کشمکش برپا ہوئی تو بعثی حکومت نے اس کا ذمہ دار اخوان المسلمون کو قرار دے کر ان پر پابندی عائد کر دی اور یہ قانون منظور ہوا کہ اخوان سے وابستگی کی سزا پھانسی ہے۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر ان کے ارکان و وابستگان کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ جس پر بھی اخوانی ہونے کا شبہ ہوا اسے داخلِ زنداں کر دیا، جیلوں میں ان کے ساتھ بدترین تشدد کیا گیا۔ ہزاروں افراد کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے گولیوں سے بھون دیا گیا۔

جیلوں میں وقتاً فوقتاً قیدیوں کو فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ قتل و غارت گری کا نقطۂ عروج وہ واقعہ ہے جو دو فروری 1982ء کو شہر حمات میں پیش آیا تھا۔ اس شہر کو اخوان المسلمین کا گڑھ قرار دے کر اس کا محاصرہ کر لیا گیا اور ٹینکوں، توپوں، بکتر بند گاڑیوں اور بھاری اسلحہ کے ساتھ ہلہ بول دیا گیا۔ شہر میں زبردست تباہی مچائی گئی۔ پورے پورے محلے ان کے مکینوں کے ساتھ زمین بوس کر دیے گئے۔ اٹھاسی مسجدیں اور تین چرچ بالکل منہدم ہو گئے۔ شہر کا محاصرہ ستائیس روز تک جاری رہا۔ تقریباً چالیس ہزار افراد کو گولیوں سے بھون کر اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ پندرہ ہزار افراد کچھ پتا نہ چلا۔ گرفتاریوں، ایذا رسانیوں اور تشدد و بربریت کا یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ ہبہ الدباغ کی یہ خودنوشت اسی دور میں شام کے عقوبت خانوں میں اخوان المسلمون کے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر توڑے جانے والے دل دوز و الم ناک مظالم کی مختصر روداد ہے۔

ہبہ کا تعلق حمات کے ایک دین دار گھرانے سے تھا۔ وہ ماں باپ، سات بھائیوں اور چار بہنوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کے ماں باپ کوئی سیاسی وابستگی رکھتے تھے نہ خود ہبہ کسی پارٹی کی ممبر تھیں۔ صرف ان کا ایک بھائی (صفوان) اخوان المسلمون کا سرگرم کارکن تھا۔ اخوان پر پابندی عائد کر دیے جانے کے بعد ان کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو جو لوگ چوری چھپے ملک اردن نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ان میں وہ بھی تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں ہبہ حمات چھوڑ کر دمشق چلی گئیں اور وہاں یونیورسٹی کے شریعہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ رہائش کے لیے انھوں نے چند ہم جماعت لڑکیوں کے ساتھ مل کر ایک مکان کرائے پر حاصل کیا۔ ابھی ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا اور امتحان شروع ہونے والا تھا کہ 1980ء کی آخری تاریخ میں نصف شب خفیہ محکمے کے اہل کاروں نے ان کی رہائش گاہ پر دھاوا بولا، انھیں اور ساتھ ہی رہنے والی دو لڑکیوں (وجہا اور ملک) کو اپنے ساتھ تفتیشی دفتر لے گئے۔ لے جاتے وقت تو انھوں نے کہا تھا کہ صرف پانچ منٹ میں تفتیش کر کے واپس بھیج دیں گے۔ لیکن ان لڑکیوں کو عقوبت خانوں میں نو سال تک تعذیب و تشدد کے جاں گسل مراحل سے گزرنے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔

ہبہ پر الزام لگایا گیا کہ وہ اخوان کی آرگنائزر رہی ہیں، اس کا ترجمان مجلہ النذیر بانٹا کرتی ہے، سید قطب کے افکار پر مشتمل دروس قرآن دیتی ہے، اپنے پاس اسلحہ رکھتی ہے وغیرہ۔ حالانکہ وہ ان تمام الزامات سے بری تھیں۔ ان کا اگر کوئی جرم تھا تو بس یہ کہ وہ ایک اخوانی کی بہن تھیں۔ ان برسوں میں ہبہ پر کیا کچھ بیتی، اس کا تذکرہ انھوں نے تفصیل سے اپنی اس خودنوشت میں کیا ہے۔ اس کا خلاصہ انھوں نے کتاب کے مقدمے میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"میں اتنا عرصہ جیل کی کال کوٹھری میں اپنے بھائی کی رہین کے طور پر رہی جو ایک سیاسی کارکن تھا۔ میری زندگی کے بہترین سال قاتل وحشیوں کی نذر ہو گئے۔ میرے اعضا شل ہو گئے اور میری روح نے بڑھاپے کی چادر اوڑھ لی۔ صرف ایک افترا کے سبب جو مجھ پر باندھا گیا...... میں نو برس تک جیل کے ایک سیل سے دوسرے سیل، ایک بلاک سے دوسرے بلاک اور ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل ہوتی رہی۔ نو عجیب برس...... ان برسوں میں انسانی رحم کا ہر دروازہ مجھ پر بند کر دیا گیا۔ ان کی سزاؤں نے میرے اندر اٹھنے والی ہر امید کا دم توڑ دیا اور بنی نوع انسان سے متعلق ہوئی سی آس بھی معدوم ہو گئی، صرف اللہ سے امید زندہ رہی...... میں شام کی حکومتی جیلوں کے جہنم میں نو برس تک بلاقصور کسی اور کی رہین کے طور پر جلتی رہی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ عمر عزیز کے نو برس اس ملعون نظام میں کس طرح بیتے۔ جو کچھ پیش آیا اس کی حقیقی تصویر کشی سے یہ قلم عاجز ہے۔" (ص 22-25)

یہ صرف ایک خاتون کے ایامِ اسیری کی آپ بیتی نہیں ہے بلکہ اس میں بے شمار معصوم خواتین کی داستانِ الم آ گئی ہے۔ ان خواتین کا جرم اگر کچھ تھا تو بس یہ کہ ان میں سے کوئی کسی اخوانی کی ماں تھی، کسی کی بہن، کسی کی بیوی اور کسی کی بیٹی یا انھوں نے کسی اخوانی کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔ اس خودنوشت میں مصنفہ نے ان میں سے بہت سی خواتین کا تذکرہ نام بہ نام کیا ہے۔ مثلاً

الحاجہ مدیحہ، چالیس کے پیٹے میں تھیں، بالکل ان پڑھ، مگر وہ حلب کی مشہور شخصیت تھیں۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے اپنے گھر کا ایک حصہ ہاسٹل کی طرح بنا رکھا تھا جس میں رہنے والوں میں سے کچھ لوگ حکومت کو مطلوب تھے۔

الحاجہ ریاض، چالیس برس کی، غیر شادی شدہ، سیدھی سادی خاتون۔ الزام یہ کہ انھوں نے اخوان کے مصیبت زدہ بعض خاندانوں تک کچھ بہی خواہوں کی دی ہوئی رقم پہنچائی تھی۔

عائشہ کا تعلق حلب سے تھا اور پیشے سے ڈاکٹر تھی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے حکومت کے خلاف سرگرم کچھ زخمی نوجوانوں کا علاج کر دیا تھا۔

منیٰ، پینتیس، چھتیس سال کی خاتون، تین بچوں کی ماں، اس نے ایک اخوانی کو پناہ دے دی تھی۔ اس

جرم میں اسے، اس کی بہن، بھائی اور باپ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

حلیمہ، پینتیس برس کی دیہاتی خاتون، پانچ بچوں کی ماں، جن کی عمریں چار سے نو برس کے درمیان تھیں۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے حکومت کو مطلوب کچھ افراد کو اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔

منتہیٰ، سولہ برس کی دوشیزہ، شوہر کو حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔ خفیہ پولیس نے اس کی شیرخوار بچی کو پرے پھینکا اور اسے گرفتار کر کے داخلِ زنداں کر دیا۔

عزوہ، حمات کی رہنے والی ماہر دندان خاتون۔ جرم یہ کہ اس نے ایک گھر خریدنے میں اخوانی نوجوانوں کی مدد کی تھی۔

مطیعہ، عمر تقریباً چالیس سال، چار بچوں کی ماں، شوہر اخوان کے حامیوں میں سے تھے۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ فرار ہو گئے تو اسے پکڑ لیا گیا۔ وہ اس وقت حمل سے تھی، دوران اسیری جیل میں اس کے یہاں ولادت ہوئی۔

ام ہیثم، شوہر اور چار بچوں کے ساتھ اخوان کے حامیوں میں سے ایک کے گھر کرائے پر رہتی تھیں۔ خفیہ پولیس نے چھاپہ مارا تو سب کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کر لیا پھر شوہر کو اسی قید خانے میں قتل کر دیا۔

نجویٰ، حلب کے میڈیکل کالج میں سال دوم کی طالبہ۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ ایک اخوانی کی منگیتر تھی۔

تفتیشی مراکز اور جیلوں میں ان خواتین کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اور وحشت و بربریت کا جو ننگا ناچ دکھایا گیا وہ خون کے آنسو رلانے والا ہے۔ کیا کوئی انسان اس حد تک نیچے گر سکتا ہے۔ ہبہ الدباغ نے اپنی خودنوشت میں اپنے ساتھ پیش آنے ظلم و تشدد کی روداد تفصیل سے بیان کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایک اہل کار نے مجھے لکڑی کے تختے پر لٹا کر میری گردن، کلائیاں، پیٹ، گھٹنے اور پاؤں اس سے باندھ دیے اور مجھے الٹا لٹکا دیا۔ میرے پاؤں فضا میں تھے اور ان سے کپڑا ہٹ چکا تھا صرف جرابیں ان کو ڈھانپ رہی تھیں۔ اہل کار پوری قوت اور غضب سے چلایا: سرا دیکھیے، آپ نے نوٹ کیا؟ یہ کہتی ہے یہ اخوانی نہیں لیکن اس نے اپنے آپ کو مکمل ڈھانپ رکھا ہے ان ہی کی طرح، اس ٹکٹکی پر بھی اس کا ستر قائم ہے۔" (ص:53)

تفتیش کا ایک اور انداز ملاحظہ کیجیے:

"تفتیشی افسر کے ہاتھ میں مربع شکل کا بجلی کا بورڈ اور پلگ تھا اور ایک ہاتھ نما چیز تھی، جس پر کلپ لگے ہوئے تھے۔ اس نے کلپ میری انگلی کے ساتھ لگا کر اس میں کرنٹ چھوڑ دیا اور ڈنڈے سے میرے پاؤں کے درمیان میں ضرب لگائی۔ ایسا لگا جیسے میرے پورے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ میری چیخوں کو خاطر میں لائے بغیر بولا:

"ہوں...... تمھیں بکواس کرنی پڑے گی۔"

میں چلائی: "میں کہہ چکی ہوں، میرے پاس اعتراف کرنے کو کچھ نہیں۔"

وہ سرد مہری سے بولا: "تم نے دیکھا نہیں کہ بجلی کی طاقت کیا ہوتی ہے؟ یہ ہمارے پاس سب سے ہلکا ٹارچر ہوتا ہے۔" میں نے کہا: اگر ایسا ہی ہو تو بھی

کیا میں ان چیزوں کا اعتراف کر دوں جو میں نے نہیں کیں؟"

اس پر وہ بولا: "تم جھوٹ کہہ رہی ہو اور ہم سے [illegible] تمھیں ابھی ہمارے ساتھ جانا ہوگا اور اس [illegible] نشان دہی کرنی ہوگی جہاں تمھارا بھائی اور اس کے ساتھی رہتے ہیں۔ ورنہ ہم تجھے ہلاکت تک پہنچا دیں گے۔"

میرے انکار پر تعذیب کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ آپریشن ہیڈ پوری قوت سے میرے پاؤں پر کوڑے برسانے لگا۔ پاؤں پر ضرب پڑنے سے پہلے اس کی سنسناہٹ سنائی دیتی۔ ایک اور اہل کار اپنے بید کے ساتھ تعذیب دینے میں شریک ہو گیا۔ دوسرا اہل کار میرے سر کی جانب کھڑا ہو کر میری انگلیوں پر سے کرنٹ لگانے لگا۔ اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ اس کو الفاظ میں نہیں بیان کر سکتی۔ شروع میں چیخ رہی اور میری زبان پر 'یا اللہ' کا کلمہ جاری رہا۔ لیکن کچھ دیر بعد آواز نکالنا بھی میرے بس میں نہ رہا۔ میں سر پٹخ رہی اور مجھے کسی بھی چیز کا احساس نہ رہا۔" (ص:53-59)

تفتیشی سیل میں ٹارچر کے ایسے ہی وحشیانہ طریقے دیگر خواتین کے ساتھ بھی اختیار کیے جاتے تھے جیسے کہ ان کا تذکرہ اپنی کتاب میں جا بجا کیا ہے۔ ان کے مطابق کپڑے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے۔ تھپڑوں، گھونسوں، کوڑوں اور ڈنڈوں کی بارش کی جاتی، انگلیوں پر شدید ضربیں لگائی جاتیں اور ناخن کھینچ کر اکھاڑ دیے جاتے، سگریٹ سلگا کر پوشیدہ اور نازک اعضاء کو جلایا جاتا، بالوں کو پکڑ کر کھینچا جاتا اور سر کو دیواروں اور زمین پر پٹخا جاتا، ٹکٹکی پر باندھ کر الٹا لٹکا دیا جاتا، بے ہوش ہونے پر پوری قوت سے پانی انڈیلا جاتا، جس سے بسا اوقات قیدی کے کان کے پردے پھٹ جاتے۔ بجلی کے کرنٹ لگائے جاتے۔ اس طرح کے اور بھی بے شمار وحشیانہ طریقے تھے جن کے ذریعے ملزم کو ناکردہ جرم قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جرم نہ قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ مسلسل ان اذیتوں سے دوچار رہے اور جرم قبول کرنے کا نتیجہ لازماً سزائے موت تھی۔

یہ تو خواتین پر مظالم کا حال تھا۔ اخوان کے مردوں کا حال اور بھی برا تھا۔ وہ ان جلادوں کی نظر میں کسی ہمدردی کے مستحق نہ تھے۔ ان کو سخت سے سخت اذیتیں دینے کی کھلی چھوٹ حاصل تھی۔ انھیں ہر طرح سے مشقِ ستم بنایا جاتا، ان کے ساتھ جانوروں جیسا بلکہ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا۔ کتاب سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"بلاک میں قیدیوں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اگر ایک خاتون کروٹ لینا چاہتی تو پورے بلاک کی خواتین کو حرکت دینا پڑتی۔" (ص:83)

"اگر ہم اپنی حالت کا مقابلہ نوجوان مرد قیدیوں سے کرتے تو وہ بالفعل جہنم میں رہ رہے تھے۔ جب بلاک میں خواتین قیدیوں کی تعداد دس سے زیادہ ہو جاتی اور ہم دم گھٹنے کی شکایت کرتے، اس وقت ان کے ایک ایک بلاک میں پچاس سے زیادہ گرفتار ان بلا ہوتے اور انھیں دن میں بھی سانس لینا دشوار محسوس ہوتا اور رات کو سونے کے لیے پاؤں دیوار کے ساتھ اونچے کر کے صرف کمر زمین پر رکھ کر سوتے اور اس میں بھی

انھیں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔" (ص:115)

"ایک روز اہل کاروں نے ایک مسکین کو کمرۂ تعذیب سے نکال کر ہمارے بلاک کے سامنے ڈالا تاکہ اسے دوسری جگہ منتقل کر کے باقی کی پوری کر سکیں۔ اس کا چہرہ اور بدن زخموں سے چور تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور جسم سے خون رس رہا تھا۔ وہ گڑگڑا کر پانی کا ایک گھونٹ مانگ رہا تھا۔ لیکن اسے جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد ہم نے کچھ پانی بلاک سے باہر زمین پر بہا دیا اور اس نے زمین سے چاٹ لیا۔" (ص:120)

"ایک دفعہ ہم نے دیکھا کہ وہ ایک دیہاتی کو پکڑ لائے اور اسے برہنہ کر دیا۔ اہل کار دونوں جانب کھڑے ہو گئے اور ڈنڈوں اور لاتوں سے اس کی درگت بنانے لگے۔ وہ اسے فٹبال کی طرح کبھی ایک طرف بھگاتے اور کبھی دوسری جانب۔ وہ بھی تیزی سے بھاگتا اور کبھی سست پڑ جاتا، حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر غسل خانوں میں لے گئے۔ وہ کبھی اس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالتے اور کبھی تیز گرم۔ وہ مسکین بڑی بے بسی سے چیختا چلاتا رہا۔ کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔ گویا وہ بھیڑ بکری ہو قصابوں کے بیچ میں۔" (ص:119)

"جب نوجوانوں کو ہوا خوری کے لیے باہر نکالا جاتا تو وہ بھی بڑا الم ناک وقت ہوتا۔ تعذیب کے باعث وہ سیدھے کھڑے نہ ہو سکتے۔ تار چر سے ان کے پاؤں اس قدر سوج چکے ہوتے کہ اس سردی میں بھی وہ جوتا نہ پہن سکتے اور ننگے پاؤں چل رہے ہوتے۔ ان کو ہانکنے کے لیے مسلسل کوڑا برسایا جاتا، وہ جانور ہوں۔ ان کے رنگ اتنے زرد ہو چکے تھے کہ ان کے جسموں سے روشنی نکلتی محسوس ہوتی تھی۔

اب تک یاد ہے کہ ایک نوجوان نے بیت الخلا میں دیر لگا دی۔ اہل کار نے اسے وہیں مارنا شروع کر دیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ گندگی اپنے منہ میں ڈالے۔ وہ اسے مسلسل زنجیروں سے مار بھی رہا تھا اور گندے مطالبات بھی کر رہا تھا۔ وہ اس کا منہ زمین پر بھی رگڑ رہا تھا۔ بے چارہ قیدی مدد کے لیے فریاد کر رہا تھا مگر اسے بچانے والا کوئی نہ تھا۔" (ص:256-257)

دوران اسیری ہی زینب کو حماۃ کے قتل عام (فروری 1982ء) کے موقع پر اپنے پورے خاندان کی شہادت کی خبر ملی۔ اس واقعہ کو پیش آئے اگرچہ آٹھ ماہ گزر چکے تھے لیکن اس کا علم اس وقت ہوا جب قطنا جیل میں خواتین کے رشتہ داروں کو ان سے ملاقات کی اجازت ملی۔ اس کی تفصیل خود ہبہ کی زبانی سنیے:

"حماۃ کا رابطہ بیرونی دنیا سے مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا۔ اس کی شاہراہیں ذبح خانوں میں تبدیل ہو گئیں اور اس کے باشندے سیکڑوں کی تعداد میں شہید ہونے لگے۔ بجلی، پانی اور خوراک پہنچنے کے راستے بند کر دیے گئے۔ یہ محاصرہ سات دن تک جاری رہا۔ جب گھر میں کھانا اور پانی بالکل ختم ہو گیا تو میرے ابا جان باہر نکلے اور حکومتی اہل کاروں سے درخواست کی کہ بچوں کے لیے کھانا دے دیں۔ خواہ روٹی کا ایک ٹکڑا ہو۔ اس کے جواب میں ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور ابا جان خون میں لت پت زمین پر گر پڑے۔ میری امی ان پر روتی ہوئی باہر نکلیں۔ وہ ابھی دروازے تک ہی پہنچی تھیں کہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ پھر وہ گھر کے اندر داخل ہو گئے اور وہاں جو بھی نظر آیا اس کا کام تمام کر دیا۔

میرا بھائی چار برس کا تھا، قمر پانچ سال کی تھی، رنا چھٹے برس میں تھی اور سات برس کی صفا نے نیا نیا اسکول جانا شروع کیا تھا۔ ان سب کو مارنے کے بعد میری تین سال کی بہن نضال کو بھی شہید کر دیا۔ میرا چودہ برس کا بھائی عامر اور بارہ برس کا بھائی ماہر بھی انھی حادثات کے دوران شہید ہوئے۔ سب نے اٹھتے ہی اپنی نذر پوری کر دی اور ان کے لاشے یوں ہی بے گور و کفن پڑے رہے۔ اس واقعہ سے کچھ دن پہلے حلب میں میرے بھائی وارف، جس کی عمر اٹھارہ برس تھی، کی شہادت کا سانحہ پیش آ چکا تھا۔ اس طرح مجھے والدین اور آٹھ بہن بھائیوں کی شہادت کی خبر ایک ساتھ ملی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خبر کا مجھ پر ایسا اثر نہ ہوا جیسا میری ساتھی دیگر خواتین کو ہو رہی تھیں۔ اللہ نے مجھے اس ناگہانی خبر پر صبر اور حوصلہ دیا۔ کیونکہ یہ سب ان شاء اللہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوں گے اور شہادت کی آرزو تو ہر مسلمان کرتا ہے۔" (ص:171-176، بہ تلخیص)

مصر میں اخوان المسلمون پر توڑے جانے والے مظالم کے تذکرے پر مشتمل متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور ان کا دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ لیکن دیگر مسلم ممالک اور خاص طور پر شام میں اخوان کے ناگفتہ بہ حالات کا دنیا کو بالکل علم نہ تھا۔ ہبہ الدباغ انتہائی شکریے کی مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑے مہذب اسلوب اور ادبی پیرائے میں اپنی خود نوشت لکھ کر ان کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ، جسے بیان الخطیب نامی خاتون نے کیا ہے، کینیڈا سے "Just Five Minute" کے نام سے 2007ء میں شائع ہوا ہے۔ اردو ترجمہ "صرف پانچ منٹ" کے نام سے میمونہ حمزہ نے کیا ہے اور اسے 2012ء میں لاہور کے مشہور اشاعتی ادارے "منشورات" نے شائع کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور اس کا ترجمہ دیگر زبانوں میں بھی کیا جائے تاکہ اجتماعی شعور بیدار ہو اور دنیا کو شام کی بعثی حکومت کے انسانیت سوز مظالم سے واقفیت ہو سکے۔

گرڈ سسٹم (Grid Sysytem)

گرڈ سسٹم دراصل ایک ایسا سسٹم ہے جس میں تمام گلیاں ایک صحیح زاویہ (Right Angle) میں ہوتی ہیں۔ اس میں شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب سے سڑکوں کو آپس میں ملایا جاتا ہے۔ پہلی بار گرڈ سسٹم 2600ق م میں دریائے سندھ کے کنارے آباد موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیبوں میں استعمال ہوا۔ موہنجوداڑو کے کھنڈرات سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت کے لوگ بھی کافی سمجھ دار تھے وہ صرف مکانوں کو سورج کی مناسب روشنی اور ہوا کے دباؤ کے حساب سے تعمیر کرتے بلکہ سڑکوں اور گلیوں کو ایک سسٹم کے تحت بناتے۔ اسی سسٹم کو بعد میں دنیا بھر کے جدید شہروں کو آباد کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ 1959ء میں تعمیر کردہ پاکستان کے دارالخلافہ اسلام آباد کی جدید شکل اور اس میں بلاک سسٹم دراصل اسی گرڈ سسٹم کی بدولت ہے۔

(مریم نور۔ لاہور)

کیا بندر کے ہاتھ میں چھری آ گئی ہے؟

عمیر محمود

بے مہار سیاسی طنز و مزاح، عامیانہ فقرے بازی اور فحش گوئی..... یہ ٹی وی شو ہے یا اسٹیج ڈراما؟

"تمہارا منہ ایسا ہے، جیسے کوئی اونٹ بوسہ لے رہا ہو" یہ جملہ پنجابی میں کہا گیا تھا، ایک معتبر نیوز چینل سے نشر ہونے والا ایسا عامیانہ فقرہ مجھے چونکا گیا۔ یوں لگا جیسے تھیٹر پر پیش کیا جانے والا کوئی ڈراما دیکھ رہا ہوں۔ فقرہ ادا کرنے والے نے پھر ایسا ہی منہ بنا کے بھی دکھایا، جو اونٹ کا تو کم از کم نہیں لگ رہا تھا، یہ اور بات ہے کہ ہم نے کبھی اونٹ کو بوسہ لیتے دیکھا نہیں۔

نیوز چینلز دن رات عوام کو خبروں سے آگاہ رکھتے ہیں۔ اپنا مواد متنوع رکھنے کے لیے انہیں کچھ ہلکی پھلکی اور مختلف قسم کی چیزیں مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خبروں پر مزاحیہ انداز میں تبصرہ، کامیڈی اور پیروڈی مستقل بھی تھی اور مقبول بھی، لہٰذا نیوز چینلز نے بھی اسی انداز کے پروگرام شروع کر دیے۔ عوام میں پذیرائی ملی تو مزاحیہ پروگراموں کی مانگ میں بھی اضافہ ہوا۔ دیکھنے والے مزید تنوع بھی مانگنے لگے۔ ویسے بھی ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ جب پیروڈی کے لیے سیاستدان کم پڑ گئے، تو دیگر شعبہ زندگی میں کام کرنے والے افراد کی باری آئی۔ صحافیوں کی بھی پیروڈی کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ ایک چینل پر چلنے والے پروگرام میں اسی چینل کے صحافیوں اور اینکروں کو ہدف بنا لیا گیا۔

پیروڈی منفرد تھی، اس لیے عوام نے اسے سراہا بھی۔ چینل کے کھلے دل کی بھی تعریف کی گئی، کہ اپنے ہی افراد کی پیروڈی پر برا نہیں مناتا۔ عوامی زبان میں کہا گیا "اپنے ہی بندوں کو رگڑ دیتا ہے، بڑی بات ہے۔" پھر یہ سادہ پیروڈی بھی اپنا مزہ کھونے لگی، تو کچھ درمیانے درجے کے کالم نگار اپنی دکان لے کر آن براجے۔ انہوں نے تو سٹیج ڈراموں میں کام کرنے والے افراد کو اس میدان میں "اتارا"۔ پھر تو ایسے ایسے جملے بھی نیوز ٹی وی کے ناظرین تک پہنچے

"تمہارا چہرہ لنڈورے سانپ جیسا ہے"

"تم ایسے لگ رہے ہو جیسے کوئی سڑی ہوئی گوبھی ہوتی ہے۔" کسی دوسرے کا مذاق اڑاتے ان جملوں کو جگت کہا جاتا ہے۔ لیکن مزاح پیدا کرنے کے لیے نہ تو کسی کی صورت کو بخشا گیا، نہ جسمانی خدوخال کو۔ مثلاً، کسی لمبی ناک والے سے گفتگو کرتا ہے تو اسے کہا گیا

"تمہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے طوطے کی حجامت کی گئی ہے"

کسی دبلے شخص کو کمزور کہنا مقصود ہے تو کہا گیا

"اسے دیکھ کر لگتا ہے تیتر کو ٹی بی ہوئی ہے"

یہی نہیں، پروگرام میں شرکت کرنے والے مہمانوں کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ کسی مہمان کو برفانی ریچھ کہہ دیا جاتا ہے، کسی خاتون کو جنگل کی میڈونا، یا [illegible] جیکسن۔

مزاح کے پردے میں سیاستدانوں، صحافیوں اور اداکاروں کی تضحیک شروع کی گئی۔ نہ کسی کے مقام کا لحاظ کیا گیا نہ بزرگی کا، کسی کی مونچھیں نشانہ بنیں، تو کسی کی آواز۔

اکثر اوقات شائستگی کا دامن بھی تار تار ہوا، کردار ایک دوسرے کو "انی دیا" یعنی اندھی ماں کا بیٹا کہہ دیتے۔ پھپھی، چاچی، تائی جیسے رشتوں کا ذکر تواتر سے پوری بے احترامی کے ساتھ ہونے لگا۔

"خبرناک" کے ایک کردار نے میزبان آفتاب اقبال سے تضحیک آمیز مذاق کے حوالے سے سوال کیا۔

"تضحیک ہوتی ہے، میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن اس پر بتدریج قابو پایا جا رہا ہے۔ پہلے ہم کامیڈی برائے کامیڈی کیا کرتے تھے، جیسے کہ کوئی بزرگ سیاستدان آ گیا ہے تو اور کچھ نہیں تو اس کی ٹنڈ پر گفتگو شروع ہو جاتی تھی، اس کے بالوں پر، اس کی رنگت پر، اس کی آواز پر، تو اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب ہم اور [illegible] مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔"

جن شخصیات کی نقل کی جاتی ہے، ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی؟ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ سیاستدان اسے اچھا سمجھتے ہیں، اس سے ان کے بارے میں "سافٹ امیج" جاتا ہے۔ ہم نے شیخ رشید صاحب سے رابطہ کیا۔ وہ ایسے پروگراموں میں مذاق کا نشانہ بنتے ہیں۔ شیخ صاحب نے ہمارے سوال پر جھنجلایا ہوا سا جواب دیا "دیکھیں جی، ان کی جو مرضی کرتے رہیں، بس خوش رہیں، میں تو کامیڈی شو دیکھتا ہی نہیں۔"

سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کا معاملہ اس سے مختلف رہا۔ ان کی وزارت عظمیٰ کے دوران ایک کامیڈی گانا بنایا گیا، شیلا کی جوانی، پی ایم یوسف رضا گیلانی۔ یوسف رضا گیلانی نے خود پروگرام کے پروڈیوسر کو فون کر کے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

نجم سیٹھی بھی ایک معروف صحافی ہیں اور اسی وجہ

سے مختلف پروگراموں میں ان کی مضحکہ خیز نقل کی جاتی ہے۔ ان سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی پیروڈی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان میں حسِ مزاح ہونا چاہیے، اسے خود پر ہنسنا آنا چاہیے۔ اسی خوش گوار اور دھیمے انداز میں نجم سیٹھی کا ایک اعتراض بھی تھا ''لیکن بہرحال، مزاح میں فحاشی نہیں ہونی چاہیے اور اسے تخلیقی ہونا چاہیے۔''

اگر یہ پروگرام اچھی ریٹنگ دیتے ہیں تو تنقید چہ معنی؟ معروف صحافی حامد میر اس سے متفق نہیں۔ ان کا کہنا تھا انھوں نے کبھی ریٹنگ کو ذہن میں نہیں رکھا اور اسے مانتے بھی نہیں، یہ صرف بڑے شہروں میں چند ہزار لوگوں کی رائے پر مشتمل ہوتی ہے۔ جگت بازی کے رجحان پر طنز کرتے ہوئے حامد میر نے کہا ''میں اگر کسی سیاستدان کو اپنے پروگرام میں کہہ دوں جا تجھے منہ میرا، تو ریٹنگ اوپر چلی جائے گی۔''

میڈیا سے متعلق دیگر شخصیات بھی مزاحیہ پروگراموں پر اظہارِ خیال کرتی رہی ہیں۔ طلعت حسین نے کہا مزاح کے ذریعے تنقید سنجیدہ صحافت کا لطیف پہلو رہا ہے۔ اخبارات میں کارٹون کے ذریعے جو تنقید ہوتی ہے وہ ٹی وی پر کی جانے والی تنقید سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ یہ صحافت کا عمدہ ہتھیار ہے اور رہے گا۔ سیاستدانوں کا مذاق اڑائے جانے پر طلعت کا موقف دوٹوک تھا: ''سیاستدان خود بھی تو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔'' صحافی طاہر سرور میر کہتے ہیں سیاسی طنز و مزاح کے پروگرام میں سلیقے سے بات کرنے، جگت، اور گالی کے درمیان بہت باریک سی لائن ہے۔

آفتاب اقبال صاحب! آپ نے ہمارا دل بہت دکھایا!

ان مزاحیہ سیاسی پروگراموں کے ایک ناظر زاہد بلال بھی ہیں۔ آپ جامعہ گجرات میں علوم ابلاغیات کی تعلیم دیتے ہیں۔ نقش گوئی سے قطع نظر، زاہد بلال کو ان پروگراموں میں تضحیک کا پہلو نظر نہیں آتا۔ وہ سمجھتے ہیں ایسے پروگراموں نے عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا ہے۔ لوگوں کو موقع ملا ہے کہ وہ سیاستدانوں کو جانچ سکیں۔ کسی سیاسی سرگرمی کا مذاق اڑایا جائے تو لوگ زیادہ

دلچسپی لیتے ہیں۔

احمد قریشی نے ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں خوب نام کمایا ہے۔ کہتے ہیں ان پروگراموں میں صرف ''حسبِ حال'' ایسا ہے کہ مزاح بھی خوب ہے اور طنز بھی، لیکن دکھ دینے والی کیفیت نہیں ہوتی۔ بھانڈپن نہیں ہے ورنہ جیو ٹک ٹاک کی طرح کا ایک اور پروگرام بھانڈوں سے بھر دیا گیا ہے۔ ''مسئلہ کیٹ'' میں تو دیدار نامی ایک اداکارہ کو بھی میزبانوں کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ کوٹ لکھپت کے رہنے والے محمد شہباز جو بہت سال ملک سے باہر رہ کر آئے ہیں نے کہا فور مین شو بھی بہت اچھا تھا۔ ڈاکٹر یونس بٹ کے چھوڑنے سے اس کا معیار ہی گر گیا۔ محمد شہباز نے کہا ''حسبِ حال'' میں میزبان جنید کا لہجہ اور دھیما انداز بہت اچھا ہے۔ ناجیہ کی ہنسی کا بھی مذاق اڑایا جاتا ہے مگر اب وہ اس پروگرام کا لازم حصہ ہے حتیٰ کہ لوگوں نے اس کی ہنسی کی رنگ ٹون تک بنا رکھی ہے۔ عزیزی (سہیل احمد) بہت منفرد انداز میں تنقید اور طنز کرتے ہیں۔ ''عزیزی'' کی مقبولیت عوام اور خواص میں ہو چکی ہے۔

محمد محسن اسلم اے لیول کے طالب علم ہیں۔ محسن کو اس پروگرام کے ایک کردار حکیم کی بے عزتی پر بہت مزا آتا ہے۔

ہمارے ذہن میں پھر بھی سوال کلبلانے لگا، کہ آخر کسی کی بے عزتی کر کے ہی کیوں مزاح پیدا کیا جاتا ہے؟ کیا یہ ''سستی کی انتہا'' ہوتی ہے؟ جواب کی تلاش ہمیں سلیم البیلا اور حنی البیلا کے پاس لے گئی۔ یہ اسی پروگرام ''خبرناک'' میں کردار ادا کرتے ہیں۔ سلیم البیلا نے کہا کہ وہ کامیڈی اصلاح کے لیے کرتے ہیں۔ حنی البیلا نے کہا کہ وہ خیال رکھتے ہیں مذاق نامناسب نہ ہو۔

حنی البیلا کا کہنا تھا کہ بعض اوقات مہمان خود فرمائش کر کے خود پر جگتیں لگواتے ہیں۔ اس طرح کیمرہ ان کا کلوز شاٹ بناتا ہے اور وہ نمایاں ہوتے ہیں۔ تاہم کوئی بھی مذاق کرتے ہوئے وہ خود اخلاقیات کا خاصا خیال رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اندر بھی ایک عدد سنسر نافذ کر رکھا ہے، اور محتاط رہتے ہیں کہ کوئی بات حد سے نہ گزرے۔ عوامی مسائل کا غصہ وہ سیاستدانوں کا مذاق اڑا کر نکالتے ہیں۔ اپنی کامیڈی کے ذریعے وہ عوام کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں بھی بتاتے ہیں۔ حنی البیلا کے خیال میں سخت بات کو مزاح کے انداز میں کرنے سے اس کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایسی ہی بات ہم سے عمر بلال نے بھی کی۔ یہ ایکسپریس نیوز میں سینئر ایسوسی ایٹ پروڈیوسر ہیں۔ وہ ارباب بست و کشاد کا مذاق اڑائے جانے پر خوش ہیں کیونکہ ''لیڈر بھی تو پینسٹھ سال سے عوام کا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

ڈاکٹر فیصل جاوید کا کہنا ہے کہ ہم سب امید سے ہیں نے بڑی عمدگی سے اپنا مقام بنایا ہے۔ ڈاکٹر یونس بٹ نے بار بار تبدیلیوں سے اسے پسندیدہ بنا دیا ہے۔ ہندوستانی گانے لگتے تو اچھے ہیں مگر اندر سے ہمیں بڑے بُرے اور بے ہودہ بھی لگتے ہیں۔

ساتھ وہ اینکرز کو تنبیہ کرتے ہیں کہ مذاق کو ایک حد میں رکھا جائے۔ کسی کی رنگ، نسل، زبان کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ انھوں نے ایک شو کی مثال پیش کی جس میں چینی شخص کو پھینا کہا گیا۔

اس بارے میں ہماری غیر رسمی سی گفتگو علی میر سے بھی ہوئی۔ یہ کامیڈی پروگراموں کے دوران ہر

قسم کے کردار میں بخوبی ڈھل جاتے ہیں، انداز کے ساتھ ساتھ آواز کی بھی بخوبی نقل اتارتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو مذاق وہ اپنے گھر میں نہیں کر سکتے، اسے ٹی وی پر کرنا بھی برا سمجھتے ہیں۔ مذاق فحاشی کی حد میں نہ چلا جائے، اس بارے خود سے بھی محتاط رہتے ہیں۔ تاہم ایک مزاحیہ پروگرام کے لیے کام کرتے ہوئے بہر حال انھیں لوگوں کو ہنسانا ہے۔ اور

عزیزی کی مقبولیت ہر جگہ ہے!

آج کل کے ناظرین کو ہنسانے کے لیے عام... کافی نہیں ہوتا۔ انہیں کوئی نہایت اچھوتا مذاق... ہوتا ہے تاکہ پروگرام میں موجود لوگ اور... والے دل کھول کر ہنسیں۔ خصوصاً اس وقت وہ... دوچار ہو جاتے ہیں جب پروگرام کے دوران... کوئی زوردار فقرہ چست کیا جائے، اس وقت... بھی اتنا ہی تگڑا جواب دینا ہوتا ہے۔

یہ شوز عوام میں مقبول ہیں، تو کیا اسی کو کافی... جائے؟ یہ سوال ہم نے کیا محمد حنیف سے، جو جیو... کے مقبول اینکر ہیں۔ حنیف کا کہنا تھا "میرے خیال... طنز و مزاح کے ان پروگراموں نے لوگوں کو تفریح... ایک نیا انداز ضرور دیا ہے، مگر ہمیں یہ سوچنا ہو... ذومعنی جملوں اور سٹیج ڈراموں کی زبان میں یہ... کہیں اخلاقیات کی حدوں کو پار نہ کر جائے۔ بہرحال نیوز چینلز کو لوگ رہنمائی اور معلومات کا... ذریعہ سمجھتے ہیں، اس کا خیال رکھنا اور اس ذمہ دا... سمجھنا سب کی ذمہ داری ہے۔"

ثوبیہ عابد بھی علوم ابلاغیات کی مدرس ہیں... سیاسی طنز و مزاح کے پروگراموں کو کیتھارسس کا... سمجھتی ہیں۔ ثوبیہ کہتی ہیں "دنیا بھر میں مزاحیہ... سے تنقید کی جاتی ہے، ہاں یہ سب کچھ ایک حد... رہتے ہوئے ہی ہونا چاہیے۔"

"کیونکہ ہم عموماً حکمرانوں سے مرعوب رہتے... ان کی پالیسیوں سے ہم متفق نہیں ہوتے لیکن انھیں... کہہ نہیں سکتے۔ ایسے میں جب انہیں مزاح کا... بنایا جاتا ہے تو ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

سیاسی طنز و مزاح کے پروگراموں کے... لوگوں کی رائے جاننے کے لیے ہم نے آن لائن...

پر بھی سوال پوچھا۔ مجتبیٰ نامی ایک صاحب کا تبصرہ کافی معنی خیز تھا۔ ان کا کہنا تھا یہ پروگرام ایسے ہی ہیں جیسے "بندر کے ہاتھ میں چھری آجائے۔"

جاوید شیخ نامی صاحب کا تبصرہ خاصا دلچسپ تھا۔ انھوں نے لکھا "پاکستان کے میڈیا پر سیاستدانوں کا مذاق اڑا کر روزی کمانے والے فن کاروں اور اینکروں کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ مزاح کی دوڑ اور بھانڈ پن کے جمعہ بازار میں ادا کی جانے والی ٹاکروں کا سارا ثواب کس کو پہنچ رہا ہے۔ پاکستان میں فوجی جرنیل بھی تو سیاستدان ہوا کرتے تھے، ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟"

ہم نے جاوید شیخ صاحب کے آخری فقرے کو یہاں نقل تو کر دیا لیکن اس سے متفق نہیں ہیں۔ ہمارا میڈیا فوج سے سیاست میں آئے افراد کا ذکر کرتا ہے اور متواتر کرتا ہے۔

نتیجہ ہماری گفتگو کا یہ نکلا، کہ سیاسی طنز و مزاح پر مبنی پروگرام عوام میں مقبول ہیں۔ اور یہ پروگرام پیش کرنے والوں کی مجبوری ہے کہ وہ اپنے مواد کو زیادہ سے زیادہ متنوع اور جاذب نظر بنائیں۔ ایسا کرتے ہوئے کچھ لوگ تجربات کرتے ہیں، کچھ لوگ محنت کرتے ہیں اور کچھ آسان راستہ اختیار کرتے ہیں۔ خیال اسی بات کا رکھنا چاہیے، کہ مزاح لطیف رہے، پھکڑپن نہ بن جائے۔ کسی کی پالیسیوں سے اختلاف اپنی جگہ، اس پر فقرے چست کرنا بھی درست، لیکن مدنظر یہ بھی رہے، کہ اس قسم کی بازاری گفتگو، کسی کے جسمانی عیوب کا ٹھٹھہ کرنا، ذومعنی فقرے کسنا کہیں روایت نہ بنتی چلی جائے۔ ہر وقت اور ہر وقت خود احتسابی کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے، مزاح اور فحاشی میں نہایت باریک سی لکیر ہوتی ہے، دیکھا جائے کہ جو بات ہو وہ مزاح کی حد میں ہی رہے۔

معیاری مزاح کیا ہے اور غیر معیاری کیا؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا، اور جب فیصلہ ہو گیا تو عمل درآمد کون کرائے گا۔ میڈیا اور ارباب بست و کشاد اس بات پر فی الحال تو غور کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔

اس فیچر کے لیے لوگوں کی آراء لینے میں مصروف تھے۔ سوچا آفتاب اقبال سے بھی رابطہ ہونا چاہیے۔ سب سے زیادہ اعتراضات انہی پر تھے۔ انھیں فون کیا، "سر اس موضوع پر آپ سے گفتگو کرنی ہے، اگر پانچ منٹ مل جائیں۔"

فرمانے لگے "ابھی تو میں بہت مصروف ہوں، آپ تین ہفتے بعد رابطہ کیجیے گا"

ہم ہکا بکا رہ گئے۔ سوچا آفتاب اقبال صاحب شاید سمجھ رہے ہیں ہم نے کئی گھنٹوں کی گفتگو کرنی ہے، یہ سوچ کر اگلے دن ان کے پروگرام خبرناک کی ریکارڈنگ میں جا پہنچے کہ ہمیں تو کل پانچ منٹ درکار ہیں بات کرنے کے لیے۔ وہاں خاصی چہل پہل تھی، آفتاب اقبال ہر تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی پر برہم ہو رہے تھے۔ حیرت ہوئی، کہ ہنسنے ہنسانے والے پروگرام کا میزبان خود اس قسم کی علت میں مبتلا نظر نہیں آتا۔ پھر یاد آیا کہ وہ تو دوران پروگرام بھی اکثر ڈانٹتے ہی پایا جاتا ہے۔ ہاں جب پروگرام کے فن کار کوئی مزاحیہ بات کہہ دیں تو وہ کندھے ہلا کر اور مونچھیں پھڑپھڑا کر ایسی حرکات ضرور کرتا ہے جن پر ہنسی کا گمان گزرے۔

ہمیں صحافت میں کچھ عرصہ تو ہو ہی چلا ہے، اکثر اوقات کسی نہ کسی کڑی صورت حال اور سڑیل انسان سے واسطہ رہتا ہے۔ ایک گر ہمیشہ آزمایا اور سرخرو رہے۔ احترام سے اور عزت سے بات کرتے ہیں، مخاطب پرلے درجے کا خبیث بھی ہو تو جوابی احترام ضرور دیتا ہے۔

ہم اسٹوڈیو کے سامنے دم سادھے بیٹھے تھے۔ اس دوران وقفہ ہوا، کیمرے کی موجودگی کی وجہ سے آفتاب اقبال کے چہرے پر کسی قسم کی مسکراہٹ کا شائبہ تھا تو وہ اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ چائے کا کپ پکڑے اپنے مہمان یاسر پیرزادہ سے محو گفتگو تھے۔ کچھ ہمت بندھی، کچھ فیچر کی ذمہ داری کا خیال دامن گیر ہوا۔

"السلام وعلیکم سر" ہم منمنائے

"وعلیکم السلام" رعونت بھرا جواب آیا

"سر کل آپ سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی، ہم آج اس امید پر چلے آئے بس چند منٹ گفتگو کا وقت مل جائے۔"

انگریزی میں گویا ہوئے:

Thank you very much, come after three weeks,I never invited you to come.

"ہم واپسی کی راہ لینے لگے کہ آفتاب اقبال کا اگلا سوال آیا" "آپ یہاں آئے کیوں؟ کس نے کہا تھا آپ کو آنے کا؟"

ہم ہکا بکا رہ گئے۔۔۔۔کہ جناب مزید گویا ہوئے "کس نے صحافی بنایا ہے آپ کو؟"

"معافی چاہتا ہوں" ہمارے اوسان خطا ہو چلے تھے

Yes, you should be very sorry.

اب آفتاب اقبال کی آواز مزید بلند ہوتی گئی۔ "آپ کیا خیال تھا میں یہاں آپ کو بٹھا کے انٹرویو دوں گا؟"

ہمیں سارا ہال گھومتا محسوس ہوا۔ آفتاب اقبال برہ چارہا تھا، ہم جانا چاہتے تھے لیکن وہیں گڑے رہے شاید خفت کے احساس سے قدم حرکت کرنا بھول گئے تھے۔

"تم کبھی اچھے صحافی نہیں بن سکتے

You can never be a good professional. 'Now' Go!!!

احساس ذلت سے سُن ہوئے قدموں سے چلتے ہوئے اسٹوڈیو سے باہر آ گرد سے گئے۔

اب اس منظر کو دوبارہ سوچتے ہیں تو جھرجھری سی آجاتی ہے۔ یہ بھی یاد آتا ہے کہ ڈانٹ کھانے کے دوران کتنی بار ہم نے مدد طلب نظروں سے یاسر پیرزادہ کی جانب دیکھا تھا۔ ہماری بے عزتی کا منظر وہ بھی دیکھ رہے تھے؟

ہم نے فیچر کے لیے مجیب شامی سے بھی رابطہ کیا تھا وہ آفتاب اقبال سے کہیں بلند پایہ شخصیت ہیں، صحافی قد کاٹھ بھی خاصا بڑا ہے، وہ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ آخر ایسا کیا تھا جس نے آفتاب اقبال کو اخلاق سے عاری کر دیا۔ یہی رویہ ان کے پروگرام میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک بڑے مقام پر بیٹھ کر ایسا طرز عمل جس کا شائستگی اور اخلاقیات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو؟

اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ ٹی وی پر مسکراتے چہروں کے پیچھے کیسے کیسے خوفناک انسان چھپے ہیں۔

ہم شاید کچھ سال اور سختیاں سہہ کر کبھی اچھے صحافی بن ہی جائیں گے، لیکن آفتاب اقبال صاحب آپ نے ہمارا بہت دل دکھایا۔

■■■

21 مارچ 2006ء کی سہانی صبح تھی کہ بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں واقع جرمن سفارت خانے کو برلن سے ایک فیکس موصول ہوا۔ ایک جرمن خاتون انیتھر موتکو نے پیغام بھجوایا تھا کہ الور شہر میں ایک بھارتی نوجوان نے اس کی سہیلی کی بے حرمتی کر ڈالی ہے۔

جرمن سفارت خانے نے فوراً بھارتی حکومت سے رجوع کیا۔ اب وزارت داخلہ کے اعلیٰ حکام نے بھارتی پولیس میں کھلبلی مچا دی۔ الور میں کوتوالی پولیس اسٹیشن کا چیف انسپکٹر سریندر کمار آرام سے ناشتا کر رہا تھا کہ اسے ریاستی آئی جی کی کال موصول ہوئی۔ فوری کارروائی کا سن کر سریندر نے ناشتا چھوڑا اور سیدھی ہوٹل کی جانب بھاگ نکلا جہاں بیچاری جرمن عورت ٹھہری ہوئی تھی۔

ہوٹل سے پتا چلا کہ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ بذریعہ ریل نئی دہلی روانہ ہو چکی ہے۔ انسپکٹر سریندر نے ریل کے اگلے پڑاؤ، کیرتھل فون کیا تاکہ وہاں پولیس جوڑے کو اتار لے۔ دوپہر تک کیرتھل پولیس جرمن عورت اور اس کے بھارتی ساتھی کو لیے الور پہنچ گئی۔

26 سالہ جرمن عورت پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کا ساتھی 22 سالہ ساتھی، بٹیہوترا مہانتی (Bitihotra Mahanti) بھی گھبرایا ہوا تھا۔ تھانے پہنچ کر ہی بدقسمت جرمن خاتون کی جان میں جان آئی۔ اس نے پھر ایف آئی آر میں لکھوایا کہ وہ الور کے آثار قدیمہ پر تحقیق کرنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ ہفتہ قبل مشترکہ دوستوں نے اس کا تعارف بٹیہوترا سے کرایا۔

بھارت کا قومی مسئلہ

پچیس سالہ ارونا شان باگ کلکتہ کے ایک ہسپتال میں کام کرتی تھی۔ 27 نومبر 1973ء کی شب ہسپتال کے جمعدار سوہن لال نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا۔ سوہن لال نے خواہش پوری کرنے کے بعد زنجیر سے ارونا کا گلا گھونٹا اور اپنی دانست میں اسے مار ڈالا۔

ارونا زندہ رہی مگر اس حالت میں کہ اسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جی ہاں، وہ پچھلے چالیس برس سے نیم بے ہوش پڑی ہے۔ دل دھڑک رہا ہے لیکن دماغ کسی کام کا نہیں رہا۔ وہ بول نہیں سکتی، کسی کو پہچانتی نہیں اور نہ ہی کوئی کام کر پاتی ہے۔

ادھر سوہن لال پر زنا کا الزام ہی نہیں لگا، بس چوری اور قتل پر شخص سات برس قید ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد اب وہ دہلی کے ہسپتال میں ملازمت کر رہا ہے۔ اس نے نام بدل لیا اور یوں نئی زندگی شروع کر دی۔ جبکہ بیچاری ارونا کی زندگی تباہ ہو گئی۔

بھارت میں بے حرمتی یا زنا کا یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ اقوام متحدہ کی رو سے یہ آج وہاں ایک بڑا قومی مسئلہ بن چکا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں ہر 20 منٹ بعد کہیں نہ کہیں کسی عورت کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اخبار روزانہ بے حرمتی کی خبروں سے پُر ہوتے ہیں۔

چند ماہ قبل چلتی بس میں ایک طالبہ کے ساتھ وحشیانہ سلوک نے اس مسئلے کو عالمی سطح پر اجاگر کر دیا۔ بھارتیوں نے جگہ جگہ اس کے خلاف جلوس نکالے لیکن بھارتی خواتین پر ظلم و ستم کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تو ہوس پرست بھارتی مرد غیر ملکی خاتون سیاحوں کو نشانہ بنانے لگے ہیں۔ چنانچہ کئی یورپی ممالک کی حکومتوں نے خواتین سیاحوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ بھارت جائیں تو

بٹی نے اسے مدد دینے کی ہامی بھر لی۔ چنانچہ وہ بھارت آئی اور نئی دہلی سے بٹی کے ہمراہ الور شہر پہنچ گئی جہاں ہندوؤں کی کئی یادگاریں واقع ہیں۔

"ہم نے ہوٹل میں علیحدہ کمرا لیا۔ گو وہ چاہتا تھا کہ ہم ایک کمرے میں ٹھہریں۔ رات کو کھانے کے بعد بٹی کہنے لگا، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ اب میرے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔" جرمن خاتون نے ایف آئی آر میں لکھوایا۔

لیکن مہمان جرمن خاتون کے منع کرنے کے باوجود بٹی اس کے کمرے میں جا گھسا۔ جب رات کافی بیت گئی تو وہ اس سے دراز دستی کرنے لگا۔ جرمن خاتون کا بیان ہے: "تب وہ وحشی اور پاگل بن گیا۔ مجھے یقین ہو چلا کہ اگر میں نے اس کے کہے پر عمل نہ کیا تو وہ مجھے قتل کر ڈالے گا۔"

جب بیچاری جرمن خاتون پر قیامت گزر گئی تو بٹی نے اسے غسل خانے جانے کی اجازت دے دی۔ تبھی اس نے اپنے موبائل سے سہیلی کو جرمنی میسج بھجوایا اور خود پر ٹوٹنے والی آفت کی اطلاع دی۔

ایف آئی آر لکھنے کے بعد انسپکٹر سریندر ہوٹل پہنچا۔ کمرے کی ابھی تک صفائی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں بکھری اشیا نے جرمن خاتون کے بیان کی تصدیق کر دی۔ بٹی نے پولیس کو بتایا: "مجھ سے سب کچھ نشے میں ہوا۔ میں بیئر پیتا ہوں لیکن جرمن نے مجھے شراب پینے پر مجبور کیا۔"

جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ وہ کیسا گھناؤنا جرم کر بیٹھا ہے۔ اس کا کہنا تھا "ریل

انسان نما شیطانوں سے ہوشیار رہیں۔

ماہرین عمرانیات کی رو سے بھارت میں زنا (Rape) اس لیے قومی مسئلہ بنا کہ وہاں گھر و باہر، ہر جگہ مردوں کا راج ہے۔ خصوصاً ہندو معاشرے میں عورت کو "دوسرے درجے" کی شہری سمجھا جاتا ہے۔ شوہر بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے تو باپ بیٹی کو [illegible] حتیٰ کہ مائیں اتنی سنگ دل ہیں کہ بیٹی پیدا ہو تو اسے مار ڈالتی ہیں تاکہ جہیز جمع کرنے کی مصیبت سے بچ سکیں۔

اب بھارتی معاشرے میں یہ مائنڈ سیٹ یا ذہنی رویہ پنپ چکا کہ ضرور بے حرمتی کا شکار عورت نے مرد کو ایسا کرنے پر اکسایا ہوگا۔ شاید وہ [illegible] لباس میں ملبوس ہوگی یا اس نے اشارے کیے ہوں گے۔ حد یہ ہے کہ سیاست دان بھی یہی سوچ رکھتے ہیں [illegible] زنا کی روک تھام کرنے والے قوانین بناتے ہیں۔

بھارتی عورت کی دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ بھارت میں قانون طاقتور نہیں۔ چنانچہ زنا کرنے والے [illegible] کا فائدہ اٹھا کر یا گواہوں کی عدم موجودگی سے بری ہو جاتے ہیں۔ سزا ہو بھی تو وہ چند برس تک محدود ہوتی ہے۔ مقدمے برسوں چلتے ہیں اور [illegible] ہو پاتا۔

[illegible] صورت حال میں ماہرین عمرانیات کا کہنا ہے کہ بھارتی حکومت بے حرمتی روکنے والے سخت ہی قوانین بنا [illegible] معاشرے کی سوچ نہیں بدلی جائے گی، خواتین مردانہ ظلم کا شکار رہیں گی۔

[illegible] بھارتی مردوں کی راسخ ذہنیت بدلنا انتہائی کٹھن کام ہے۔ کیونکہ بھارتی مرد اب زنا کو ہتھیار بھی بنا چکے ہیں۔

میں تو وہ معمول کا رویہ دکھا رہی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ وہ سب کچھ بھول چکی۔"

وِنی مہاجن کوئی عام نوجوان نہیں بلکہ اڑیسہ سے تعلق رکھنے والے ایک آئی جی (بھارت میں ڈائریکٹر جنرل) پولیس کا بیٹا تھا۔ اس زمانے میں وہ دہلی میں مینجمنٹ کا دو سالہ کورس کر رہا تھا۔ تاہم وی آئی پی ہونے سے وِنی کو کچھ حاصل نہ ہوا بلکہ اس کا کیس بھارتی عدلیہ کی تاریخ میں منفرد مقدمہ بن گیا۔

ہوا یہ کہ صرف 21 دن میں اس کیس کا فیصلہ ہو گیا اور عدالت نے وِنی کو سات سال قید بامشقت کی سزا سنا دی۔ دراصل بھارتی حکومت پر جرمنوں کا دباؤ تھا کہ مقدمہ جلد از جلد نمٹایا جائے۔ دوسرے بھارتی حکومت بھی عوام پر یہ تاثر چھوڑنا چاہتی تھی کہ اثر و رسوخ رکھنے والے اور طاقتور لوگ بھی اب قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔

سماعت کے دوران وِنی نے اقرار کیا کہ اس نے ہوش و حواس کی حدیں پار کر ڈالیں۔ صاف لگتا تھا کہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ یقیناً وہ جیل میں اچھے چال چلن کا مظاہرہ کرتا تو اس کی سزا کم ہو سکتی تھی مگر وِنی کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

نومبر 2006ء میں وِنی کے والد بی بی مہاجن نے عدالت میں درخواست گزاری کہ اس کا بیٹا ڈپریشن میں مبتلا ہو چکا۔ لہٰذا اسے ضمانت پر رہائی دی جائے تاکہ وہ بیٹے کا علاج کرا سکے۔ 20 نومبر کو عدالت نے بی بی مہاجن کی پچاس ہزار روپے ضمانت پہ پندرہ دن کے لیے اس کے بیٹے کو رہا کر دیا۔ عدالت کو علم نہ تھا کہ باپ اپنے بیٹے کو ہر قیمت پر بچانے کا تہیہ کر چکا ہے۔ وہ سات برس تک اسے جیل میں سڑتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مثلاً مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجی اکثر بے بس و بے کس کشمیری خواتین کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کہیں مسلم فساد ہو تو ہندو مرد مسلمان عورتوں کو گینگ ریپ کا نشانہ بناتے اور اپنی خباثت دکھاتے ہیں۔ ماؤ تحریک میں شامل عورتیں بھی بھارتی سیکیورٹی فورسز کی درندگی کا شکار رہتی ہیں۔

حال ہی میں لوک سبھا (قومی اسمبلی) نے نیا اینٹی ریپ بل منظور کیا ہے۔ لیکن ارکان لوک سبھا اس میں بھی کیڑے نکال رہے اور ابھی اسے راجیہ سبھا (سینٹ) میں منظور ہونا ہے۔ تبھی وہ قانون بنے گا۔ ماہرین کی نظر میں یہ نیا قانون بھی بے اثر ہے۔ وجہ یہی ہے کہ بھارت کی وفاقی و صوبائی اسمبلیوں میں بھی ریپسٹ موجود ہیں۔ وہ ایسا قانون کیوں بنانے لگے جو ان کا گلا دبوچ لے؟

مغربی تہذیب کا کردار

2011ء میں یمن کی بتیس سالہ سماجی کارکن توکل کرمان کو امن کا نوبل انعام ملا۔ توکل نے حجاب پہن کر نوبل انعام موصول کیا۔ اس تقریب میں شریک ایک یورپی صحافی کو محسوس ہوا کہ حجاب توکل کے لیے زنجیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے توکل سے سوال کیا "آپ باشعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ پھر حجاب کیوں پہنتی ہیں؟ کیا یہ قدامت پسندی (دقیانوسیت) کی نشانی نہیں؟"

توکل کرمان نے جواب دیا "قدیم زمانے میں انسان جاہل اور وحشی تھا اسی لیے برہنہ رہتا تھا۔ جب اسے شعور آ گیا تو

باپ بیٹے کو اپنے آبائی شہر کٹک (اڑیسہ) لے گیا۔ وہاں اس نے واقعی ایک ڈاکٹر سے وِنی کا علاج کرایا۔ 2 دسمبر کو وِنی نے پھر ڈاکٹر سے ملنا تھا لیکن وہ نہیں پہنچا۔ تب صرف اس کے گھر والے ہی جانتے تھے کہ وہ قانون کی نظر میں مفرور ہو چکا۔

پٹاپرتھی میں آمد

چار ماہ بعد وِنی پٹاپرتھی (Puttaparthi) نامی قصبے میں نمودار ہوا۔ یہ قصبہ آندھرا پردیش ریاست میں واقع ہے۔ اس قصبے میں مشہور ہندو پنڈت سائی بابا کا مرکزی آشرم واقع ہے۔ لیکن اب وِنی جون بدل کر "رگھو راجن" کے قالب میں ڈھل چکا تھا۔ وہ وہاں ایک لمبے اور دوسرے پست قامت آدمیوں کے ساتھ دیکھا گیا۔ لمبا آدمی اس کا باپ تھا۔ وِنی بھی اپنے والد کی طرح طویل قامت ہے۔

وِنی سائی بابا آشرم میں تعلیمی اداروں کے نگران رام راؤ تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ مشترکہ دوستوں نے اس کا تعارف رگھو راجن کی حیثیت سے کرایا۔ آج 75 سالہ رام راؤ بتاتا ہے "وہ نوجوان پریشان خیال اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شہر کی تیز رفتار اور شور شرابے والی زندگی سے اکتا چکا۔ لہٰذا امن و سکون کی تلاش میں پٹاپرتھی آیا ہے۔"

رام راؤ نے اُسے سری ودیا ڈگری کالج میں بحیثیت جزوقتی کمپیوٹر انسٹرکٹر ملازمت دے دی۔

وہ لباس پہننے لگا۔ آج بنی نوع انسان شعور و عقل اور تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہے۔ میں اسی لیے حجاب پہنتی ہوں۔ اصل قدامت پسند وہ ہیں جو قدیم انسانوں کے مانند کپڑے اتارنا شروع کر دیں۔"

یہ منہ توڑ جواب سن کر یورپی صحافی گنگ رہ گیا۔ معلوم نہیں اس نے عریانی و فحاشی سے بھرپور اپنے مغربی تہذیب و تمدن کے متعلق کچھ سوچا، تاہم امریکیوں اور یورپیوں کا یہ تحفہ بھارت میں ریپ کا مسئلہ گمبھیر کر چکا۔

بھارت نے پندرہ سال قبل آزاد تجارت کی راہ اپنائی تو امریکا و یورپی ممالک سے بھارتیوں کا ربط ضبط بڑھا۔ رفتہ رفتہ مغربی تہذیب و تمدن کے برے جراثیم مثلاً لڑکے لڑکیوں کا آزادانہ میل جول، آزادی نسواں، فحش فلمیں اور پارٹی کلچر بھارتی معاشرے میں نفوذ کرنے لگے۔ بھارتی متوسط طبقے میں بڑھتی دولت نے ان جراثیم کو تیزی سے نشوونما دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج خصوصاً بھارتی شہروں میں مغربی تہذیب کے زیر اثر اخلاق باختگی کے مظاہرے اکثر نظر آتے ہیں۔ بھارتیوں نے مغربی تہذیب کی خرابیاں کم ہی اپنائی ہیں۔

عریانی اور آزادی نسواں نے ہی مغرب میں اخلاقیات کا جنازہ نکالا اور اب وہ بھارتی معاشرہ تباہ کرنے میں مصروف ہے۔ "تہذیب کی کہانی" جیسی عظیم تاریخی دستاویز لکھنے والا امریکی مورخ، ول ڈیورانٹ اپنی ایک اور کتاب "فلسفیت کی لذتیں" (The Pleasures of Philosophy) میں رقم طراز ہے:

"بیسویں صدی کے ربع اول کا سب سے اہم واقعہ پہلی جنگ عظیم یا کمیونسٹ انقلاب نہیں بلکہ تحریک آزادی نسواں ہے۔

رگھو راجن نے محنت و لگن سے اپنا کام کیا اور طلبہ میں مقبول ہو گیا۔ کالج کے طلبہ و استاد بتاتے ہیں، ”وہ نفیس اور مہذب نوجوان تھا۔ سبھی سے بہت اچھا برتاؤ کرتا۔ سب اسے پسند کرتے تھے۔“

جتی جنوری 2008ء تک اس کالج سے وابستہ رہا۔ جب وہ کالج میں نہ ہوتا تو اپنا بیشتر وقت آشرم کے اپنے کمرے میں گزارتا۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا۔

جنوری 2008ء میں جتی کو پاپرتھی ہی کے ایک اور کالج، وینا جنودھارا نامی تعلیمی ادارے میں بحیثیت ریاضی و کمپیوٹر استاد ملازمت مل گئی۔ وہاں بھی بہت جلد سیٹ ہو گیا۔ رام راؤ بتاتا ہے، ”مجھے یاد ہے، کبھی کبھی وہ ایک لمبے آدمی اور ایک عورت کے ساتھ نظر آتا۔“ یہ یقیناً جتی کے والدین تھے۔ تاہم جتی نے پاپرتھی میں جاننے والوں کو بتا رکھا تھا کہ اس کا باپ نئی دہلی میں کاروبار کرتا ہے۔

وسط 2008ء میں جتی ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ شاید قانون کی نظروں سے چھپ کر دوہری زندگی گزارنے کے عمل نے اس پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ تاہم رام راؤ کی توجہ نے اسے نارمل کر دیا۔ اسی دوران جتی نے اپنے گرو کو بتایا کہ وہ ایم بی اے کرنا چاہتا ہے۔

رام راؤ کے اصرار پر اس نے پھر آشرم کے ایک کالج میں ایم بی اے کا داخلہ امتحان دیا۔ اس کے 97 فیصد نمبر آئے۔ لیکن اسے آشرم کے کالج میں داخلہ نہیں مل سکا وہاں نشستیں کم تھیں اور کالج آشرم سے منسلک لوگوں کے بچوں کو اولیت دیتا تھا۔ اس ناکامی نے جتی کا دل توڑ دیا اور وہ کیرالہ ریاست جانے کا

اس تحریک نے معاشرے میں عورت کا مقام ہی بدل ڈالا۔ انسانی تاریخ نے اتنے مختصر وقت میں ایسی انقلابی تبدیلی کم ہی دیکھی ہے۔ تحریک نے ہمارے معاشرتی نظام کی بنیاد ”گھر“ کو نقصان پہنچایا اور خواہش نفس اور ناپائیداری کی روک تھام کرنے والا شادی کا نظام تباہ کر ڈالا۔ تحریک نے نظام اخلاقیات کی بھی دھجیاں اڑا دیں جس نے انسان کو وحشت و بربریت سے نکال کر مہذب اور رحم دل بنایا۔“

یہ امر قابل ذکر ہے کہ انسان کو حیوانیت سے نجات دلانے میں اسلام نے بنیادی کردار ادا کیا۔ جب یونان سے لے کر ہندوستان تک عورت کو زرخرید غلام سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اسے عزت و احترام عطا کیا۔ قرآن پاک کی کئی آیات میں مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خواتین سے اچھا برتاؤ کریں اور انھیں برابر کا جانیں۔ اسی طرح احادیث بھی خواتین کی اہمیت اجاگر کرتی ہیں۔ مثلاً حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”مسلمانوں میں بہترین ایمان والا وہ ہے جو اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے اور بیوی کے ساتھ نرم دلی سے پیش آئے۔“

اسلامی معاشرے میں کئی خواتین انتہائی محترم و محبوب مقام رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت خدیجہؓ کو پہلی مسلمان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی طرح تمام مسلمان حضرت آمنہؓ، بی بی حلیمہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ سے بہت عقیدت و الفت رکھتے ہیں۔

اسلام نے تو خاتون کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر شادی نہیں انجام پا سکتی۔ یقیناً پچھلے چودہ سو برس میں کئی غیر اسلامی رسومات بھی مسلمانوں میں در آئی ہیں، مثلاً ہندوؤں کی بعض رسوم برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اپنا چکے۔ لیکن جو اصول و قواعد چودہ سو سال پہلے اسلام نے متعین کر دیے تھے، ان میں سرمو تبدیلی نہیں آئی۔

سوچنے لگا۔

پاپرتھی میں قیام کے دوران ہی جتی رگھو راجن کے نام سے شناختی کارڈ بنوانے میں کامیاب رہا۔ اس نے کارڈ پر اپنے باپ کا نام راچیو راجن لکھوایا۔ یوں اس نئے شناختی کارڈ کی بنیاد پر ہر قسم کے سرکاری کاغذات بنوانے کا راستہ نکل آیا۔ کہا جاتا ہے کہ بھارت میں قانون پہلے کی نسبت طاقتور ہو چکا۔ لیکن یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ اب بھی وہاں ذی اثر افراد کوئی بھی غیر قانونی کام کرا سکتے ہیں۔ جتی نے پھر ڈرائیونگ لائسنس بنوایا اور بینک اکاؤنٹ بھی کھلوا لیا۔

کانور کو روانگی

جون 2009ء میں جتی ریاست کیرالہ کے شہر کانور (Kannur) میں ظاہر ہوا۔ وہاں اس نے چنمایا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نامی تعلیمی ادارے میں ایم بی اے کی جماعت میں داخلہ لیا۔ یہ کالج ہندو سادھو سوامی چنمایانند نے قائم کیا تھا۔

داخلے کے وقت اس کا باپ ”راچیو راجن“ جتی کے ساتھ تھا۔ دو سالہ کورس کے دوران وہ وقتاً فوقتاً آتا رہا۔ جتی کی فیس بھی باقاعدگی سے ادا ہوتی رہی جو 55 ہزار روپے فی سمسٹر تھی۔

کالج میں جتی اپنی سادگی، نظم و ضبط اور کتابی کیڑا ہونے کے باعث مشہور ہوا۔ اس کا ایک دوست بتاتا ہے ”وہ صبح پانچ بجے اٹھ جاتا اور قریبی مندر میں جا کر پوجا کرتا۔ بعد ازاں تین چار کلومیٹر پیدل چلتا۔ وہ اجلے و صاف کپڑے پہنتا۔ جتی کھلا لباس اس لیے پہنتا اور عینک یوں لگاتا کہ عمر سے بڑا نظر آسکے۔“

کانور میں بھی جتی نے کوئی گہرا دوست نہ بنایا۔ اس نے ہم جماعتوں کو بتایا ”میرے والدین سوامی چنمایا کے چیلے ہیں، اس لیے انھوں نے اتنی دور مجھے داخلہ دلوایا۔“ جتی کی زندگی جماعت اور ہوسٹل تک محدود تھی۔ وہ کسی پارٹی میں شریک نہ ہوتا۔ اس کے کمرے میں فلمی اداکاراؤں کی تصویریں بھی عنقا تھیں۔ سبزیاں من بھاتا کھاجا تھیں اور کیک پیسٹریوں سے بھی پرہیز کرتا۔ مشروبات میں صرف پھلوں کا رس پیتا۔

سادہ مزاج اور تعلیم سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے جتی طلبہ اور اساتذہ، دونوں طبقوں میں جانی پہچانی شخصیت بن گیا۔ اساتذہ دوران لیکچر آوارہ اور پھسڈی طلبہ کے سامنے اس کی مثال دیتے اور کہتے ”رگھو راجن جیسی مثالی زندگی گزارو۔“ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ قانون کی گرفت سے بھاگا ہوا ایک مجرم ہے۔

2011ء میں جتی نے ایم بی اے کی ڈگری کامیابی سے حاصل کر لی۔ اس کے 75 فیصد سے زیادہ نمبر آئے۔ اس نے پھر سٹیٹ بینک آف انڈیا کے مقابلہ جاتی امتحان میں حصہ لیا۔ وہ بھارت بھر کے پاس ہونے والے 1250 امیدواروں میں شامل تھا۔ جون 2012ء میں ”رگھو راجن“ کو بطور ترقی افسر میدائی میں واقع بینک کی شاخ بھجوا دیا گیا۔ میدائی شہر کانور سے 30 کلومیٹر دور واقع ہے۔

میدائی میں جتی پہلے مضافاتی علاقے میں مقیم رہا۔ پھر بینک کے ایک ساتھی اشیک کمار کے پاس چلا آیا۔ اشیک بینک کے قریب ہی سمیرا منزل نامی عمارت کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ وہاں بیشتر آبادی مسلمانوں کی تھی لیکن دونوں ہندو نوجوان ان سے

بہت کم ملتے جلتے۔

کلشی میدائی میں بینک کی کینٹین چلاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے "رگھو چاول اور دہی شوق سے کھاتا۔ بڑا مہذب اور نفیس نوجوان تھا۔ سب سے محبت آمیز لہجے میں مخاطب ہوتا۔ مجھے تو اب تک یقین نہیں آیا کہ وہ ایک ریپسٹ اور جعل ساز ہے۔"

ہنی کو یقین تھا کہ وہ رگھو راجن کی شکل میں نیا جنم لے کر اپنے داغ دار ماضی سے پیچھا چھڑا چکا۔ ضمیر کو بھی تھپکیاں دے دے کر اس نے سلا دیا تھا۔ لیکن نفسانی خواہش نے اسے مصائب میں پھنسایا تھا، وہی ہنی کی اصلیت طشت از بام کرنے کا سبب بن گئی۔

محبوبہ نے راز افشا کردیا

ہنی مہاتی نے میدائی میں آنے سے قبل ریاست کیرالہ کے تھیروونانتھاپورم نامی مقام پر دو ماہ تک بینکاری کی تربیت پائی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ وہ بنیادی اصلاحات سے واقف ہو جائے۔ وہیں اس کی ملاقات ایک مقامی لڑکی سے ہوئی اور دونوں عشق میں گرفتار ہو گئے۔ میدائی آنے کے بعد ہنی گھنٹوں اس سے فون پر محو گفتگو رہتا۔ اس لڑکی سے متعلق بعدازاں جو ماجرا پیش آیا، اس کے متعلق دو رائے ملتی ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ ہنی نے اپنی محبوبہ کو شادی کے سہانے خواب دکھائے اور اس کی قربت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ جب مراد بر آئی تو ہنی نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ تب لڑکی کو محسوس ہوا کہ اس کی زندگی تباہ ہو چکی۔ لہٰذا اس نے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید قربت کے لمحات میں ہنی اسے اپنی اصلیت سے آگاہ کر چکا تھا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ محبوبہ کو یقین تھا کہ ہنی اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ چنانچہ وہ اسے قبول کرنے پر تیار تھی۔ لیکن جب لڑکی کے والدین کو "متوقع دولھا" کی اصلیت معلوم ہوئی تو انھوں نے بھید کھول دیا۔ بہرحال یہی "محبت" ہنی کو جیل بھجوانے کا سبب بن گئی۔

خط کی آمد

7 مارچ کی صبح اسٹیٹ بینک میدائی شاخ کے منیجر کو ایک خط موصول ہوا۔ اس پر کسی کا

نام و پتا درج نہ تھا۔ خط میں درج تھا:

"دیکھو تو تمھاری شاخ میں ایک وی آئی پی ریپسٹ کام کر رہا ہے..... وہ دو چہرے رکھتا ہے۔ کبھی وہ دلی بنتا ہے اور کبھی الور۔ آج کل وہ کیرالہ میں مقیم ہے۔ نام بدلنا اس کے لیے کھیل ہے۔ اس وی آئی پی کا نام ہنی مونباتی ہے..... وہ سمجھتا ہے کہ رگھو راجن کا روپ دھار کر محفوظ ہو چکا۔"

قدرتاً بینک منیجر نے خط رگھو راجن کو بھی دکھایا۔ وہ خط پڑھتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ ظاہر ہے سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اس نے خط بینک منیجر کے سامنے پھاڑ دیا اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی نشست پر پہنچ گیا۔

لیکن اس کے عجیب رویے نے رگھو کے ساتھیوں کو شک و شبے میں مبتلا کر دیا۔ اس سے قبل رگھو کبھی اتنے غصے میں نہیں آیا تھا۔ انھوں نے انٹرنیٹ پر ہنی مہاتی کی تصاویر نکالیں تو وہ انھیں رگھو سے بہت مشابہ معلوم ہوئیں۔ صلاح مشورے کے بعد انھوں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔

7 مارچ کی سہ پہر ہنی گھر پہنچا تو بہت پریشان تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ خطرے میں ہے۔ چنانچہ وہ شام کو ایک ہوٹل میں جا پہنچا۔ اب وہ مشرقی پنجاب کے کسی چھوٹے شہر جانا چاہتا تھا۔ لیکن پولیس کے مخبر اس کے نکلنے سے قبل ہی اس تک پہنچ گئے۔ لہٰذا ایک مارچ کی صبح ہنی مفرور قانون کی گرفت میں آیا اور پکڑا گیا۔ اب اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔

دو غلطیاں جو برباد کر گئیں

ہنی نے میٹرک تک لنک کے سٹیورٹ اسکول میں تعلیم پائی۔ پھر بھونیشوار کے کالنگا انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل ٹیکنالوجی سے بی ٹیک کیا۔ ان دونوں تعلیمی اداروں کے طلبہ کو یاد ہے کہ ہنی سادہ مزاج، مہذب اور نرم خو تھا۔ کسی طور لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ آئی جی پولیس کا بیٹا ہے۔ آج بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہنی کو زنا کے کیس میں پھنسایا گیا ہے۔

بیٹے پر دراصل والدین کا اثر تھا۔ سادگی سے زندگی گزارنا ان کا وتیرہ تھا اور باپ میں سرکاری افسروں والی اکڑفوں نام کو نہ تھی۔ مزید برآں وہ سرکاری حلقوں میں قانون پسند اور فرض شناس پولیس افسر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ سوال یہ ہے کہ پھر مصائب نے اس نیک نام گھر کا رخ کیوں کر لیا؟ وجہ چند لمحوں کی لغزش ہے جو بیٹے اور پھر باپ، دونوں کو عمر بھر کے لیے خوار کر گئی۔

پہلے بیٹے سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ اس پر خواہش نفسانی غالب آگئی اور وہ ساری اخلاقیات و اقدار بھول گیا۔ پھر باپ یہ سمجھا کہ بیٹے کو فرار کرا کے وہ مصیبت سے اس کی جان چھڑا دے گا۔ لیکن یہ قانون شکنی اسے بہت مہنگی پڑی اور اس کی ساری پیشہ ورانہ نیک نامی کو خاک میں ملا گئی۔ اب دونوں باپ بیٹا ان لمحوں کو کوستے ہیں جب وہ شیطان کے غلام بنے اور پھر ذلیل ہو گئے۔ ان کی داستان عبرت میں ہم سب کے لیے بڑے سبق پوشیدہ ہیں۔

اگر ہنی 2006ء میں قانون کے سامنے سرنگوں ہو جاتا تو عنقریب رہا ہونے والا ہوتا۔ وہ پھر آزادی و آسانی کے ساتھ اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر سکتا تھا۔ لیکن اب ایک سیاہ مستقبل اس کا منتظر ہے۔ سچ ہے، بدی اختیار کرنے والے کا انجام بھی بد ہی ہوتا ہے۔

■■■

افضل گرو کی پھانسی

ایک مجرم کا قتل یا ایک معصوم شخص کی شہادت؟

پروفیسر محمد فاروق قریشی

9 فروری 2013ء کو کشمیری نوجوان افضل گرو کو گیارہ برس کی قید و بند کے بعد تہاڑ جیل دہلی میں چوری چھپے پھانسی دے دی گئی اور نہایت غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی لاش کو رسمی تجہیز و تکفین کے بغیر جیل کے صحن میں ہی دفن کر دیا گیا۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت کے حکمرانوں کا غیر انسانی رویہ ملاحظہ کریں کہ پھانسی سے پہلے افضل گرو کے اہل خانہ کو نہ تو اس کے ساتھ آخری ملاقات کرنے کی اجازت دی گئی نہ ہی پھانسی کے بعد میت کو ان کے حوالے کیا گیا۔ کشمیریوں نے اس ظلم و بربریت پر سخت احتجاج کیا جو کہ مظاہروں اور ہڑتالوں کی صورت میں ابھی تک جاری ہے۔ 14 مارچ 2013ء کو کشمیر کمیٹی کے چیئرمین مولانا فضل الرحمٰن کی تحریک پر پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک متفقہ قرارداد منظور کی جس میں مقبوضہ کشمیر میں افضل گرو کی پھانسی پر سخت تشویش کا اظہار کیا گیا اور بھارتی حکومت کے اس وحشیانہ اقدام کی مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ افضل گرو کا جسد خاکی اس کے لواحقین کے سپرد کیا جائے۔ قرارداد میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ بھارتی حکومت مقبوضہ وادی

میں ظلم و بربریت بند کرے۔ تمام سیاہ قوانین کو ختم کیا جائے، کرفیو کا نفاذ بند کیا جائے اور بھارتی افواج کو واپس بلایا جائے۔ مقبوضہ کشمیر کے ارکان اسمبلی نے بھی بھارتی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ افضل گرو کی میت اس کے اہل خانہ کے سپرد کی جائے جس کا جواب بھارتی وزیر داخلہ سشیل کمار شندے نے انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "ناں" میں دیا ہے۔

افضل گرو کی کہانی 13 دسمبر 2001ء سے شروع ہوتی ہے جب کچھ مشتبہ دہشت گردوں نے بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ کیا۔ افضل گرو ایک سیدھا سادا کشمیری نوجوان تھا اور میڈیکل کا طالب علم تھا۔ ایک مرتبہ وہ کنٹرول لائن کو عبور کر کے آزاد کشمیر آ گیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ واپس چلا گیا۔ بس اس وقت سے مقبوضہ کشمیر کی پولیس اور بھارتی سیکیورٹی فورسز نے اس پر "پاکستانی دہشت گرد" کا لیبل لگا دیا۔ کہیں پر بھی کوئی واقعہ ہوتا تو پولیس اس کو گرفتار کر لیتی۔ جب بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ ہوا تو افضل گرو کو دہشت گردوں کا ساتھی ہونے کے شبہ میں گرفتار کر لیا گیا۔

ایک طویل مقدمہ چلا جس میں اس کو سزائے موت سنائی گئی۔ حالانکہ وہ نہ تو پارلیمنٹ پر حملہ کرنے والوں میں شامل تھا، نہ ہی اس نے کسی کو قتل یا زخمی کیا، نہ ہی اس کے خلاف کوئی عینی شاہدین موجود تھے۔ صرف شبہ اور واقعاتی شہادتوں کی بنا پر اس کو مجرم قرار دے دیا گیا اور بھارت کی اعلیٰ ترین عدالت کی طرف سے اس کو تین مرتبہ عمر قید اور دو مرتبہ موت کی سزا سنا دی گئی۔ بھارتی حکومت نے روایتی چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس کی سزا پر عمل درآمد میں دیر نہیں کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سب کچھ بھارتی قانون اور انصاف کی بالادستی قائم کرنے کے لیے کیا گیا یا محض پاکستان مخالف انتہا پسند ہندوؤں کی جذباتی حمایت حاصل کرنے اور الیکشن میں کانگریس کی راہ ہموار کرنے کا ایک سیاسی حربہ ہے؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس مقدمے میں قانون اور انصاف کے معروف تقاضوں کو پورا کیا گیا؟ یا موجودہ بھارتی حکومت پاکستان مخالف لابی کے ہاتھوں میں یرغمال بن چکی ہے اور محض انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے قانون اور انصاف کا قتل کرنے پر تلی ہوئی ہے؟ آئیے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے صحافیوں، قانون دانوں اور دانشوروں کی نظر میں افضل گرو کے مقدمے اور پھانسی کے فیصلے کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے۔

بھارتی اخبار "ڈیلی پوسٹ" کے سترہ مارچ کے سنڈے ایڈیشن میں پاکستان کی قومی اسمبلی کی مذکورہ قرارداد پر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ اخبار نے بھارتی راجیہ سبھا کے اپوزیشن لیڈر ارون جیٹلے کے حوالے سے اس کو ہندوستان کی سالمیت اور حاکمیت کے خلاف اشتعال انگیز اقدام قرار دیا ہے اور اسے سری نگر میں پولیس پبلک اسکول پر حالیہ دہشت گردی کے واقعہ کے ساتھ جوڑتے ہوئے پاکستان کی حکومت اور فوج کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ اخبار کا یہ بھی کہنا ہے کہ افغانستان سے امریکی افواج کے انخلا اور طالبان کے ساتھ متوقع سمجھوتے کے نتیجے میں پاکستان کے جہادی عناصر کا رخ ایک دفعہ پھر کشمیر کی طرف ہوا چاہتا ہے اور آنے والے

مہینوں میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

اخبار کے خیال میں پاکستان کے جہادی عناصر افضل گرو کی پھانسی کے واقعے سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس مضمون کے مصنف فراز احمد کا یہ بھی کہنا ہے کہ افضل گرو کی پھانسی میں جس مشکوک امتیازی کارروائی اور خفیہ چالبازی سے کام لیا گیا ہے، جس طرح افضل گرو کو قانونی معاونت اور نمائندگی سے محروم رکھا گیا اور اس کے اہل خانہ کو اس کے ساتھ آخری ملاقات کا موقع نہیں دیا گیا اور جس طرح اس کو خاموشی سے تہاڑ جیل کے اندر ہی سپرد خاک کر دیا گیا اس سے کشمیری نوجوانوں اور جہادی عناصر کا مشتعل ہونا لازمی امر ہے۔ اخبار نے اس واقعے اور اس کے ردعمل کو دونوں ممالک میں موجود سیاسی جماعتوں اور پیش آمدہ انتخابات کے ساتھ بھی جوڑنے کی کوشش کی ہے۔

> بھارتی سپریم کورٹ کا فیصلہ انتہائی مشکوک اور متنازعہ ہے۔

نامور بھارتی دانشور اور مصنفہ ارون دتی رائے نے افضل گرو کے مقدمے اور سزائے موت کے فیصلے پر مرتبہ ایک کتاب کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔ کتاب افضل گرو کی سزائے موت سے پہلے اور بعد میں لکھے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے دیباچے کے کچھ اقتباسات بھارت کے ہفت روزہ آؤٹ لک (Outlook) کے گزشتہ شمارے میں منظر عام پر لائے گئے ہیں۔ ان اقتباسات کے مطالعے سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ بیرونی دنیا کے علاوہ بھارت کے اندر غیر جانبدار دانشور اور تجزیہ نگار اس معاملے پر کیا رائے رکھتے ہیں۔

ارون دتی رائے نے بھارت کے ایک سابق ایڈووکیٹ جنرل کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ جس رازداری سے دنیا سے چھپا کر افضل گرو کی پھانسی کی سزا پر عملدرآمد کیا گیا ہے اس نے اس اقدام کی قانونی حیثیت پر سنگین شکوک و شبہات کو جنم دیا ہے۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ اپریل 2012ء میں بھارتی سپریم کورٹ نے ایسے ملزمان کی سزاؤں پر عملدرآمد کے مقدمے کی سماعت مکمل کی تھی جو پہلے ہی طویل عرصہ قید خانے میں گزار چکے ہیں اور افضل گرو کا معاملہ بھی اس مقدمے میں شامل تھا۔ حکومت نے اس کیس کے متوقع فیصلے کے نتائج سے بچنے کے لیے اور سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لیے اسے تختہ دار پر لٹکانے پر غیر معمولی عجلت اور بے تابی کا مظاہرہ کیا مبادا افضل گرو کو پھانسی کے تختے پر لٹکانے کا یہ نادر موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

> افضل گرو کا جرم عدالت میں ثابت نہیں ہو سکا۔ عدالت نے اعتراف کیا کہ اس کے سامنے صرف واقعاتی شہادت پیش کی گئی۔

عام آدمی قانونی موشگافیوں اور مقدمے کی تفصیلات میں الجھے بغیر یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا افضل گرو قصوروار تھا یا بے گناہ؟ اس کے جواب میں مصنفہ کا کہنا ہے کہ جو کوئی بھی پینگوئن کی شائع کردہ مذکورہ کتاب ''افضل گرو تختہ دار پر'' (The Hanging of Afzal Guru) کا مطالعہ کرنے کی زحمت کرے گا وہ اسی نتیجے پر ہی پہنچے گا کہ افضل گرو پر عائد کردہ الزام کہ وہ ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ آوروں کا ساتھی تھا، کبھی بھی ثابت نہیں کیا جا سکا۔ استغاثہ نے یہ دعویٰ کیا ہی نہیں کہ وہ حملہ آوروں میں شامل تھا یا یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہے۔ اسی لیے سپریم کورٹ نے سزائے موت کا متنازعہ فیصلہ کسی براہ راست شہادت کی بنیاد پر نہیں دیا بلکہ صرف واقعاتی شہادت کا کمزور سہارا لیا۔ درحقیقت یہ فیصلہ بھارتی معاشرے کے اجتماعی ذہن کو مطمئن کرنے کی ایک کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ فیصلہ بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردی کے حملے کی دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ منطقی طور پر عدالت کو ''معقول حد تک شک'' کے بنیادی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے تھا۔ بدقسمتی سے عدالت اس کام میں ناکام رہی اور ایک ایسے شخص کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا جس پر جرم میں ملوث ہونے کا صرف شک پایا گیا۔

> افضل گرو کی سزائے موت کے مبالغہ آمیز، بزدلانہ اقدام سے انصاف کے عمل کا تمسخر اڑایا گیا ہے۔ اس نے بھارت کا فسطائی چہرہ دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔

فاضل مصنفہ مزید لکھتی ہیں کہ افضل گرو کو کسی بھی لحاظ سے جنگجو جہادی یا دہشت گرد قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا گیا اس نے اسے کشمیری نوجوانوں کا شہید ہیرو بنا دیا ہے۔ ہزاروں دوسرے کشمیری نوجوانوں کی طرح اس کو قید کیا گیا، جلایا گیا، مارا پیٹا گیا، بجلی کے جھٹکے دیے گئے، بلیک میل کیا گیا اور اب اس کا عدالتی قتل کیا گیا۔ اس کے مقدمے کی ساری دنیا میں تشہیر کی گئی لیکن اس کو پھانسی دینے کا عمل چوری چھپے کیا گیا۔ یہ ایک سنگدلانہ، بزدلانہ، کھوکھلا، مبالغہ آمیز عمل تھا جس نے انصاف کے تقاضوں کا مذاق اڑایا اور بھارتی فسطائیت کو ہم سب کے سامنے بے نقاب کر دیا۔

بھارتی ہفت روزہ ''تہلکہ'' کے 23 مارچ کے شمارے میں بھارت کے انسانی حقوق کے علمبردار عظیم قانون دان ''کولن گونسالوز'' کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے سپریم کورٹ میں افضل گرو کا مقدمہ لڑا کیونکہ کوئی اور افضل گرو کی طرف سے پیش ہونے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے دلائل شروع کرنے سے پہلے ہی افضل گرو پر انصاف کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ ان کو یقین ہے کہ افضل گرو بے گناہ تھا۔ اس کو نمائندگی اور صفائی کے حق سے محروم کیا گیا اور ججوں نے جنونی معاشرے کے دباؤ سے مغلوب ہو کر اس کو صرف واقعاتی شہادت کی بنیاد پر موت کی سزا سنا دی۔

آخر میں مصنفہ رقمطراز ہیں کہ ہم شاید یہ سچائی کبھی نہ جان سکیں کہ بھارتی پارلیمنٹ کے حملہ آور کون تھے لیکن یہ سچائی ہمارا منہ چڑانے کے لیے کافی ہے کہ افضل گرو مر چکا ہے اور بھارتیہ جنتا پارٹی کا یہ

نعرہ اپنا طلسماتی اثر کھو چکا ہے:

دلیش ابھی شرمندہ ہے
افضل ابھی بھی زندہ ہے

اب جب کہ وہ مر چکا ہے اور اس کے قتل پر سیاست کرنے والے اس کی لاش کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ آنے والے دنوں میں شاید اس کے خطوط اور کتابیں منظر عام پر آجائیں جو اس نے کبھی نہیں لکھیں یا شاید ہم وہ باتیں سنیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ لیکن جس طریقے سے وہ زندہ رہا اور جس طرح اس نے اپنی جان دی وہ کشمیر کی تاریخ میں ایک ہیرو کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ بھارتی جمہوریت پر حملہ نہیں، کشمیر پر بھارت کا فوجی قبضہ بھارتی جمہوریت پر حقیقی حملہ ہے۔

بھارتی میڈیا کے اس پروپیگنڈے کہ ”بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ دراصل بھارتی جمہوریت پر حملہ ہے۔“ کا جواب دیتے ہوئے مصنفہ نے متعصب اور تنگ نظر بھارتی معاشرے کا پول کھول کے رکھ دیا ہے۔ ان کے پیش کردہ حقائق عالمی دانشوروں، تجزیہ نگاروں اور فیصلہ سازوں کے لیے بھی چشم کشا ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اگر بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ بھارتی جمہوریت پر حملے کے مترادف تصور کیا جاتا ہے تو کیا 1983ء میں تین ہزار غیر قانونی بنگلہ دیشی باشندوں کا قتل عام بھارتی جمہوریت پر حملہ نہیں تھا؟ کیا 1984ء میں دہلی کی گلیوں میں تین ہزار سے زائد سکھوں کا قتل عام بھارتی جمہوریت پر حملہ نہیں تھا؟ کیا 1992ء میں بابری مسجد کا انہدام بھارتی جمہوریت پر حملہ نہیں تھا؟ کیا 93-1992ء میں شیوسینا کی قیادت میں ممبئی میں ہزاروں مسلمانوں کا خون خرابہ بھارتی جمہوریت پر حملہ نہیں تھا؟ کیا 2002ء میں گجرات میں ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ کھیلا جانے والا خونی کھیل بھارتی جمہوریت پر حملہ نہیں تھا؟ اس بات کی براہ راست اور واضح شہادتیں بکثرت موجود ہیں کہ ہماری بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین قتل و غارت گری کے ان واقعات میں ملوث تھے لیکن ان میں سے کسی کو سزا دینا تو درکنار، کیا ہم صرف کسی ایک کو گرفتار کرنے اور گیارہ برس تک قید رکھنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں؟ کبھی نہیں..... اس کے برعکس ان میں سے ایک ذمہ دار کی آخری رسومات کوئی سرکاری عہدہ نہ ہونے کے باوجود حال ہی میں سرکاری اعزاز کے ساتھ ادا کی گئیں اور ایک اور ذمہ دار آئندہ انتخابات میں وزیراعظم کے عہدے کا امیدوار ہوگا۔

افضل گرو شہادت کے ابدی رتبے پر فائز ہو چکا ہے اور تحریک آزادی کے ممتاز رہنما اور جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کے بانی مقبول بٹ کے پہلو میں آسودۂ خاک ہے۔ سری نگر کے مزار شہیداں میں افضل گرو کی قبر، جو اپنے مہمان کی منتظر ہے، کے کتبے پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

”قوم کا شہید، شہید محمد افضل گرو
تاریخ شہادت: 09 فروری 2013ء
بروز ہفتہ۔ جس کی فانی باقیات بھارتی حکومت کی تحویل میں ہیں۔ قوم ان کی واپسی کی منتظر ہے۔“

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

■■■

ندا گاڑی چلا رہی تھی۔ پرانی سوزوکی کار کا انجن بہت دھواں دینے لگا تھا۔ ٹیوننگ کرائی تھی مگر کچھ زیادہ فرق نہ پڑا تھا۔ انجن کی اوور ہالنگ ہونے والی تھی۔ گاڑی کی رفتار زیادہ نہیں تھی لیکن ندا کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے حادثے میں زخمی ہونے والے کسی جاں بلب مریض کو ہسپتال پہنچانا چاہتی ہو۔

کٹم کاٹا

بیس سال سے دل میں رُکے ایک کلاک کا ماجرا ایک روز وہ اچانک چل پڑا تھا۔

اس عہد کے نامور افسانہ نگار، فسوں کار کے قلم کا شاہکار

منشا یاد

یوں میں بھی مریض ہی تھا، دن رات ان گنت الجھنوں میں گھرا ہوا ذہنی تناؤ اور اعصابی کھچاؤ کا شکار۔ اور اب تو دورے بھی جلد جلد پڑنے لگ گئے تھے۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ کچھ دنوں کے لیے ہسپتال میں داخل ہو جاؤں اور آرام کروں لیکن ندا کے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ مزاج پرسی کرنے والے اتنی تعداد میں تواتر کے ساتھ آتے رہیں گے کہ ہسپتال کا کمرا آفس کم ریسپشن کی صورت زیادہ اختیار کر جائے گا۔ وہ مجھے شہر کی مصروفیات اور شور و غل سے نکال کر کچھ دنوں کے لیے گاؤں لے جانا چاہتی تھی۔ ہم پہلے بھی جا سکتے تھے مگر اس بے وقوف کا اصرار تھا، میں گاؤں سے دور رہ کر اداس ہو گیا ہوں اور میرے ذہن کو پھپھوندی لگ گئی ہے۔ کوئی پوچھے کہ گاؤں میں میرا کون تھا جس کی فرقت میں اداس ہوتا مگر وہ نہ مانی۔ پتا نہیں جب پوری ڈاکٹر بن جائے گی میرا کیا حال کرے گی۔ اسے جس طرح میری صحت کی فکر رہتی ہے اس سے لگتا ہے وہ ڈاکٹری بھی صرف اسی لیے پڑھ رہی ہے۔

اس کی مرحومہ ماں صغریٰ بھی بڑی خدمت گزار اور محبت کرنے والی تھی لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق ہے، وہی جو مٹی کے برتنوں میں پکے کھانے

اور ویسٹ فوڈ میں ہوتا ہے یا جو تیکھے راگوں اور ڈسکو گیتوں میں ہوتا ہے۔ وہ تیز ڈرائیونگ کی شوقین ہے اور اس وقت بھی اس کے اپنے اندر کا نیا نکور انجن فراٹے بھرنے کے لیے بے قرار تھا۔ ٹریفک کے ہجوم، سگنلوں کی رکاوٹوں اور گاڑی کے کمزور انجن کی وجہ سے اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے اندر کی رفتار گاڑی کی رفتار سے کئی گنا زیادہ ہو۔ وہ سخت مضطرب دکھائی دیتی تھی مگر اس کے باوجود اس کا ریڈار ٹھیک کام کر رہا تھا اور وہ ادھورے کاموں اور ضرورت کی چیزوں سے متعلق میری فکرمندیوں سے آگاہ تھی اور انہیں خیالات کے بمبار طیاروں کو میرے ذہن پر حملہ آور ہوتے دیکھ سکتی تھی۔ دریا کے پل کے عین بیچ میں وہ یک لخت بولی "گٹھڑی باہر پھینک دیجیے سر۔"

"کون سی گٹھڑی؟" میں نے پچھلی سیٹوں پر رکھے سامان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جو آپ ساتھ اٹھا لائے ہیں؟"

"نہیں بچے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھینک دیجیے پلیز ماموں جان"

"اچھا...... لو...... پھینک دی...... اب چلو"

"ٹھیک ہے۔"

اسے میری صحت کا ہی نہیں پسند ناپسند کا بھی بہت خیال رہتا تھا اس نے نیرہ نور کی کیسٹ لگا دی۔

دریا پار بھی پھول کھلے ہیں...... آ جاؤ

میں ابھی اس بھولنے کا موڈ بنا رہا تھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے بچے؟"

"دریا پار تو لگتا ہے رک جاؤ۔" وہ اسی طرح ہنستے اور گنگناتے ہوئے بولی "ٹوٹے ہوئے دو روپے نکالو جلدی کرو۔"

ندا کے ہوتے ہوئے کسی علاج کی کیا ضرورت ہے میں نے دل میں سوچا۔

دریا کے پار ایک بڑا چوک تھا جہاں مختلف اطراف سے سڑکیں آ کر ملتی یا شاید جدا ہوتی تھیں۔ اس چوک کے ارد گرد ایک اور شہر بس گیا تھا جس میں موٹروں کے سپیئر پارٹس کی دکانیں، ورکشاپیں اور اڈے قائم ہو گئے تھے اور کارپوریشن آسندی شہر کی طوائفوں کی طرح لاریوں، ویگنوں کو کہیں اور منتقل کرنے پر غور کر رہی تھی۔ شہر کے شور و غل اور لاریوں، ویگنوں اور ٹرکوں کے ہارنوں کی آوازوں سے ہم جیسے جیسے دور ہوتے جا رہے تھے اتنا ہی اپنے قریب آتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے پھر اپنے اپنے اندر اپنی اپنی باتیں کرنے لگ گئے۔ دس پندرہ میل خاموشی میں گزر گئے۔ اندر سے نکلنے کی پہل بھی اسی نے کی، بڑی نہر کا پل آیا تو بولی، "آپ نے جھوٹ بولا سر"

"کیا بچے؟"

"یہی کہ آپ نے گٹھڑی پھینک دی۔"

"ہاں شاید ایک آدھ بچ گئی تھی لو وہ بھی پھینک رہا ہوں۔"

"بس یہی ایک ہے نا؟"

"ہاں آخری۔"

"نہر کے اندر ہی گری ہے نا؟"

"تم فکر نہ کرو۔"

شکر ہے اس نے میری طرف نہیں دیکھا ورنہ میں جس گھمن گھیر میں غوطے کھانے لگا تھا اس کا کرب میرے چہرے پر دیکھ کر کوئی حادثہ کر بیٹھتی۔ مجھے

گرداب سے نکلنے اور بحال ہونے میں دس میل لگے۔

پکی سڑک چھوڑتے ہی لگا جیسے ایک دوسری دنیا میں آگئے ہیں جہاں ہر چیز رکی رکی اور ٹھہری ٹھہری سی تھی۔ راستے تنگ اور موڑ بہت تھے پھر جگہ جگہ گڑھے اور کھائیاں۔ ریت، مٹی کیچڑ اور گرد و غبار۔ گاڑی کی رفتار پکی سڑک کے مقابلے میں چوتھائی رہ گئی تھی لیکن اپنے اردگرد حرکت کرتی چیزوں کے مقابلے میں اب بھی کئی گنا زیادہ تھی۔ حالانکہ میرے لیے کوئی چیز نئی نہیں تھی مگر جس طرح آدمی سمندر کا طویل سفر کر کے لوٹے تو بڑی بھاری جھیلیں بھی پہلے سے چھوٹی لگنے لگتی ہیں۔ مجھے بھی راستے کے چھوٹے چھوٹے گاؤں زیادہ چھوٹے، کچے مکان زیادہ کچے اور معمولی چیزیں زیادہ معمولی دکھائی دینے لگی تھیں۔ شکن سے بوجھ اٹھا کر آتی جاتی کھیتوں میں کام کرتی اور چھوٹے چھوٹے آنگنوں اور چھتوں پر کھڑی چھوٹی بڑی عورتوں کو اپنی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے دیکھ کر ندا خود کو بڑا محسوس کرنے لگی ہو۔ لیکن میری عمر الٹا سفر کرنے لگی تھی۔ میں ہر لمحہ چھوٹا ہوتا جا رہا تھا......

راستے کی دھول پر میری گرگابی کے نقشے اور میری بائسکل کے ٹائروں کی دھاریاں اب تک محفوظ تھیں جس طرح اونچائی پر آواز اور تصویر کے سگنلز بہتر ہو جاتے ہیں، اس کشادہ فضا میں پہنچ کر مجھے بھی برسوں پہلے کی آوازیں اور تصویریں صاف سنائی اور دکھائی دینے لگی تھیں۔ مجھے بانسری اور شہنائی کی آوازیں بہت بھاتی تھیں۔ خاص طور پر جب پریم کوٹیا جس کی دھوم سارے علاقے بھر میں مشہور تھی، شہنائی بجاتا۔ پریم کوٹ اس کے گاؤں کا نام تھا لیکن بعض لوگ اسے پریم کوٹیا بھی کہتے تھے۔ جب بھی وہ اکیلا خانقاہ میں یا کسی ٹیلے پر بیٹھ کر شہنائی بجاتا، لگتا شہنائی کے اندر منہ دے کر رو رہا ہے۔

جمعرات کو خانقاہ پر خوب رونق ہوتی دور دور سے گویئے، قوال اور سازندے آ کر چوکی بھرتے۔ مجھے راگ راگنیوں کا تو کچھ پتا نہ تھا مگر دل کو خوشی یا غم سے بھر دینے والے گیتوں آوازوں اور راگوں کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ بانسریوں، الغوزوں اور سارنگیوں کی آوازوں میں گھنے لمبے درختوں پر بیٹھی کوئلوں کی کوکیں اور گنبدوں پر بیٹھ بیٹھ کر اڑتے اور اڑ اڑ کر بیٹھتے پرندوں کی پھڑ پھڑ انہیں بھی شامل ہو جاتیں۔ اس دوران میں بعض لوگوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ بعض باقاعدہ حال کھیلنے لگتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کو رسوں کی مدد سے شہتوت کے درخت سے الٹا لٹکا دیا جاتا اور وہ دیر تک جھولتے رہتے۔

یہ بہت دلچسپ مگر خوفناک منظر ہوتا۔ بدن کا سارا خون چہرے اور بازوؤں کی رگوں میں بھر جاتا۔ وہ اتنے زور زور سے جھولتے کہ سارا درخت ہلنے لگتا اور رفتہ رفتہ وہ پرسکون ہو جاتا۔ یہ سارا کچھ اتنا مسحور کن اور ہیجان خیز تھا کہ گاؤں کے لڑکوں کے حال کھیلنے کے مقابلے ہونے لگے۔ مجھے حال کھیلنے کا شوق نہیں تھا لیکن دوسرے لڑکوں کی دیکھا دیکھی یا شاید تجربہ کرنے کی خواہش میں ایک روز میں بھی گڑ کی ڈھیلی لے کر پیر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ پیر صاحب نے گڑ دم کر دیا مگر مسکرا کر کہنے لگے تمہارے دل میں میل ہے بیٹا۔ اسے دور کرو گے تب اثر ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا میرے دل میں کیا اور کیسا میل تھا، مگر دم کیے ہوئے گڑ کا مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔

"یہ کیا ہیں ماموں جان" ندا نے مجھے چونکا دیا۔ وہ

اڑتے ہوئے پرندوں کی ڈار کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کونجیں ہیں بچے۔"

"اچھا تو یہ وہ ہیں" وہ خوش ہو کر بولی "کونج دیچھڑ گئی ڈاروں۔"

اس نے گاڑی کو تھرڈ گیئر میں ڈالا مگر میرے اندر پھر ریورس لگ گیا۔

بھائی بہنوں میں سب سے بڑا میں تھا۔ سب سے پہلی اڑان بھی میرے حصے میں آئی۔ بوڑھے پیچھے پردیس بھیجنے والی ماں جی پتا نہیں کیسے اور کس دل سے مجھے تیس میل دور قصبے کے ہائی سکول میں داخل کرانے پر رضا مند ہو گئیں۔ مزید تعلیم، روزگار اور بہتر کیریئر کی خاطر پھر اس فاصلے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبھار چھٹی پر گاؤں آتا اور مہمانوں کی طرح کچھ روز رہ کر واپس چلا جاتا۔ شروع شروع میں گھر کی یاد ستاتی۔ گاؤں، گاؤں کے لوگ اور اپنے کلم کا نام، گیڑ آگڑ انگا اور بندر کلا کھیلتے دوست یاد آتے، لیکن پھر آہستہ آہستہ پردیس میں جی لگنے لگا۔ نئی نئی جگہوں پر نئی نئی دوستیاں اور رشتہ داریاں قائم ہو گئیں۔ شہر میں گھر بن گیا تو دیس پردیس میں کچھ فرق نہ رہا۔

آہستہ آہستہ دوسرے بہن بھائی بھی ایک ایک کر کے گاؤں چھوڑ گئے۔ ماں جی پہلے ہی سب کو چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ گھر میں ابا اور بیوہ پھوپھی رہ گئے۔ کبھی کبھی شادی بیاہ یا کسی تہوار پر سب گاؤں میں جمع ہو جاتے تو گھر بھر جاتا۔ پسارے میں چارپائیاں نہ سماتیں۔ سب رات رات بھر جاگتے اور باتیں اور بحثیں کرتے۔ لطیفے اور کہانیاں سناتے، اپنا اپنا احوال کہتے اور اپنی اپنی اچھی یا بُری آواز میں فرمائشی گیت اور منظوم داستانیں سناتے۔

سات میل کا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہوا۔

گھر کے صدر دروازے پر پڑا تالا دیکھ کر عجیب سا لگا۔ پڑوس والے جن کے ذمے گھر کی دیکھ بھال تھی، فوراً ہی چابی لے آئے۔ صحن میں ہر طرف کے دنوں کی یادیں اور خوابوں کی کرچیاں سو گئے ہوں کی صورت بکھری پڑی تھیں۔ جامن کے پیڑ پر شہد کا چھتا تھا۔ مکھیاں اپنے اپنے حصے کا شہد کھا کر اور خالی چھتہ چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ پسارے کا دروازہ کھولا تو اندر کی باسی ہوا آنکھیں ملتی باہر آئی اور گلے لگ کر ہچکیاں لینے لگی۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے ہینڈ پمپ کا ہتھ کیا تو پتا چلا پانی اتر چکا ہے شاید واشر بھی سوکھ گئی تھیں۔ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ندا نے گاؤں کی عورتوں سے مل کر پورے گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کر ڈالی۔ رات کا کھانا پڑوسیوں کے ہاں سے آ گیا۔ ہم تھکے ہوئے تھے بہت سا کام اگلے روز پر ملتوی کر کے اور بتی بجھا کر جلد ہی سو گئے۔

پتا نہیں رات کے کس پہر میں میری آنکھ کھل گئی۔ ندا دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ میں نے کروٹ بدل کر دوبارہ سو جانا چاہا مگر نیند نہ آئی۔ پھر لگا جیسے یادوں کے بھڑ والے کا بین کھل گیا ہو۔

وہ پہلی اور آخری بار ہمارے ہاں آئی تھی۔

اس سے دور کی رشتہ داری تھی مگر وہ بہت ہی اپنی اپنی لگ رہی تھی۔ اس نے کوئی منت مانی ہوئی تھی، شاید اپنی بیوہ ماں کے ساتھ خانقاہ میں چڑھاوا چڑھانے آئی تھی۔ رات کو پسارے میں جب باری باری سب گا ناچ چکے، کسی نے ہیر، کسی نے ماہیا اور کسی نے سٹھنیاں سنائیں تو اس نے بھی سب کے اصرار پر منور سلطانہ کا ایک گیت سنایا "دلا کچیا قرار دیا کچا"۔

ترانہ شرما کے ساتھ کہ اس کے گانے کے دوران میں بتی گل کر دی جائے۔ پھوپھی جی نے صغریٰ کو بتی بجھانے کو کہا مگر صغریٰ نے چالاکی کی اور لالٹین بجھانے کے بجائے اس کی لو اتنی مدھم کر دی کہ سب کچھ دکھائی دے مگر جب وہ گا رہی تھی اچانک روشنی ہو گئی۔ میں نے اس کی مترنم ہنسی اور رسیلی باتیں سنی تھیں۔ بات گانے تک محدود نہ رہی کئی بار کن رہا تھا پہلے تو لگے جب ہوا یہ اس کی آواز کا چکارا ہے مگر پھر پتا چلا دوں نے شرارت کی تھی۔

پتا نہیں ندا نے میری گھڑی کہاں رکھ دی تھی۔ میں نے وقت دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا اور وال کلاک کی طرف دیکھا، وہ آٹھ بج کر چالیس منٹ پر رکا ہوا تھا، پتا نہیں یہ آٹھ چالیس کس مہینے کی کس تاریخ کے تھے۔ کبھی کبھار سال دو سال میں ہم میں سے کوئی چند روز کے لیے یہاں آتا تھا گھر کی جھاڑ پونچھ کی جاتی، چوہوں کے بل بند کیے جاتے، چھتوں سے جالے اتارے جاتے، دیمک مار دوائی اور پھینائل چھڑکی جاتی، پڑوسیوں سے بجلی کے بل کا حساب بے باق کیا جاتا اور وال کلاک میں نئے سیل لگائے جاتے۔

مجھے لگا میرے اندر بھی ایک کلاک تیس برس پہلے کے ایک خاص لمحے پر رکا ہوا ہے جو نئے سیل ڈالنے سے چل سکتا ہے نہ اسے دنیا کا کوئی بھی گھڑی ساز ٹھیک کر سکتا ہے۔ میں اس سے آگے کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ توجہ ہٹانے کے لیے پرچھتیوں پر سجے برتنوں کو دیکھنے لگا۔ کانسی کے گلاس اور کٹورے، کٹوریاں پیتل کی گاگریں، کمروے اور پراتیں، جگ، لوٹے، ڈونگے اور گاجو، تانبے کی منقش سینیاں، چھاننے اور

پیتل کی کڑاہیاں۔ سب کالے ہو رہے تھے۔ میرا ارادہ گاؤں کی عورتوں کی مدد سے انہیں دھلوانے منجھوانے اور قلعی کرانے کا تھا مگر ندا نے ایک عجیب سی بات کر دی تھی۔ کہنے لگی کیوں نہ انہیں کسی انٹیک شاپ کے حوالے کر دیا جائے۔

اس کا خیال تھا اگر یہ برتن محض سجاوٹ کی غرض سے رکھے گئے تھے تو ان سے بہتر چینی شیشے، پلاسٹک اور سٹین لیس سٹیل کے برتن خریدے جا سکتے تھے۔ ندا نے یہ بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی شاید اس لیے کہ اس کا ان سے براہ راست کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا۔ البتہ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ انٹیک شاپس پر غیر ملکی سیاح ایسے برتنوں میں کیوں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ چیزیں جتنی قدیم ہوں وہ اتنے ہی زیادہ دام دینے کو تیار ہو جاتے ہیں کیا ان کے پاس اپنا ماضی نہیں ہے یا وہ ہمارے آبا کی کتابوں کی طرح ہماری ثقافت کو بھی محفوظ کرنا چاہتے ہوں یا پھر کیا خبر وہ اپنے حال کی چکا چوند سے گھبرا گئے ہوں۔

مجھے یاد آیا، عید سے کچھ روز پہلے ماں جی ان برتنوں کو دھلواتیں، نیلا رنگ ملا کر دیواروں پر سفیدی کراتیں، گھڑونج پر مٹی کے برتنوں کی بہت سی پالیاں تھیں جن کے درمیان میں کہیں کہیں تانبے اور پیتل کی دیگچیاں اور گاگریں بھی ہوتیں۔ وہ مٹی کے برتنوں پر گیری کا پوچا پھرواتیں۔ آٹھ دس پالیوں میں آٹھ آٹھ دس دس برتن تھے۔ ماں جی کو ایک ایک برتن کی پہچان تھی اور یہ بھی یاد تھا کون سا برتن کہاں سے اور کب خریدا تھا۔ ابا گھڑونج کو ماں جی کی کریانے کی دکان کہتے۔ چاول، دالیں، گڑ، چینی، چنے اور پکوان کے لئے ساری چیزیں۔ وہ انہی گھڑوں گاگروں میں

تھیں۔ گھر کے خرچ کے پیسے اور بعض اوقات زیور بھی انہی میں چھپا دیتیں۔

اچانک صبح کے سات بج گئے۔ ندا کے کمرے میں رکھی میوزک ڈیک جو اس کے ابا نے حال ہی میں اس کے لیے دبئی سے بھیجا تھا اور وہ اسے ساتھ لے آئی تھی، گھڑی کے الارم کی طرح خود بخود آن ہو گیا تھا اور وہ سلطانہ گانے لگی تھی "دلا کچیا قرار دیا کیا کہے دے ہاں گل نہ کریں۔"

مجھے حیرت ہوئی ندا نے میری پسند کا اتنا پرانا گیت کہاں سے حاصل کیا تھا؟ بے شک شہر میں میرے پاس اس گیت کا 78 آر پی ایم کا ایک ریکارڈ موجود تھا مگر ریڈیو پروگرام بجائے اور یہ گیت سنے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ اب سی ڈی پلیئر نے لے لی تھی۔ وہ خود انگریزی کے ڈسکو گیتوں کی دیوانی تھی اسے یہ گیت کہاں سے مل گیا اور اسے کیسے پتا چل گیا کہ یہ میرا محبوب گیت ہے۔ ممکن ہے وہ گاؤں کی مناسبت سے پنجابی گیتوں کی کچھ کیسٹیں خرید لائی ہو اور اتفاق سے ان میں یہ گیت بھی موجود ہو۔ اگر ایسا تھا تو کیا حسین اتفاق تھا۔

مجھے اپنا ہیڈ فون ریڈیو یاد آ گیا۔ جب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا میں نے بچوں کے ایک رسالے میں دی گئی ترکیب کے مطابق ہیڈ فون ریڈیو سیٹ بنایا تھا۔ گاؤں میں کسی کو بھی سوائے پیر صاحب کے یقین نہیں تھا کہ تانبے کی چند تاروں اور سرمے کی ڈلی سے ریڈیو بن جائے گا۔ مگر جب وہ سچ مچ بولنے لگا تو دور دور تک اس کے چرچے ہوئے۔ لیکن اس ریڈیو سیٹ میں ایک خرابی تھی۔ اس پر بہت سے ریڈیو اسٹیشن ایک ساتھ بولتے تھے اور اگرچہ قریب ترین ریڈیو اسٹیشن کی آواز نمایاں سنائی دیتی مگر رات کے وقت کئی دوسرے ملکوں اور زبانوں کے پروگرام اور گیت ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگتے۔ مجھے ان اسٹیشنوں کو کنٹرول کرنے کی ترکیب معلوم نہیں تھی کیونکہ یہ رسالے میں نہیں دی گئی تھی۔ ایک روز پیر صاحب نے خانقاہ میں بلا کر ریڈیو کے بارے میں تفصیل پوچھی تو میں نے انہیں اپنی مشکل بتائی۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔

"کثرت میں وحدت کی تلاش کے لیے ایک جتن لگانا پڑتا ہے۔"

"کونسا جتن پیر جی" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ دل میں سوچ رہا تھا اگر نام کا پتا چل جائے تو کل ہی شہر جا کر کسی کباڑیے سے خرید لاؤں گا۔

"توحید کا جتن"

انہوں نے کہا۔ "یہ اپنے انداز میں لگانا پڑتا ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا شاید انہوں نے معرفت کی کوئی بات کی تھی وہ ایسی ہی مشکل اور گول مول باتیں کیا کرتے تھے۔ کاش انہوں نے میری زندگی کے اہم ترین واقعے سے متعلق بھی ایسی ہی گول مول بات کی ہوتی تاکہ شک کی کچھ تو گنجائش رہتی۔ میں ان سے آنکھیں تو ملا سکتا۔

رقعہ پڑھ کر میں بھاگا بھاگا خانقاہ پہنچا تھا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ کل وہ لوگ آ رہے ہیں اگر تم آج نہیں آئے تو میرے مرنے کی خبر سنو گے۔

"پیر جی...... کیا کروں؟"

"دیر نہ کرو۔"

"لیکن دو روز بعد میرا بی۔ اے فائنل کا امتحان

ذبح ہونے والا ہے لیکن کسی دوسرے امتحان میں نہیں
پہنچ سکے تو" "پچھتاؤ گے۔"

اول تو میں ذہنی طور پر تیار ہی نہ تھا دوسرے اگر
میں چالیس میل کا سفر کر کے کسی طرح وہاں پہنچ بھی
جاتا تو کیا کر لیتا؟ پھر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا
کر گزرے گی۔ پیر صاحب کے اصرار پر میں نے ان
کے سامنے حامی بھر لی لیکن گھر والوں کو بتانے یا اس
کے گاؤں جانے کے بجائے شہر چلا گیا اور امتحان کی
تیاری کرنے لگا۔ چوتھے پانچویں روز اس کے گاؤں کا
ایک آدمی ملا جس نے بتایا وہ نہر پر کپڑے دھونے گئی
پاؤں پھسل گیا اور گر کر ڈوب گئی میرے اندر چھناکے
سے کوئی چیز ٹوٹی اور کلاک رک گیا۔

گیارہ بارہ روز تک اس کی لاش کی تلاش ہوتی
رہی مگر نہ ملی۔ ڈیڑھ مہینے بعد نہر بند ہوئی تو پانچ میل
دور ریت میں دبا ہوا ڈھانچہ ملا۔ ماس گل سڑ گیا تھا یا شاید
مچھلیاں کھا گئی تھیں۔ میں نے کئی روز تک شیو نہ کی،
بال نہ سنوارے، بیڈ پر نہ سویا۔ مٹھائی اور گوشت نہ کھایا
اور گاؤں کا رخ نہ کیا۔ سوگ منانے کے لیے میرے
بس میں یہی کچھ تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ احساس جرم اور پشیمانی کا
بوجھ دل و دماغ پر بڑھتا رہا۔ کیا پتا اس میں پیر صاحب
کی خفگی اور بددعا بھی شامل ہو۔ میں نے اس کے بعد
آج تک انھیں اپنی شکل نہیں دکھائی تھی کیا منہ لے کر
جاتا۔

"سلام ماموں" ندا نے مجھے چونکا دیا۔ وہ درمیانی
دروازے میں میرے لیے چائے لیے کھڑی تھی۔

اس روز میں زیادہ تر گھر پر ہی رہا۔ ملنے ملانے
والے آتے جاتے رہے، ان میں زیادہ تر لوگ میرے
ہم عمر تھے۔ ان میں سے بعض کو دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا۔
جن لوگوں سے بچپن اور لڑکپن کے بعد نہ ملا جائے وہ
آپ کے تصور میں اسی طرح اچھلتے کودتے اور شرارتیں
کرتے رہتے ہیں مگر اصل صورت حال مختلف تھی۔ بھنچے
گئے گلاب بدنوں پر پچاس عمر کی اڑائی ہوئی خاک اور
چاند چہروں پر ظلم کا نا کھیلتے بے فکرے شب و روز کی نک
چھپ کر کھینچی اور کاٹی ہوئی لکیریں۔۔۔۔۔ چیچو چیچو
کی ریلیاں دو تیریاں دو میریاں! دوپہر کو وال کلاک پر
پھر نظر پڑی تو وہ چل رہا تھا یقیناً ندا نے سیل منگا کر
ڈال دیے تھے لیکن میرے اندر کا کلاک اب تک تیس
برس پہلے کے ایک خاص لمحے پر رکا ہوا تھا اور سیل
ڈالنے سے چل سکتا تھا نہ اسے دنیا کا کوئی گھڑی ساز
ٹھیک کر سکتا تھا۔

یوں تو ندا نے گاؤں میں بہت سی دوستیاں بنا لی
تھیں اور شہر سے دوائیاں اور ٹیکے منگوا منگوا کر بیمار
عورتوں اور بچوں کا مفت علاج کرتی پھرتی تھی لیکن
ایک روز میں اسے گھوڑے پر بٹھا کر باہر گھمانے لے
گیا۔

گھوڑے پر بٹھا کر اور لگام تھام کر میں آگے آگے
چلنے لگا تو مجھے اس کا بچپن یاد آ گیا۔ جی چاہا خود اس کا
گھوڑا بن جاؤں مگر اب یہ ممکن نہ رہا تھا۔ وہ اچانک
کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

"کیا ہوا بچے؟"

"کچھ نہیں ماموں" میں نے اصرار نہیں کیا۔ میرا
اندازہ تھا اسے بھی اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔

جاڑے کی سہ پہر کی دھوپ چاروں طرف پھیلی
ہوئی تھی۔۔۔۔ کسان عورتیں اور مرد کھیتوں میں کام کر
رہے تھے۔ پرندے ابھی سے ایک دوسرے کو رات کے

کے لیے پکارنے لگے تھے۔ کپاس ہنس رہی تھی اور سرسوں اپنے بسنتی جوڑے میں پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ بہت خوش ہو رہی تھی کہنے لگی۔

"جی چاہتا ہے ان کھیتوں میں دوڑتی چلی جاؤں۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کہاں تک۔"

"دور تک...... جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں۔"

میں حیران رہ گیا۔ کیا سب خوبصورت اور جوان لڑکیاں ایک جیسا سوچتی ہیں یا کہیں کوئی بھٹکتی روح اس میں حلول کر گئی ہے؟

"اتنی دور سے واپسی میں دیر نہیں ہو جائے گی بی بی؟" میں نے گفتگو کو نیا رخ دینے کی کوشش کی۔

"واپسی تو آسان ہوتی ہے ماموں" وہ بولی۔ "راستہ دیکھا بھالا ہوتا ہے نا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر ڈر تب تو انجان راستے پر سفر شروع کرتے وقت ہوتا ہے۔"

وہ جیسے ٹھیک طرح سے میری بات سمجھ رہی ہو، بولی۔ "مگر وہ بھی اگر ارادہ مضبوط نہ ہو اور لگن سچی نہ ہو۔"

"ہاں بیٹی۔" میں نے بات ختم کر دی مجھے اس کی باتوں سے خوف آنے لگا تھا۔

ابھی ہم خانقاہ کے قریب سے گزرے تو کہنے لگی۔

"گاؤں آ کر آپ کی صحت بہتر ہو گئی ہے۔"

"ہاں دورہ وغیرہ نہیں پڑا۔"

"اور بہتر ہو سکتی ہے۔" وہ بولی "اگر آپ پیر صاحب سے مل لیں۔ سنا ہے ان کی دعا میں بڑا اثر ہے۔"

ہم جب سے گاؤں سے آئے تھے وہ مسلسل اصرار کر رہی تھی میں پیر صاحب سے ملوں مگر میں ٹال جاتا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم عورتیں خواہ کتنی تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہو جاؤ ایسی باتوں میں تمہاری دلچسپی کم نہیں ہوتی۔"

"آپ مل کر تو دیکھیں۔ میں ساتھ چلتی ہوں۔"

میں نے سنا تھا ان کی نظر جاتی رہی تھی۔ اتنی مدت بعد وہ مجھے صرف آواز سے کہاں پہچان سکیں گے۔ اس خیال سے میں نے حامی بھر لی۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ مگر تم میرا تعارف نہ کرانا۔"

"منظور ہے" وہ بولی "آپ چلیں تو سہی۔"

میں کئی برس بعد خانقاہ کے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ لیکن وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ سوائے ایک برگد کے جو پہلے سے زیادہ بڑا اور گھنا معلوم ہوتا تھا۔ اس برگد کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر دور تک پھیل گئی تھیں اور گاؤں میں جہاں کہیں بھی کھدائی کی جاتی تھی یہ جڑیں ہر جگہ برآمد ہوتی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بعض پرانے مکانوں میں جو شگاف پڑ گئے تھے وہ بھی اسی کی وجہ سے تھے۔

گھوڑے کو احاطے کی دیوار کے ساتھ چھوڑ کر ہم آگے بڑھے۔ پیر صاحب حجرے میں لوئی اوڑھے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقہ پی رہے تھے۔ ان کے ارد گرد آس پاس کے دیہات سے آئے ہوئے بہت سے مرد، عورتیں بیٹھے تھے۔ پیر صاحب باری باری سب کی بات سنتے کسی کو دم کرتے کسی کو تعویذ دیتے اور

کسی کو کوئی نسخہ بتا کر رخصت کرتے۔ سائل الٹے پاؤں واپس آنے سے پہلے حسب توفیق نقدی کی صورت نذرانہ پیش کرتا جسے وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر تکیے کے نیچے رکھ دیتے پانچ پانچ دس دس روپے کے چھوٹے چھوٹے نذرانے۔ انہی چھوٹے چھوٹے نذرانوں سے پیر صاحب نے مزار کے عقب میں شاندار کوٹھی تعمیر کی تھی۔ زمین خریدی تھی اور ان کے بیٹوں نے شہر میں کاروبار لگایا تھا۔ہم ایک طرف بیٹھ کر بھیڑ کم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب زیادہ تر لوگ چلے گئے تو ہم اٹھ کر پیر صاحب کے قریب گئے اور سلام کر کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کہاں سے آئے ہو اور کیا چاہتے ہو۔" انہوں نے پوچھا۔

"میرا نام ندا ہے ہم شہر سے آئے ہیں یہ میرے ماموں ہیں۔"

"ڈاکٹری پڑھ رہی ہو۔" پیر صاحب کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا۔ مگر ندا نے اطمینان سے جواب دیا۔

"جی پیر جی۔"

"لوگوں کی خدمت کرنا۔ کسی کی مجبوری سے کبھی فائدہ نہ اٹھانا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں پیر جی ایسا ہی کروں گی۔"

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

"اللہ تیرے ہاتھ میں شفا دے۔"

"میرے ماموں بیمار اور پریشان رہتے ہیں آپ ان کی تندرستی کی دعا کریں۔"

"یہ خود کیوں نہیں بولتا۔ کیا شکایت ہے؟"

"دورے پڑتے ہیں پیر جی۔"

میں نے آواز بدل کر ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

پیر صاحب کچھ دیر خاموش رہے میں سمجھا کچھ پڑھ رہے ہیں لیکن وہ غصے بھری آواز میں بولے "اس سے پوچھ بیٹی یہ وہاں کیوں نہیں گیا تھا جہاں اسے بھیجا گیا تھا۔"

میں لرز گیا۔ وہ اس قدر پہنچے ہوئے بزرگ تھے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"مجھے معاف کر دیجئے پیر صاحب" میں نے گڑ گڑا کر کہا۔

"تمھارے دل میں میل تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولے۔

"معاف کر دیجئے پیر صاحب! ندا بولی "میری خاطر۔"

"ٹھیک ہے۔" ان کا لہجہ بدل گیا بولے "وعدہ خلافی بری بات ہے۔"

"اب ماموں ٹھیک ہو جائیں گے۔" ندا کہنے لگی "آپ کا بہت شکریہ پیر صاحب۔"

"اللہ اسے صحت دے۔" انہوں نے کہا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہو گیا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، لگا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ سوچا، ممکن ہے انہوں نے اپنی روحانی طاقت سے مجھے خود یہاں بلایا ہو۔ ندا تو محض واسطہ تھی۔ کچھ بھی تھا لیکن میرے دل سے واقعی بہت سا بوجھ کم ہو گیا۔ ایک انجانا خوف دور ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ہم شکریہ ادا کر کے اور سلام کر کے رخصت ہوئے تو ندا بہت خوش اور مطمئن لگ رہی تھی اور میں پیر صاحب کی ناراضی کا سبب جاننے کے لیے

اس کے سوالوں کی بوچھاڑ سے گھبرا رہا تھا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ شاید اسے میرے اچھا ہو جانے سے زیادہ کسی بات سے دلچسپی نہ تھی مگر میری بے چینی پوری طرح دور نہ ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے تو معاف کر دیا تھا لیکن؟

اگلے روز ہم واپس آ گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے نبا سے کہا ”میں پیر صاحب کی روحانیت کا بے حد قائل ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ کر باقی زندگی انھی کے قدموں میں گزار دوں۔“

وہ جیسے کھلکھلا کر ہنسنا چاہتی تھی مگر کسی وجہ سے اچانک سنجیدہ ہو گئی بولی ”پیر صاحب خدا ترس اور اچھے انسان ہیں لیکن آپ انھیں دوبارہ زحمت نہ دیں تو بہتر ہے۔“

”کیوں بھئی؟“

”اس لیے کہ رابعہ مری نہیں تھی اسے بچا لیا گیا تھا۔“

میں حیرت اور خوشی سے جیسے اچھل پڑا۔ خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”تم اسے کیسے جانتی ہو اور تمھیں کیسے معلوم ہے کہ وہ زندہ ہے۔“

”آئی ایم ویری سوری ماموں جان......“ وہ بولی ”میں آپ کا مرض جاننے کے لیے بغیر اجازت آپ کی پرسنل ڈائری پڑھتی رہی۔ میرا خیال تھا پیر صاحب سے مل کر آپ کے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا لیکن گاؤں آ کر اور بہت سی باتوں کا پتا چلا۔ میں اسے مل چکی ہوں“

مجھے اس کا اپنی ڈائری پڑھنا برا لگا مگر خبر اس سے زیادہ اہم تھی میں نے پوچھا۔

”کہاں ہے وہ؟“

نظم

جن پرندوں کو قید رکھتے ہو تم انھیں چھوڑ کر ذرا دیکھو
آ گئے گر تو تم ہی ظالم تھے نہ آئے گر تو وہ تمھارے ہیں
جن حالات پہ چیخ پڑتے ہو خون روتے ہو سر پٹختے ہو
کل انھیں جو دھوپ ہو جائیں گی تمھیں جو کبھی نہ پڑی ہوں
بھول جاؤ تو مفلس و قلاش، یاد رکھو تو اک اثاثہ ہیں
زندگی کے اداس لمحوں میں اک تسلی ہیں اک دلاسا ہیں
سنگ کھاؤ نہ سنگ برساؤ سنگ دل سے ہمیشہ کتراؤ
نرم دل گر کبھی ملے کوئی نرم دل کو تم بھی اپناؤ
سب ہی لوگوں کے دل میں بس جاؤ زندگی جا رہی ہے تیزی سے
موت بڑھتے اک دھیمی چادر آ رہی ہے تمھیں اڑھانے کو
کلے لگے اپنے تمھیں لگنے کو کیا کوئی بند باندھ سکتے ہو
جس نے جانا ہے جا کے رہتا ہے جس نے آنا ہے آ کے رہتا ہے
آنے والے ترا خدا حافظ، جانے والے تجھے خدا حافظ

(تنویر خواجہ)

”وہ اس روز میں نے انجکشن منگوائے تھے......“

”وہ بولی ”تو کیا وہ اسی ہمارے گاؤں میں ہے؟“

”ہاں پیر صاحب کے گھر میں...... انھوں نے اسے بچایا اور نکاح کر لیا تھا۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ہنسوں یا روؤں لیکن میرے اندر برسوں سے رکا ہوا کلاک اچانک ٹک ٹک کرنے لگا تھا۔

■■■

قیمتی گٹھڑی

ایک نور جہاں کا دلدوز قصہ، ایک بوڑھے اس کی پوری دنیا ایک گٹھڑی میں سما گئی تھی...... گٹھڑی اٹھانے والے نے ایسے خون آلود ٹوٹے پروں والے فرشتے کو پہلے کب دیکھا تھا

نیلم احمد بشیر

نہ جانے اس کا نام کیا ہو گا؟ رامو سوچتا۔ چہرہ تو بالکل اداکارہ نور جہاں کی طرح تھا۔ گول مٹول، سرخ سفید، بھرا بھرا، روشن چمکتی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور پھر آواز جیسے گرمیوں کی رت میں چھمن کاکا کے آموں کے باغ میں کوئل کوکتی ہو۔ کیسے ہونٹ گول گول گھما کر اپنی سہیلی کو آواز دیتی تھی۔ ”کانتا اری، کانتا...... جلدی کر...... ریل چھوٹنے والی ہے۔“ بالکل نور جہاں لگتی تھی۔ رامو نے بچپنے ہی میں دلیپ اور نور جہاں کی فلم ”جگنو“ امرتسر کے سینما میں دیکھی تھی اور تبھی سے وہ نور جہاں کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

یہ لڑکی بھی تو ویسی ہی دکھتی تھی۔ پیاری، معصوم، بھولی بھالی مگر حوصلہ مند، حوصلہ مند نہ ہوتی تو بھلا یوں امرتسر سے لاہور کے کسی کالج میں پڑھنے کے لیے بھی جاتی؟ ایسا تو کوئی جی دار لڑکی ہی کر سکتی تھی۔ اوپر سے مسلمان، یہ تو حد ہی ہو گئی تھی۔ کالا برقع پہنے جب وہ پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی پورا امرتسر اسٹیشن بتیاں جلائے بغیر جگمگ جگمگ کرنے لگتا۔ عارضِ حسن کا مہین نقاب الٹتی تو یوں لگتا جیسے چودھویں کا چاند ہی نکل آیا ہو۔ چھب ایسی نرالی کہ اس کے پلیٹ

وہ ہر چند روز بعد باقاعدگی سے اتوار کے روز دو بجے دوپہر کی گاڑی نمبر ۲۰ سے سوار ہوتی اور پھر دو ہفتے بعد جمعہ کی شام چار بجے والی ریل سے واپس امرتسر آ جاتی تھی۔ جاتے سے ہاتھ میں کتابیں، ٹفن کیریئر، کئی قسم کی ٹوکریاں اور دستی بیگ ہوتے جو

واپسی میں خالی ہوتے۔ رخصت کے سمے اس کے ماں باپ، بہن بھائی، نم آنکھوں سے اسے جدا کرتے، سر پر ہاتھ پھیرتے، چومتے، نصیحتیں کرتے تھے۔ یہ مناظر رامو نے کئی بار دیکھے مگر اس کا جی کبھی نہ بھرا۔ پلیٹ فارم پر جھاڑو لگاتے ہوئے وہ اکثر اس کی کھڑکی کے قریب آ کر دھیرے دھیرے ہاتھ چلاتا تاکہ اس کی اس کے گھر والوں کی آپس کی باتیں سن سکے۔ اس کے ساتھ اس کی ہم جماعت لڑکی کاتا بھی ہوتی تھی جس سے وہ اکثر کالج کی باتیں کرتی دکھائی دیتی تھی۔

کبھی کبھار وہ صفائی کرتا کرتا ان کے ڈبے کے اندر تک آ جاتا تو وہ دونوں شریر سہیلیاں اس سے خصوصی صفائی کرنے کو کہتیں اور پھر انعام کے طور پر کچھ پیسے یا کوئی کھانے کی چیز دے کر ہی چھوڑتیں۔ وہ خوشی اور شرم سے لال ہو جاتا، بار بار نہ کرتا مگر وہ باز نہ آتیں۔ کتنا مزا آتا تھا اسے ان کے قریب ہو کر، چند لمحے ان کی کھنکتی ہوئی آوازیں سننے میں۔ رامو سرشار ہو کر جھاڑو اپنے کاندھے پر ٹکا کر، سر لگا کر جگنو فلم کے گانے کا انترہ گنگنانے لگتا "ابھی کچھ ہے..... ابھی کچھ..... ابھی کیا تھا، ابھی کیا ہے۔" قوس قزح کے خوبصورت رنگ اس کے قدم چومتے گدگداتے تو وہ نہال ہو جاتا۔

کبھی کبھی سوچتا ان دونوں لڑکیوں کے ماں باپ کتنے عجیب لوگ ہوں گے جو اپنی کھلے گلابوں کی سی خوبصورت جوان لڑکیاں شہر سے اتنی دور پڑھنے کے لیے بھیج دیتے ہیں؟ ایسی کون سی پڑھائی ہے جو دوسرے ہی شہر جا کر کی جاسکتی ہے؟ یہ تو اس کے علم میں تھا کہ کئی لڑکے بھی امرتسر سے سائیکلوں پر سوار ہو کر لاہور پڑھنے جاتے تھے مگر لڑکیاں؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یقیناً یہ لڑکیاں یا تو باولی ہیں یا پھر ان کے ماں باپ کو ان کی کوئی فکر ہی نہیں ہے اور پھر اپنی نور جہاں یہ نام اس نے خود ہی گھڑ لیا تھا۔ وہ باولی لگتی تو نہیں تھی، ٹھیک سمجھ دار، عقل مند دکھتی تھی۔ بہادر بھی تھی مگر خیر اتنی بہادر بھی نہیں تھی۔ رامو اس کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا تھا۔ اسے یاد آیا، ایک روز سیٹ کے نیچے چوہے کو دیکھ کر نور جہاں بی بی نے اتنی زور سے چیخ ماری تھی کہ کبھی مسافر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جلدی جلدی نور جہاں نے کھڑکی میں سے اشارہ کر کے رامو کو اندر بلایا تو رامو کو لگا جیسے وہ اسے کوئی پیار کا سندیسہ بھیج رہی ہے۔ وہ لپک جھپک اپنا بڑا سا جھاڑو، مور کے پنکھ کی طرح پھیلائے، سرکس کے کسی کرتب دکھانے والے کی سی پھرتی سے ڈبے کے اندر گھس آیا اور چوہے کو کسی نہ کسی طرح پکڑ کر ہی دم لیا۔ مرے ہوئے چوہے کو وہ فخریہ انداز میں جھاڑو پر لٹائے نور جہاں کے پاس سے گزرا تو جی چاہا اس خبیث بے ادب چوہے کو دم سے پکڑ کر اپنی ملکہ عالیہ کے دربار میں پیش کر دے مگر پھر نہ جانے کیوں ایسا کرنا اسے مناسب نہ لگا۔

کیا خبر نور جہاں پھر سے ڈر جائے، بلکہ ڈر کے مارے کہیں اس سے چمٹ ہی نہ جائے، اور پھر میرے کپڑوں کی باس..... نہیں نہیں یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ پھر نور جہاں کی خوفزدہ سرخ آنکھوں اور زرد گلاب جیسے چہرے نے اسے یہی بتایا کہ اس نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا تھا۔ نور جہاں کی تشکرانہ نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تو رامو کی چھاتی اور چوڑی ہو

گئی۔ اسے لگا وہ جگنو فلم کا دلیپ کمار ہے۔ اس نشے میں اس نے ایک نظر بھر کر نور جہاں کی طرف دیکھا تو اسے گمان ہوا، وہ اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرائی بھی تھی۔ رامو کا جی تو بہت چاہا مگر اس میں اتنی جرأت پیدا نہ ہوئی کہ دیکھتا کہ وہ واقعی مسکرائی تھی یا اسے بس یونہی لگا تھا کہ وہ مسکرائی ہے۔

اس روز رامو نے گھر پہنچ کر ماتا سے شکر کی دو بڑی بڑی بھری روٹیاں فرمائش کر کے پکوائیں اور خوب کڑک کر کے چائے کا بڑا سا پیالہ پیا۔ اسے غیر معمولی طور پر خوش دیکھ کر ماتا بھی اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ "کیوں پتر کیا بات ہے؟ آج تو بڑا خوش لگ رہا ہے؟ کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟" رامو نے یہ سن کر منہ لٹکا لیا اور چائے کے بچے ہوئے ٹھنڈے میٹھے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ اسے پتا تھا، ماں نے اسے کس بات کا طعنہ دیا تھا۔ علاقے کے اکثر جمعداروں کو ریلوں، پلیٹ فارموں کی صفائی کرتے کرتے کوئی نہ کوئی قیمتی چیز ہاتھ لگ جاتی تو اس کا بھی ڈھنڈورا پٹتا۔ کبھی کسی مسافر کا گرا ہوا کرنسی نوٹ، کوئی قیمتی دوشالہ، سونے کا جھمکا، زنجیر یا پورا بٹوہ بھی مل جایا کرتا تھا۔ ایسے میں ڈھونڈنے والے کی خوشی دیدنی ہوتی۔ وہ ساتھیوں کی حسرت بھری، چمکتی نگاہیں بھول کر اپنی دریافت پر خوش ہو کر ناچ اٹھتا اور کبھی کبھی سچے دل سے اسے مبارک باد بھی دینے لگ جاتے۔

اتفاق کی بات تھی کہ رامو کے ہاتھ کبھی کوئی کام کی چیز نہیں لگی تھی۔ کبھی کبھار وہ کسی کی گری ہوئی بالوں کی کلپ، کانچ کی چوڑی، گر جانے والی ایک جگنی، پائی کا کورا گھڑا، ہوا ڈال میں سے ٹپکا ہوا نگینہ اٹھا لاتا تو ساتھی اور گھر والے ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے۔ رامو بھی کھسیانا سا ہو کر سر کھجانے لگ جاتا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

رامو کو اب تک اتنا ضرور پتا چل چکا تھا کہ نور جہاں کا اصل نام سلطانہ تھا مگر رامو من ہی من میں اسے نور جہاں ہی پکارتا تھا۔ وہ نظر آتی تو رامو کی نگاہیں اس پر ہی ٹکی رہتیں۔ اس کی ہر بات، ہر ادا اس کے لیے زندگی کا اہم ترین واقعہ ہوتی۔ "آخر ایسی کیا بات ہے اس لڑکی میں؟" وہ اپنے آپ سے سوال کرتا مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا تو اسے اپنے ہی دماغ کا خلل سمجھ کر خود کو سمجھانے بیٹھ جاتا کہ کہاں میں، کہاں وہ؟ مگر اس کا پاگل منوا کچھ بھی سمجھ نہ پاتا۔

کبھی کبھار کاتا اور سلطانہ اس سے اپنا کچھ سامان اٹھوانے، قلی کو بلانے، اسٹیشن ماسٹر سے ٹرین چھوٹنے کا صحیح وقت پوچھ کر آنے کا کہہ دیتیں تو رامو کے بدن میں بجلیاں سی دوڑ جاتیں۔ اسے لگتا اس نے جھاڑو نہیں کوئی ستار تھام رکھا ہو، جس میں سے مدھر نغمے پھوٹ کر فضا میں جادو بکھیر رہے ہوں۔ کبھی وہ کول سے تیور اور تیور سے اتم تیور میں چلا جاتا تو کبھی اس کا خوبصورت الاپ لمبا ہو کر پھولوں بھری وادیوں کی راہداریوں میں بہتا ہی چلا جاتا۔

دیگر خاکروب دوستوں کو بھی رامو کی سلطانہ میں دلچسپی کا علم ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر اسے چھیڑتے رہتے اور ٹرین نمبر 2 کے آنے جانے کے اوقات اونچی آواز میں دوہراتے رہتے۔

"لے بھئی تیار ہو جا۔ آ رہی ہے تیری اسپیشل گاڑی۔" وہ ٹرین کے دکھائی دینے سے پہلے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے۔ رامو یوں شرما کے

نظریں جھکا لینا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ اپنے قلی دوست افضل کو ہولے سے ٹرین کی طرف دوڑاتا تاکہ وہ اس کی اسپیشل سواری کا سامان دھیان سے اتارے۔ پھر لوگوں کے بیچوں بیچ سانپ کی طرح سرسراتا رستہ بنانے لگتا تاکہ افضل کو ڈبے تک پہنچنے میں دقت نہ ہو۔

سارا سلسلہ بڑا اچھا اور ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ رامو اپنی یک طرفہ پریم کہانی میں مست اور مگن تھا کہ یکا یک ایک روز ایک ولن غیر متوقع طور پر بیچ میں کود پڑا۔ رامو کو بڑی کوفت ہوئی۔ یہ کیا؟ سلطانہ اس کے ساتھ بھلا ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ یہ تو بڑی گڑ بڑ ہو گئی تھی۔ یہاں بدلہ وفا کا کیا بے وفائی کے سوا کچھ نہیں؟ رامو کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بے بسی سے زور زور سے زمین پر جھاڑو مارنے لگا۔ اس کی نور جہاں کسی فاختہ کی طرح معصوم اور بھولی تھی مگر اب ایک جنگلی کبوتر اس کے گرد غوں غوں کر کے گھمن گھیریاں کھاتا نظر آنے لگا تھا۔

رامو کو یونہی وہم نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ عید ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ اس کے گورے گورے ہاتھوں میں رچی سرخ مہندی اور کلائیوں پر ڈولتی رنگ برنگی دھانی چوڑیاں قوس قزح کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ چھن چھن کی آواز سے سارا ماحول گنگنانے لگتا تھا۔ رامو مبہوت ہو کر ان سنگ مرمر کے بنے ہاتھوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ یکدم اسے ان کے درمیان کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ کون ان دونوں کے سکھ چین میں مخل ہونے کو آ گیا تھا۔ سلطانہ کے بالکل قریب ہی کوئی بیٹھا تھا جس سے وہ دھیمے دھیمے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ اس نے کتاب اپنے چہرے کے آگے رکھ لی تھی مگر چھپا کچھ نہ پائی۔ گاڑی ہلتی تو کتاب بھی نور جہاں کے چہرے کے آگے سے لمحے کو کھسک جاتی اور چاند نکل آتا۔ اس کے کانوں کا ایک بالا جھوم کر ناچنے لگتا اور چند آوارہ لٹیں گالوں پر مچل مچل جاتیں۔ کیا عجیب نظارہ تھا۔ دیکھتے جی نہیں بھرتا تھا۔ رامو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ کیا یہ وہی روز والی سلطانہ تھی؟ یہ تو کوئی اور ہی لڑکی دکھتی تھی؟ اس لڑکی کے لب کسی نئے اور انوکھے جذبے کی شدت سے کانپ اور آنکھیں دیوں کی طرح بار بار چمک اٹھتی تھیں۔ آج رامو ٹرین کے اندر کی صفائی کی ڈیوٹی دے رہا تھا اور یہ سب اس کے سامنے ہو رہا تھا۔

اس کی نور جہاں کے پہلو میں بیٹھا نوجوان بھی کوئی معمولی رقیب نہیں تھا۔ وہ کوئی عقیل، جمیل و معتبر، گوپی چند نہیں بلکہ ایک گورا چٹا، اونچا لمبا، خوبصورت بارعب پر وقار شخصیت کا مالک انگریز تھا جو شاید برطانوی فوج کے واپس جانے والے آخری جتھوں میں سے تھا۔ "یہ سالے انگریز اب ہمارے پورے دیس سے دفعان کیوں نہیں ہو جاتے؟" رامو نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دینا شروع کر دیں اور صفائی میں دھیان لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ دل بڑا ظالم ہوتا ہے۔ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ سلطانہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ تھوڑا بہت اس سے جان پہچان بھی تھی اور اکثر اس کے بارے میں یہی سوچتی تھی کہ یہ خاکروب عام خاکروب لڑکوں سے بہت مختلف تھا۔ اجلے کپڑوں میں ملبوس، بالوں میں کنگھی کی پٹی جمائے، تمیز سے بات کرتا یہ لڑکا کسی کالج کا ہونہار سٹوڈنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ افسوس کہ یہ بے چارہ بس ایک خاکروب تھا

ہی کر رہ گیا ہے۔ اسے تقدیر کی اس ناانصافی پر کئی بار افسوس ہوا۔

"کیا تم بھی لاہور جا رہے ہو؟" سلطانہ نے اسے پھر لہجے میں مخاطب کیا۔ رامو کو یوں لگا جیسے پوری کائنات اس سے ہمکلام ہو گئی ہو۔ رحمتوں کی بارشوں کا نزول شروع ہو گیا ہو اور دھرتی پر اگنے والے گندم کے کھیتوں میں پیچھے سنہری دانے خوشی سے ناچنے لگے ہوں۔ "نام کیا ہے تمھارا؟" سلطانہ کے ساتھی نے مسکرا کر سوال کیا تو رامو کو لگا جیسے بھگوان نے نرک کا دروازہ کھول دیا ہو اور زہر میں بھیگے بہت سے نشتر آگ کے داروں میں سے اچھل اچھل کر اس کی جانب بڑھتے چلے آ رہے ہوں۔ خوشبوؤں میں بسا ہوا انگریز کتنا بدبودار اور کریہہ المنظر لگ رہا تھا۔ رامو نے نفرت سے اپنی ناک سکیڑ لی اور چہرہ نیچے کر کے آہستہ سے جواب دیا۔ "رامو۔"

"اچھا بھئی رامو بھیا۔ ہماری سیٹ کے نیچے ذرا اچھی طرح صفائی کر دو۔ یہ جو بی بی ہیں نا...... بڑی بھکڑ ہیں۔ مونگ پھلی کھا کھا کر سارے چھلکے سیٹ کے نیچے پھینک دیتی ہیں اور اب مجھے ادھر سیٹ سے نیچے قدم رکھتے کہیں ان کے ہی پاؤں میں نہ چبھ جائے۔" انگریز نے مضحکہ خیز انگریزی لب و لہجے میں ہندی بولتے ہوئے کہا۔ تو سلطانہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور بولی "جھوٹے کہیں کے۔ بارے! چھلکے میں نے کب گرائے ہیں...... تم ہی تو ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔" دونوں آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔

رامو نے سیٹ کے نیچے جھاڑو پھیر دیا مگر یہ دیکھ کر اس کے کلیجے میں ٹیس سی اٹھی کہ چھلکوں کے بیچ بیچ کہیں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی تھے۔ "یہ چوڑیاں؟" رامو نے خود سے سوال کیا۔ "نہیں نہیں، نور جہاں ایسی تو نہیں ہو سکتی۔ وہ تو نیک، معصوم، گنگا جل کی طرح پوتر ہے۔ اچھے خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ وہ بھلا کیسے ایسے کوئی غلط کام کر سکتی ہے؟" اس نے اپنے سلگتے ہوئے دل کو تسلی دی۔

"بھلا اسے اس لال بندر میں کیا نظر آتا ہے۔ سارے دیش کو تو نقصان پہنچایا ہے انھوں نے اور اب اسے بھی کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا کر ہی چھوڑے گا...... مگر میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔" رامو نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا اور چوکنا رہنے لگا۔

"چاچا غلام نبی سنا ہے ہمارا دیش آزاد ہونے والا ہے...... مگر یہ گورے اب تک یہاں کیوں ہیں؟" ایک روز اس نے ایک بزرگ جمعدار سے سوال کیا۔

"چلے جائیں گے پتر۔ جلدی چلے جائیں گے۔ تو فکر نہ کر۔ ان سالوں کی ایسی کی تیسی۔ انگریز راج تو بس اب گیا ہی سمجھ۔"

"مگر چاچا میرا دل ڈرتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوگا، کیسے ہوگا؟ بٹوارے کی خبریں آ رہی ہیں۔ بھلا ہندوستان دو حصوں میں کیسے بٹ سکتا ہے۔ مجھے تو کچھ نہیں آتی؟" رامو پریشان لہجے میں بولا۔ پلیٹ فارم پر بیٹھی ایک ہندو عورت نے غلام نبی کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اپنا بھوجن اوٹ میں کر لیا اور ایک بارہ تیرہ سالہ بچے کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ جا کر ہندو نل سے اسے پانی لا کر دے دے۔ چاچا یہ دیکھ کر مسکرا دیا اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر اخبار پڑھنے لگا۔

"تجھے کچھ خبر ہے تیری نور جہاں آج کل کن ہواؤں میں ہے؟" ایک روز اس کے سنگی ساتھی موہن

نے اس کے کاندھے پر زور سے تھاپی مارتے ہوئے کہا۔ رامو کو لگا جیسے اس کا ایک بہت بڑا راز فاش ہو چکا ہو۔ وہ خاموش رہا، کچھ نہ بولا۔

"یہاں بدلہ وفا کا...... بے وفائی کے سوا کیا؟" موہن گنگناتا ہوا ٹی سٹال پر جا پہنچا اور گرم گرم چائے اپنے اندر یوں اتارنے لگا جیسے اپنے کلیجے میں دنیا بھر کی ٹھنڈک بھر لینا چاہتا ہو۔ جیسے آگ رامو کے نہیں، اس کے اندر لگی ہوئی ہو۔ جیسے سلطانہ اس کی بھی کچھ لگتی ہو۔

رامو نے کئی بار انگریز اور سلطانہ کو ریل میں سفر کرتے، آتے جاتے دیکھا۔ اس کا نام رابرٹ تھا۔ کبھی کبھی کانتا بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ تینوں آپس میں خوش گپیاں کرتے بہت خوش نظر آتے تھے۔ دونوں لڑکیاں رابرٹ کے ہاتھ سے چاکلیٹ چھین چھین کر کھاتیں، شرارتیں کرتی نظر آتیں تو رامو کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ ایک روز تو اسے اتنا غصہ آیا کہ ریل کے پلیٹ فارم سے کھسکتے ہی اس نے زور سے زمین پر تھوک دیا۔ گاڑی سلطانہ کو اس سے دور لیے جا رہی تھی اور وہ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ ایک لمحے کو تو اس کا یہ بھی جی چاہا کہ چلتی ریل پر ایک بم دے مارے مگر پھر اس نے خود پر قابو پا لیا کیونکہ اسے معلوم تھا ایسا کرنے سے اس کی نوکری بھی جا سکتی تھی۔ "ارے یہ دیکھو مجھے کیا ملا؟" موہن نے ریل کے جانے کے بعد پٹڑیوں پر اتر کر صفائی کرتے ہوئے چیخنا شروع کر دیا۔ سبھی لوگ بھاگ کر اس کے قریب جا پہنچے۔ موہن ہاتھ نچا نچا کر ایک پیلی سی چیز سب کو دکھا رہا تھا۔ کسی مسافر عورت کے گلے سے گری ہوئی کوئی طلائی زنجیر دکھتی تھی۔

"ارے واہ یار۔ تیری قسمت تو بہت اچھی ہے ہمیشہ کوئی نہ کوئی قیمتی چیز ہی تیرے ہاتھ آتی ہے۔" رامو حسرت بھرے انداز میں بولا۔

"بھئی گزشتہ مہینے کسی سندر ناری کا جھمکا مل گیا تھا اور آج یہ زنجیر...... واہ۔" موہن بھی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے حیرت سے اظہار خیال کرنے لگا۔

"یار اپنے ہاتھ تو کبھی کوئی کام کی چیز نہیں لگی۔" سلیم ٹی سٹال والا ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔

"ہم تو خالی ہاتھ ہی گھر جاتے ہیں۔ ماتا بھی جلتی رہتی ہے۔" رامو جیسے اپنے آپ سے بولا "جو پایا وہ بھی نہ ملا۔" رامو نے دور ہوتی چھک چھک کرتی ریل کے آخری ڈبے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بٹوارہ ہو گیا تو کیا ہم سب آپس میں بچھڑ جائیں گے؟" ایک روز پھر چاچا غلام نبی کو اخبار پڑھتے دیکھ کر مہندر نے سوال کیا۔

"وہ کیسے بھئی؟ ہم نے کہاں جانا ہے۔ ہمارا گھر ہے، ہمارا شہر ہے امرتسر؟ ہم یہاں سے کہاں جا سکتے ہیں؟" افضل نے سوال کرتے ہوئے یقین دہانی کرانے کے انداز میں مہندر کو تسلی دی۔

"کچھ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ بڑی بڑی خبریں آ رہی ہیں۔" اکڑوں بیٹھے چاچا غلام نبی کے لہجے سے فکر اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

"سنا ہے کئی شہروں میں ہندو مسلم فسادات شروع بھی ہو گئے ہیں۔ میں نے تو سنا ہے اکبر آباد کے دیوانوں نے اپنی بیٹیوں کو اب لاہور پڑھنے جانے سے روک دیا ہے۔" موہن نے رامو کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی۔

"تجھے کیسے پتا ہے؟" رامو تڑپ کر بولا۔

"میری پتنی نے بتایا ہے۔ اس کی موسی دیوان صاحب [illegible] کی حویلی میں کام کرنے جو جاتی ہے۔"

موہن کو اندازہ نہیں تھا کہ اس بات سے رامو کے دل پر بڑی قیامت گزر گئی۔

"تو کیا اب سلطانہ ٹرین میں سفر نہیں کرے گی۔ میں اسے پلیٹ فارم پر نہیں دیکھوں گا...... تو پھر میں جیوں گا کیسے...... میں تو پھر مر ہی جاؤں گا......" رامو اداس ہو کر بیٹھ گیا۔ چند ہی دنوں میں فسادات کی خبریں بھی آنے لگیں۔ ہندو مسلم کشیدگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ملک دو ٹکڑے ہونے والا تھا اور ہر کوئی پریشان تھا کہ نہ جانے کیا ہوگا۔

"رامو نے سلطانہ کو کئی ہفتوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں یوں ویران ہو گئی تھیں جیسے بینائی ان سے روٹھ گئی ہو۔ نہ جانے وہ کیسی تھی؟ کیا خبر اس کے گھر والوں نے بھی اسے اب گھر میں روک رکھا ہو۔ یہ اچھا ہی ہے۔ ایسے حالات میں لڑکیوں کو گھر سے نکلنا بھی نہیں چاہیے۔ مگر میں اب اسے کیسے دیکھوں گا۔" رامو سوچ سوچ کے پریشان رہنے لگا۔

ایک روز سارے اسٹیشن پر شور مچ گیا۔ کوئی بڑے انگریز صاحب اسٹیشن کا معائنہ کرنے آ رہے ہیں۔ ہر طرف صفائی، ستھرائی کا کام ہوتا نظر آنے لگا۔

"رامو، تم نے آج ریل کے انجن کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کے دھونا اور چمکانا ہے۔ صاحب خوش ہوں گے تو انعام بھی مل سکتا ہے۔" اسٹیشن ماسٹر ورما صاحب نے رامو کو خاص ہدایات دیں اور خود کام کی نگرانی میں مصروف ہو گئے۔

رامو نے کالے بھجنگ موٹے بھدے انجن کو یوں پیار سے نہلایا جیسے وہ کوئی پیارا سا روئی کا گڈا ہو۔ جب وہ اسے اچھی طرح چمکا کے نیچے اترا تو اس کے قدم جیسے کسی چیز نے پکڑ ہی لیے۔ اس نے دیکھا پلیٹ فارم کے بالکل انجن سے جڑے ایک بینچ پر دو لڑکیاں قریب بیٹھی آپس میں کھسر پھسر کر رہی ہیں۔ اس کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ سلطانہ اور کانتا تھیں جو شاید ایک عرصہ بعد آپس میں مل رہی تھیں۔ وہ دیوار کی اوٹ میں ہو گیا اور پورے کان لگا کر غور سے ان کی باتیں سننے لگا۔

"کانتا! ابا جان کہہ رہے ہیں ہمیں جلد ہی امرتسر چھوڑنا پڑے گا۔ اب ہمارا یہاں رہنا دشوار ہو گیا ہے مگر میں بھلا کیسے جا سکتی ہوں؟ تجھے تو پتا ہے...... میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی...... وہ یہیں پوسٹڈ ہے۔" سلطانہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کانتا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھول جا اسے اب...... حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میری پیاری تجھ سے جدا ہونے کے خیال سے میرا دل تو کٹ کے رہ جاتا ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟" کانتا نے پیار سے سلطانہ کا شانہ تھپتھپایا تو سلطانہ ہولے ہولے سسکنے لگی۔

"میں چلی گئی تو وہ مجھے ڈھونڈے گا...... مجھے اس سے ملنا ہے ورنہ میں مر جاؤں گی۔" سلطانہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"پاگل ہوئی ہے کیا، کہاں ملے گا اب وہ تجھے؟ چاروں طرف سے بری بری خبریں آ رہی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور تجھے اس کی پڑی ہوئی ہے۔ اگر اتنا ہی سچا ہوتا تو آج وعدے کے مطابق تجھے ملنے نہ آتا؟" کانتا

...ہونے کئی بار اسے روٹی کھانے کو آواز دی مگر وہ
...دیتا رہا۔
...دروازے پر دھڑ دھڑ کی آواز اتنی شدید تھی کہ کٹیا
...کے لوگ یکدم ہڑبڑا گئے۔ "پرکاش، پرکاش، رامو"
...کی لے زور زور سے رامو کے باپ اور رامو کو
آوازیں دیں۔
"ارے کیا ہوا دھنی رام؟ کیوں اتنا چلا رہے
... دروازہ توڑ دو گے کیا؟" باپو اپنی چپل کو پاؤں
میں ڈالتے ہوئے جواباً چلایا۔
"کیا آفت آ گئی ہے؟ خیر تو ہے؟" رامو بھی کھٹیا
سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"چلو اٹھو...... چاچا یہ گھر بیٹھنے کا سمے نہیں ہے......
...جانے والی ریل سٹیشن سے کچھ ہی فاصلے پر روک
...ہے۔ ہم سب وہیں جا رہے ہیں۔ مال بہت ہو۔
...سارے مسلے اپنا سونا لے کر پاکستان جا رہے
تھے۔ بس رامو...... کاکا اٹھو۔ ہمارے ساتھ چلو......"
ساتھ کے پریت سنگھ نے کرپان ہوا میں لہرائی تو
...چمک سے روشنی سی پھیلنے لگی۔
"چلو جلدی کرو...... باجو کے محلے کے لوگ تو نکل
گئے ہیں۔" سارا جتھہ جوش و ولولے سے لرز رہا
تھا۔
"چل چاچا...... تو بھی گھر کے لیے کچھ سامان لے
آ۔ تو تو ہمیشہ خالی ہاتھ ہی آتا ہے۔ کما نہ ہووے
...ماتا نے گھی شکر کی بھاجی سے بھری ہوئی چنگیر کی
...رامو کے آگے سے کھینچ لی اور اپنے پتی کو جوتی کا
جوڑا ڈھونڈ کر ہاتھ میں تھما دیا۔
"رام رام...... سلطانہ بھی تو اسی گاڑی میں
ہوگی؟" اس خیال کے آتے ہی رامو یوں اپنی

پیڑھی سے اچھلا جیسے اسے کسی زہریلے بچھو نے ڈنک
مار دیا ہو۔
"چلو چلیں بھائیو۔" وہ پوری شدت سے چلایا اور
جتھہ اس کے ساتھ "جے رام جی کی جے" پکارتا،
چھرے لہراتا، چھلانگیں مارتا اس کے ساتھ سرپٹ
دوڑنے لگا۔
"ارے ان مسلوں نے ہماری بہنوں اور بھائیوں
کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ وہ ہم نہیں بھول سکتے۔ آج
انھیں اس کا مزا چکھا کر ہی چھوڑیں گے۔ مال بھی ملے
گا اور سوہنی سوہنی زنانیاں بھی۔" جوان ہندو لڑکوں کی
خوشی سے باچھیں کھلنے لگیں۔ ان کے چہرے اور چمکدار
دکھائی دینے لگے۔ ہزار سال سے مسلم حکمرانی کا غصہ
دل میں پالنے والی ہندو جاتی کو یہ سب بڑا مناسب اور
ٹھیک ہی لگ رہا تھا۔
جنگل میں اچانک روک دی جانے والی ٹرین
حیرت زدہ سی کھڑی تھی۔ بھک کاٹ کالے انجن کی چھت
سے سفید سفید بھاپ اب بھی دھیرے دھیرے خارج
ہو رہی تھی۔ پرجوش جتھے کے نوجوانوں کے قدم بار بار
کسی نہ کسی چیز میں اٹک کے رہ جاتے تو انھیں بہت
کوفت ہوتی۔ کبھی کسی کا سر پاؤں میں آ جاتا تو کبھی کسی
کی ٹانگ۔ کسی کا صندوق انھیں الٹا ملتا تو کسی کی کھلی
ہوئی گٹھڑی اور کھلی آنکھیں انھیں گھورتی نظر آتیں۔
چاروں طرف خون آمیز کیچڑ تھا۔ سنی ہوئی لاشوں پر
بھنبھناتے مکھیوں، مچھروں کے غول تھے۔ آہیں اور
سسکیاں تھیں؟ بھوک سے بلکتے شیر خوار بچوں کی بلبلاتی
آوازیں تھیں اور موت کے لرزتے بھیانک سائے۔
سبھی لوگ سامان لوٹنے، سونا اور عورتیں ڈھونڈنے میں
مصروف ہو گئے۔ رامو بھی۔ مگر رامو کو تو بس ایک ہی

ڈانٹ کر بولی۔
"چل اٹھ...... بس اب گھر چلیں...... کہیں کوئی
گڑبڑ نہ ہو جائے۔"
"وہ آئے گا، وہ ضرور آئے گا۔ اس نے مجھ سے
وعدہ کیا تھا کہ وہ اب کی بار میرے والدین سے مل کر
بات کرے گا۔" سلطانہ بضد رہی۔
"تو بس پھر بیٹھی رہ یہیں اکیلی...... میں تو
چلی...... ارے ننگی انگریز ہے۔ بھاگ گیا ہو گا
ولایت...... وہ بھلا یہاں کیوں رہے گا ان حالات
میں؟ جان اسے بھی تو پیاری ہو گی نا......"
کانتا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتی
ہوئی اسٹیشن سے باہر لے جانے لگی۔ رامو کی تو رگوں
میں جیسے خون جم سا گیا۔ یہ بے وقوف لڑکی بھلا کیا
سوچ رہی تھی؟ اسے تو کوئی عقل، کوئی مت، کوئی خوف
ہی نہیں ہے۔ روز سننے میں آتا ہے کہ ہندو مسلم گروہوں
میں چھرے گھونپنے کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ اسٹیشن
لاوارث پڑے ہیں۔ نہ کوئی پولیس ہے نہ ٹی ٹی ٹکٹ
چیکر...... نفسا نفسی کا عالم ہے...... رامو سوچتا چلا گیا۔
مسلمان پاکستان ہجرت کرنے کی سوچ رہے تھے
مگر ڈرتے تھے کہ کسی غیر محفوظ گھڑی کی گرفت میں نہ آ
جائیں۔ چاروں طرف خوف، بے یقینی اور وحشت کے
سائے لہرا رہے تھے۔
چند ہی دنوں بعد وہ واقعہ ہو گیا جس کی رامو کو فکر
تھی۔ اس نے سلطانہ کو مع اپنے خاندان کے، سامان
کے، لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہوتے دیکھ لیا۔
اس کے گھر والے سامان حفاظت سے لدوا رہے تھے
جب کہ سلطانہ نہ جانے کس خیال میں کھڑکی سے منہ
نکالے باہر کو دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے اسے کسی کے نظر

آنے کی امید اور انتظار ہو۔ "آپ جا رہی ہیں بی بی
جی؟" رامو حوصلہ کر کے کھڑکی کے پاس چلا آیا اور پہلی
بار سلطانہ سے خود مخاطب ہوا۔
"ہاں رامو...... وہ میری سہیلی ہے نا کانتا......
مجھے ڈھونڈنے آئے یا کوئی بھی آئے تو ان سے کہنا میں
جلدی ہی واپس آؤں گی...... اچھا کہہ دو گے نا؟"
رامو نے ہولے سے سر ہلا دیا اور ڈبڈبائی ہوئی
آنکھوں سے ریل کے پہیوں کو اپنی متاعِ حیات اس
سے دور لے جاتے دیکھنے لگا۔ دل تھا کہ جیسے بس پھٹا
ہی جا رہا تھا۔
گاڑی کو گئے ہوئے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا
کہ رامو کو اچانک وہ نظر آ گیا۔ "سالا لال بندر......"
رامو کا منہ کسیلا ہو گیا۔ رابرٹ بے چینی سے پلیٹ فارم
کو دیکھ کر ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا اور بار بار اپنی
گھڑی دیکھ رہا تھا جیسے اسے کچھ دیر ہو گئی ہو۔ تاسف
اس کے چہرے سے عیاں تھا۔
یکایک رامو کو ایک عجب سی خوشی محسوس ہوئی۔ اس
کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ "اچھا ہے سالا...... اسے
ڈھونڈتا ہی رہے...... چلو اچھا ہے...... یہ ادھر تو وہ
ادھر۔ اس کے لبوں پر ایک مدھر بھری مسکراہٹ کھیلنے لگی
اور اس نے حلیم ٹی سٹال سے دو کپ اسپیشل ملائی والی
چائے پی کے زور سے ڈکار ماری۔ اپنے جھاڑو کو زور
زور سے زمین پر مار کے دیکھا کہ وہ کتنا تن سکتا ہے اور
پھر اسے پیار سے سینے سے لگا لیا۔
گھر پہنچ کر رامو کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنے
بستر میں گھس گیا اور تکیے میں منہ چھپا کر خوب رویا۔
اسے لگا جیسے اس کی زندگی اس سے ہمیشہ کے لیے روٹھ
گئی ہو اور اب اس کے پاس جینے کا کوئی جواز بچا نہ

سامان، ایک ہی عورت کی آرزو اور تلاش تھی۔ اسے کسی بھی چیز میں کوئی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

سلطانہ کو ڈھونڈنے کے لیے اس نے ریل کا ہر ڈبہ کھنگال مارا مگر وہ اسے کہیں نہ ملی۔ ہر جوان مردہ لڑکی کا چہرہ الٹا گھما کر دیکھا مگر ہاتھ صرف ناامیدی ہی آئی۔ اس کے ساتھی، رقصِ وحشت میں بدمست، مردوں، عورتوں کی بوٹیاں نوچتے بکھرے کرتے، زیورات سے جھولیاں بھرتے، اپنے چھروں کو رنگدار دیکھ کر دھمالیں ڈال رہے تھے اور رامو ایک کونے میں بیٹھا یہ سب دیکھ کر ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے اس وقت وہ خود وہاں نہیں ہے۔ کوئی اور ہے جس کا نام رامو ہے اور جو یہاں لوٹ مار کرنے آیا ہے۔

رات کافی بھیگ چکی تھی اور لوٹ بھی کافی جمع ہو گئی تھی اس لیے لوگوں نے تھک ہار کے گھر جانے کی سوچی اور اپنا مال و دولت سنبھالتے، عورتیں گھسیٹتے، قہقہے لگاتے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ رامو کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ جنگل میں اکیلا ہی رہ گیا تھا جو سانس لیتا تھا آس پاس تو کچھ بھی زندہ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا پھر اچانک یہ ہوا کہ درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے اسے سلطانہ کے ماں باپ اور بھائی کی کٹی ہوئی لاشیں نظر آ گئیں۔ رامو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس نے تمام افراد کو الٹا پلٹا کر غور سے دیکھا۔ مگر سلطانہ تو وہاں نہیں تھی۔ وہ کہاں تھی، وہ سوچ سوچ کر باؤلا ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں اس کے منہ سے ایک آواز نکلی "آواز دے کہاں ہے..... نور جہاں....." وہ اپنے بازوؤں میں منہ دے کر سسکنے لگا۔ چلتے چلتے اسے ایک ٹھوکر لگی تو وہ ایک خاردار جھاڑی پر جا گرا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جھاڑی نے اس کے پاؤں ہی پکڑ لیے ہوں۔ جھاڑی دھیرے دھیرے ہٹنے لگی اور اس کے نیچے سے ایک وجود دکھائی دینے لگا۔ یہ تو وہی وجود تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ رامو گنگ ہو کر ساکت کھڑا رہ گیا مگر اس کی نظریں اس پر ہی جم کر رہ گئیں۔

اس نے تو کبھی سلطانہ کے چہرے کو بھی نظر بھر کے غور سے اچھی طرح مکمل طور پر دیکھا نہیں تھا۔ کہاں یہ کہ وہ اس کے سامنے یوں بے لباس پڑی تھی۔ [illegible] آنکھوں والی خوف سے لرزتی ہوئی، منہ سے عجیب خرخر کی سی آوازیں نکالتی، یہ غیر انسانی وحشی مخلوق [illegible] وہی تھی؟ خون آلود ٹوٹے ہوئے پروں والے کسی فرشتے کو اس نے اس سے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سلطانہ کی کٹی ہوئی ناک اور چھاتیاں اب خوفناک سوراخ [illegible] چکی تھیں۔ اس کی ٹانگوں کے بیچ کے حصے سے [illegible] آگ کا دریا بہہ کر ٹانگوں پر نشان چھوڑتا خشک ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ شاید سلطانہ اسے تک رہی تھی، پہچان رہی تھی مگر رامو سے وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ رامو کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور آسمان میں چھید کر گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا اور جلدی سے سلطانہ کے جسم کے قریب پڑا ایک کپڑا ڈال دیا۔

نور جہاں کی آنکھیں جذبات سے عاری تھیں اور رامو ٹھس ٹھس کر کے رو رہا تھا۔

"ارے رامو پتر تو کہاں رہ گیا تھا؟..... تیرا بابا کب سے گھر آیا ہوا ہے۔ دیکھ تو سہی وہ میرے لیے کیا لایا ہے؟" رامو کو گھر میں گھستے ہی ماں کی کھنکتی آواز سنائی دی۔

رامو نے ماتا جی کی طرف دیکھا۔ یہ اس کی ماتا تھی؟ اسے پل بھر کے لیے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ [illegible] سونے کے پیلے پیلے جھمکے، کڑے اور چوڑیاں پہنے کسی نئی نویلی دلہن کی طرح اترا اترا کر اپنے پتی کی طرف دیکھے جا رہی تھی، اس کی اپنی ہی ماں تھی۔ گھر میں چاروں طرف سامان ہی سامان بکھرا ہوا تھا جسے اس کے چھوٹے بہن بھائی ہاتھ لگا لگا کر، دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ ایک جشن کا سا سماں تھا۔

"بس رامو۔ اب تو جھاڑو لگانا چھوڑ دے۔ کوئی ضرورت نہیں اسٹیشن کے پلیٹ فارم صاف کرنے کی۔ دیکھ تو سہی تیرا بابو ہمارے لیے کیا کیا لایا ہے؟ ہائے میں مر جاواں میرے تو سارے ارمان ہی پورے ہو گئے ہیں۔ کیسے ہمارے دن پھرے ہیں؟" ماتا نے جھوم کر دیوی کے آگے ماتھا ٹیکا اور پیار بھری نظروں سے اپنے پتی مہاراج کی طرف دیکھنے لگی جس نے یہ [illegible] کر دیا تھا۔

"ارے رامو!..... تو ہمارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟ کہاں رہ گیا تھا؟ میں نے بڑا ڈھونڈا تجھے کیا کوئی بڑا مال لگا تھا ہاتھ؟" باپو نے رامو کو چپ چاپ [illegible] ٹوک دیا۔

"ہاں سچ کچھ لایا بھی ہے یا ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ....." ماتا نے بھی بات ادھوری چھوڑ کر جھٹ اٹھایا اور اپنے پتی کے آگے تازہ تازہ پکی ہوئی کھیر کا پیالہ رکھ دیا۔ آج تو اس کا خواہ مخواہ ہی اپنے پتی کی خدمت کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

"خالی ہاتھ نہیں آیا ماتا جی۔ بہت قیمتی سامان لایا ہوں....." رامو یکدم جیسے نیند سے جاگ کر بولا۔

بابا مسکرا دیا۔ "لے بھئی بھاگوان آج تیرے پتر نے لگتا ہے الاہمہ اتار ہی دیا۔ دیکھیں تو سہی کیا کیا لایا ہے....." اس نے اپنی پیلی پیلی بتیسی کھولی اور کھیر میں انگلیاں ڈال کر منہ سے آوازیں نکالتا اسے چاٹنے لگا۔

"ارے اب دکھا بھی؟ کہاں چھپا رکھا ہے مال؟ دیر کیا ہے؟" ماتا بے چینی سے بولی۔

رامو نے سارے گھر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ پھر آرام سے اٹھا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ چند ہی لمحوں بعد جب وہ لوٹا تو اس کے بازوؤں میں ایک بڑا سا گٹھڑ تھا جسے اس نے کٹیا کے بیچوں بیچ رکھ دیا اور چپ چاپ اسے گھورنے لگا۔ "ارے باپ رے..... اس میں کیا ہے رامو بھیا؟" چھوٹی بہن کی مارے اشتیاق کے چیخ ہی نکل گئی۔

رامو نے احتیاط سے گٹھڑی زمین پر رکھی اور دھیرے دھیرے اس کے بل کھولنے شروع کر دیے۔

حضرت ادریس علیہ السلام

☆ جو شخص زندگی کی مناسب ضروریات سے زیادہ کا طالب ہوا، کبھی قانع اور مطمئن نہیں ہو سکتا۔

☆ سعادت مند وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے بندے کی سفارش اس کے نیک اعمال ہی کریں گے۔

☆ جو شخص علم میں کمال حاصل کرنے اور نیک کردار بننے کا خواہش مند ہو اسے جہالت کی باتوں اور بدکاری کے قریب ہرگز نہیں جانا چاہیے، یاد رہے کہ ایک کاریگر جو سلائی کا ارادہ رکھتا ہے وہ سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما۔

(انتخاب: آمنہ رمضان۔ عارف والا)

عبرت سرائے دہر

دل چھو لینے والی سچی کہانی

ڈاکٹر مبشر حسن ملک

ان دنوں میں مدینہ منورہ میں مقیم تھا۔ عصر کی نماز پڑھی، مسجد نبوی ﷺ سے باہر نکلا اور شارع ستین پر چل پڑا۔ گاڑی پارکنگ میں چھوڑ دی۔ بازار میں کاروباری رونق اپنے عروج پر تھی۔ میں دکانوں میں جھانکتا کشاں کشاں ایئر لائنز کے دفتر پہنچ گیا۔ یہی عالیشان دفتر میری منزل تھا۔

دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ مجھے احساس ہوا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ گھوم کر دیکھا تو ایک اجنبی کو مخاطب پایا۔ کون تھا وہ، میں نہیں جانتا۔ پہلی بار آمنا سامنا ہوا تھا۔ چند لمحے میں اس کی طرف دیکھا کیا۔

درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، سانولی رنگت، آنکھوں پر چشمہ مگر چہرے پر اضطراب کا عنصر نمایاں۔ مجھے محو حیرت پا کر وہ شخص میرے قریب آیا اور یوں گویا ہوا۔

”صاحب، کیا آپ پاکستانی ہیں؟“

وہ اعتماد رکھتا تھا کہ میں ”ہاں“ میں جواب دوں گا۔ میں نے سچ بول دیا۔ اس میں حرج بھی نہیں تھا مگر جلد ہی احساس ہوا کہ میں کسی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔

”گاڑی ہو گی، آپ کے پاس؟“ اس نے دوسرا سوال جڑ دیا۔

”جی ہاں۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”تو پھر آپ مجھے مدینہ شہر کی اہم زیارتیں کرا دیں۔“ اس نے بلا جھجک کہہ دیا۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ مان نہ مان، میں تیرا مہمان! مجھے اجنبی کے رویے پر اچنبھا ہونے لگا۔ مجھے حیرت میں پا کر اس نے فرمائش دہرائی۔ اس دوران میں اپنے حواس مجتمع کرتا تھا۔

”آپ کا تعارف؟“ مجھے پوچھنا پڑا۔

”عبدالقدیر۔“ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ پاکستان کے ایک

ادارے میں راڈار ٹیکنیشن تھا۔ پانچ سال قبل اجازت لے کر خطۂ عرب آ گیا اب وہ کسی عرب شیخ کی مواصلاتی کمپنی میں بطور جونیئر افسر کام کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اپنا چھوٹا موٹا کاروبار بھی کر لیتا تھا۔ ظہران میں مقیم تھا۔ حاجات روائی کے لیے منورہ آیا تھا۔ مسجد نبوی ﷺ میں عبادت کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال میں نے عبدالقدیر کی سیر و عبادت کا مناسب بندوبست کرا دیا۔

”کیا میں آپ کے ہاں ٹھہر سکتا ہوں؟“

عبدالقدیر نے مجھے اور بھی مشکل میں ڈال دیا۔ خیر میں نے اس کی رہائش کا انتظام بھی کرا دیا۔ پھر اس وعدے کے ساتھ اسے خدا حافظ کہا کہ مغرب کے بعد وہ مجھے مسجد نبوی ﷺ میں ملے گا۔

مجھے احساس ہوا کہ عبدالقدیر بے حد پریشان تھا کیونکہ وہ بار بار خیالوں میں کھو جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔

نماز کے بعد ہم دونوں بازار کی طرف نکل گئے۔ عبدالقدیر قریبی مصری ریستوران میں لے گیا۔ مصری باورچی ککڑوں کی بڑی خوش ذائقہ ڈشیں بناتے ہیں۔

دوران باتوں میں عبدالقدیر نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ وہ اپنے وطن ہی میں ہے۔ دونوں کے 5 بچے بھی تھے۔ وہ اپنی بیوی کا کوئی الزام نہ بتا سکا۔ عبدالقدیر کی ڈھلتی عمر دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے چھوٹے بچے بھی بچپن سے نکل چکے ہوں گے۔ مگر پاؤں پر کوئی بھی کھڑا نہیں ہوا ہو گا۔

میں نے معاملہ کریدنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ زیادہ بتانے پر آمادہ نہ ہوا۔ میں بھی پرائے معاملے میں دخل دینے کی حدود جانتا تھا، چپ ہو گیا۔ ہم دیگر معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ اگلے روز میں دفتر سے گھر لوٹا ہی تھا کہ عبدالقدیر وارد ہو گیا۔ وہ حد درجہ پریشان دکھائی دیا۔ کوئی لاوا اس کے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اسے یوں دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ اس کی ڈھارس بندھانے کے لیے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔ حوصلہ پا کر اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

عبدالقدیر نے جو آپ بیتی سنائی، وہ اس کی شخصی کمزوری اور کمزور عادات کی غماز تھی۔ ایک ایسی لڑکی اس کے اعصاب پر مسلط ہو چکی تھی، جو اس کے ہمرکاب نہیں چل سکتی تھی۔ رشتوں کے بے ہنگم کھیل کی وجہ پیسہ تھا جو عبدالقدیر کے ظرف سے بڑھ کر تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے جو کہانی اخذ کی، وہ کچھ یوں تھی۔

مذکورہ لڑکی عرب شیخ کے دوسرے دفتر میں کام کرتی اور بھارت سے تعلق رکھتی تھی۔ عبدالقدیر کا آنا جانا دفاتر میں اکثر رہتا۔ لڑکی دبلی پتلی تھی، نام آشا تھا۔ پریشان صورت دکھتی۔ حالات سے مفلوج لگتی۔ اپنی دنیا میں کھوئی رہتی۔ قبول صورت تھی۔ کم آمیز اور سنجیدہ رہتی۔ فقط کام سے کام رکھتی۔ کام میں ماہر تھی۔

عبدالقدیر حیلے بہانوں سے آشا کے ساتھ کام کر لیا کرتا۔ جب بے تکلف ہونے لگا تو وہ لڑکی پیچھے ہٹ گئی اور پہلو تہی برتنے لگی۔ عبدالقدیر ڈھٹائی سے اس کے پیچھے لگا رہا اور اسے مائل کرنے کی سعی کرتا رہا۔ یہ سعی لاحاصل سال بھر سے جاری تھی۔ آخرکار آشا اکتا گئی۔

ایک روز اپنے شیخ کی موجودگی میں لڑکی نے عبدالقدیر کو دفتر بلوایا اور کھلے دفتری ماحول میں گزارش کی کہ اسے تنہا چھوڑ دے کیونکہ وہ شادی شدہ ہے اور فلرٹ نہیں کرنا چاہتی۔ پھر وہ ہندو ہے اور اپنا دھرم نہیں

بدلے گی لہٰذا وہ عبدالقدیر کے لیے بے کار ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ عبدالقدیر نے اگر رویے میں تبدیلی نہ کی تو وہ مجبوراً خودکشی کرلے گی، یا پھر اپنے ابتر حالات میں واپس بھارت سدھار جائے گی۔ اس ملاقات نے شیخ کو بھی پریشان کر دیا۔ پھر اس نے عبدالقدیر کی طرف ہمدردانہ رویہ اپنایا اور رائے دی کہ محترمہ کو اپنی فیملی خطۂ عرب بلوا لینی چاہیے۔ اس کی مدد کی جائے گی، رہائش گاہ بھی دی جائے گی۔ بدلتی نئی صورت حال میں عبدالقدیر آشا سے چڑ گیا۔

اس واقعے کے چند یوم بعد ایک نٹ کھٹ دوشیزہ عبدالقدیر کے دفتر میں آن دھمکی۔ اس نے اپنی اداؤں سے موصوف کو لبھا لیا مگر آنے کا مقصد مخفی رکھا۔ کہا کہ وقتِ شام ساحلِ بحر پہ دوبارہ ملے گی۔ عبدالقدیر کھلی ہوئی باچھوں کے ساتھ سرِ شام مقررہ مقام پہ پہنچ گیا۔ دونوں قریبی ریستوران کی طرف بڑھ گئے۔ بات چیت کے موضوع نے عبدالقدیر کو حیران کر دیا۔

لڑکی نے اپنا نام اوشا بتایا اور تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ آشا کی چھوٹی بہن ہے۔ ایک بڑی ایئر لائنز میں بطور ہوسٹس کام کرتی ہے۔ اس کی باتوں میں بڑا عجز تھا۔ وہ بہن کے سلسلے میں رحم کی اپیل کرنے آئی تھی اور آس رکھتی تھی کہ وہ کامران ٹھہرے گی۔

اس نے عبدالقدیر کو مطلع کیا کہ بڑی بہن آشا شادی شدہ ہے۔ بدقسمتی سے اس کے خاوند کو کالا یرقان ہو چکا اور وہ بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔ آشا آخری حربے کے طور پر اپنے خاوند کا جگر ٹرانس پلانٹ کرانا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں اسے خطیر رقم کی ضرورت ہے۔

اب خاوند کی محبت میں وہ پردیس کے دھکے کھا رہی تھی۔ محنت بھی بساط سے بڑھ کر کرتی۔ بہت پریشان رہتی ہے۔ وطن میں گھر اسی کی کمائی پر چل رہا ہے۔ وہ اپنے والدین اور ان کے پاس اپنے خاوند کا بڑا سہارا ہے۔ اس کے ساتھ ہمدردی کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

عبدالقدیر نے باتیں بڑے غور سے سنیں، پھر بولا "میں نے آشا کو ترغیب دی تھی کہ مرتے ہوئے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرلے اور باعزت میرے گھر آباد ہو جائے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہی۔ میں تو آج بھی اس کا بہی خواہ ہوں۔" عبدالقدیر کی اس بات کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔

ریستوران کی ہلکی روشنیوں میں کھانے کا دور چلتا رہا مگر دونوں افراد کے اطوار میں بے چینی واضح نظر آتی۔ وہ باہمی طور پر سکون نہیں دکھتے تھے۔ تیز کونتوں میں مرچیں قدرے زیادہ تھیں۔ رنگین سوڈا اور فریش لیمن کا رس کارآمد رہا۔ دونوں میں تلخی کا بڑھتی رہی۔

"کیا ہندو دھرم میں دو سگی بہنیں کسی ایک شوہر سے شادی کر سکتی ہیں؟" عبدالقدیر نے سکوت توڑا۔ اوشا کا دل یکدم مرجھا گیا۔

"شاید گنجائش نکلتی ہو۔" اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"تو پھر میں آپ دونوں کے ساتھ اپنا گھر بسانے کو تیار ہوں۔" عبدالقدیر نے اس کی کا رخ اپنی جانب گھماتے ہوئے پتھر دے مارا۔ اوشا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آواز حلق میں ڈوبنے لگی۔ آنسو ضبط کرتے ہوئے اس نے اجازت مانگی اور چپ چاپ ٹیکسی میں سوار ہو گئی۔ اس کے جذبوں میں تاسف نمایاں تھا کہ اس نے عبدالقدیر کے ساتھ کھانا کیوں کھایا؟

دفتر میں آشا کی ہمت اسے تھوڑا سا فائدہ پہنچا گئی۔ عبدالقدیر نے عادات میں کسی حد تک تبدیلی کر لی۔ اب وہ پہلے کی طرح تنگ نہیں کرتا تھا مگر اپنی دلچسپی کی تجدید کسی نہ کسی بہانے کر لیا کرتا۔ آشا اس کی ذہنیت کا حال جان لیا کرتی۔ معاملہ اسی طور چلتا رہا، پھر حالات میں اچانک تبدیلی آ گئی، کچھ عجب طور پر۔

آشا تیزی سے عبدالقدیر کے قریب آ گئی۔ یہ تغیر دنوں میں عروج کی سمت بڑھ گیا بلکہ ناقابلِ یقین دکھنے لگا۔ عبدالقدیر نے تقدیر کا کرم سمجھا۔ یقین رکھتا تھا کہ اس نے منزل پالی۔ وہ سوکھے پتے کی طرح آشا کی آغوشِ حیات میں جا گرا۔

انھی دنوں شیخ کی ٹیلی کام کمپنی کو بحرین میں اہم ذمہ داریاں مل گئیں۔ تین ہفتوں کا منصوبہ تھا۔ عبدالقدیر اور آشا، دونوں بحرین جانے والے کارکنوں میں شامل تھے۔ کام تکنیکی تھا۔ دن بھر کھپانے کی فرصت بھی نہ ملتی مگر سہ ہوٹل میں شام بارونق ہوا کرتی۔ گروپ کے لوگ اپنے مشاغل بنا لیا کرتے۔ ذوق کے مطابق تفریحی پہلو تلاش کر لیتے۔

آشا اس دوران پوری طرح نکھر آئی تھی۔ سرِ شام تیار ہو جاتی۔ دلکش میک اپ کرتی اور عمدہ لباس پہنتی۔ عموماً یورپی ملبوسات زیبِ تن کرتی، جو اس کے جسمانی خدوخال واضح کر دیتے۔ دبلی پتلی ہونے کے ناتے وہ ہر انداز میں خوب جچتی۔ اب وہ عبدالقدیر کے ساتھ رنگین شامیں گزارنے لگی۔ اس کی اداؤں میں رعنائی اور ندرت عبدالقدیر کو لبھاتی۔ دونوں اکثر ساحلِ سمندر کی طرف نکل جاتے۔ وہاں رونق کا سماں ہوتا اور حسبِ خواہش تنہائی بھی۔ کبھی خریداری ہوتی تو کبھی نفیس ہوٹلوں میں کھانوں کے مزے لوٹتے نظر آتے۔

بظاہر یہی لگتا تھا کہ آشا عبدالقدیر کے قریب تر آ چکی اور شاید اپنے بیمار شوہر کو چھوڑ دے گی۔ ان کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ عبدالقدیر کی باچھیں ہر دم کھلی رہتیں جب کہ آشا کبھی کبھار بجھ جایا کرتی۔

تین ہفتے گویا تین دنوں میں گزر گئے۔ تکمیلِ کار کی خوشی اپنی جگہ، مگر اکثر کارکن بحرین چھوڑنے پر افسردہ تھے۔ اسی لیے شیخ نے ایک بڑی پکنک کی اجازت دے دی۔ تمام ساتھیوں نے بحرین تا ظہران سفر اس پل پہ طے کرنے کا فیصلہ کیا، جو بحیرہ احمر کے عربی حصے پہ تعمیر کیا گیا تھا۔ تقریباً 20 کلومیٹر لمبا یہ پل عزمِ انسانی اور جدید ٹیکنالوجی کا حسین امتزاج ہے، جس نے زمین کے دو ٹکڑوں کو آمد و رفت کے لیے ملا دیا۔ اس پہ ہر دم گاڑیاں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ گہری شام کے وقت روشنیوں کا سفر سمندر کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ شیخ نے مناسب جگہ پر ضیافت کا پُرتکلف انتظام بھی کر دیا۔

اسی شام چاند اپنے جوبن پر تھا۔ عبدالقدیر اور آشا گاڑی میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ دل مسرور تھے اور ماحول خوبصورت تھا۔ کائنات کا تمام تر حسن سمندر میں سمٹ آیا تھا۔ ستارے آسمان سے اتر کر پانی میں بکھر گئے تھے۔ چاندنی کے طلسم میں آبِ رواں پگھل رہا تھا۔ کئی بحری کشتیاں سمندر کی موجوں میں کھیل رہی تھیں۔ چھوٹے بڑے جہاز قرب و جوار میں بندرگاہوں کی سمت بڑھ رہے تھے۔

"عبدالقدیر، براہِ کرم مجھے کچھ مدت کے لیے 50 ہزار ریال دے دیں، کیوں، وجہ نہیں بتا سکوں گی۔" آشا نے اس وقت کہا جب عبدالقدیر سمندر پہ

پڑنے والے عکس قمر میں کھو کر اس کی شباہت آشا کے سراپے میں ڈھونڈ رہا تھا۔ دم بھر میں عبدالقدیر کے اجلے محبوبانہ تصور کو گرہن سا لگ گیا۔ بحری مدوجزر سمٹ کر اس کے وجود میں بکھر گیا۔ ذہن کئی اندیشوں میں غلطاں ہونے لگا۔ کڑے امتحان کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

تلاطم کی اسی شدت میں اسے کوئی فیصلہ کرنا تھا اور انہی لمحوں میں وہ پختہ عزم کر چکا تھا۔ فیصلے وہ اسی طور ہی کیا کرتا تھا۔ اس نے آشا کی آشا کو لبیک کہہ دیا۔ مسکراہٹ آشا کے چہرے پر رقص کرنے لگی۔

جمع پونجی موجود تھی، ایڈوانس بھی مل گیا، کچھ دوستوں سے لیا، اور یوں آشا کے لیے رقم اکٹھی ہو گئی۔ چند ساعتوں میں مایا ادھر سے ادھر ہو گئی مگر ذہن کے کورے میدانوں میں وسوسوں کے جنگل بھی ابھر آئے۔

واپس دفتر پہنچ کر کار دوراں کا انبار عبدالقدیر کی ہستی پر آن گرا۔ اسے بحرین کے پراجیکٹ پر فوری رپورٹ تیار کرنا تھی۔ یہ کٹھن اور وقت طلب کام تھا۔ بعدازاں اسے ریاض جانا پڑا۔ فرم کے لیے بعض اشیا کی خریداری کرنی تھی۔ وقت اندازوں سے بڑھ کر صرف ہوا۔ تین ہفتے اسی طرح بیت گئے۔

معاملات سلجھانے کے بعد وہ آشا کے دفتر گیا مگر اسے وہاں نہ پایا۔ اس کی جگہ کوئی یمنی کام کر رہا تھا۔ عبدالقدیر پریشان ہو گیا کیونکہ عملے کے دیگر افراد نے اسے ملی جلی اطلاعات دیں۔ بہت سارے خدشات عبدالقدیر کے ذہن میں پیدا ہو گئے۔ شاید وہ کنگال ہو چکا تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے فوری طور پر شیخ کے گھر کی راہ لی۔

شیخ نے آشا کے معاملے میں غیر معمولی پریشانی دیکھ کر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ عبدالقدیر اسے ادھار والے معاملے سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا، سوالوں سے پہلوتہی کرتا رہا۔ شیخ سے البتہ اس نے چند باتیں اگلوا لیں۔

آشا بھارت واپس جا چکی تھی۔ چھٹی پر گئی تھی، اصولاً اسے ہفتہ پہلے واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہی وعدہ کر کے وہ گئی تھی۔ اس کا لوٹنا اب مشکل لگتا تھا۔ شیخ کے نزدیک آشا کے یوں غائب ہونے کی وجہ اس کے خاوند کی شدید بیماری ہو سکتی تھی۔

شیخ کی باتیں سن کر عبدالقدیر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر شیخ نے اسے گھر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن عبدالقدیر سوچوں کے تانے بانے میں الجھ چکا تھا۔ حالات میں اسے فریب کی بو آ رہی تھی، جس باعث اس کی انا بھی بری طرح مجروح ہوئی۔ وہ کسی کو اپنے دکھ میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔

پھر کسی نے اسے بتایا کہ آشا اپنے دیس نہیں گئی، بلکہ یہیں کہیں پوشیدہ ہو گئی ہے، اسے ستا رہی ہے۔ عبدالقدیر اہل ہند کی روایتی جادوگری پر یقین رکھتا تھا، یہی سمجھتا رہا کہ آشا نے کسی جانور کا روپ دھار لیا ہے اور قریب ہی کہیں موجود رہتی ہے۔

عبدالقدیر نے چھوٹی بہن روشنا سے بھی رابطے کی کوشش کی مگر اب وہ یورپ اور لاطینی امریکا کی پروازوں پر مصروف تھی۔ عبدالقدیر نے دونوں بہنوں سے رابطوں کے لیے کئی حربے استعمال کیے، مگر ناکام رہا۔ شیخ کے دفتر سے بھی اسے آشا کا مسکن پتا نہ چل سکا۔ اس امر کا اندازہ بہرحال ہو گیا کہ آشا کو بھارت میں تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

کسی دور افتادہ گاؤں میں رہتی تھی۔ خاوند کی صحت یابی کے بعد نیپال منتقل ہونا چاہتی تھی، جہاں اس کے سسرالی رشتے دار کثیر تعداد میں مقیم تھے۔

عبدالقدیر اسی پس منظر میں مدینہ منورہ آیا تھا۔ وہ اپنے معبود کے سامنے گڑگڑا کر مدد لینا چاہتا تھا۔ اسے پیسوں کے ضیاع پر قلق تھا مگر وہ اپنے بیوی بچوں کے بارے میں اپنے رویے پر قطعی شرمندہ نہیں تھا۔

کسی وقت وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا۔ کہتا، کہ میں آشا کو قتل کر دینا چاہتا ہوں۔ بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ بھارت میں سزائے موت پانا چاہتا تھا۔ کبھی رونے لگتا تو اس کی بے بسی انتہا پر نظر آنے لگتی۔

پھر اچانک وہ مدینہ منورہ سے چلا گیا۔ اس کے ساتھ رابطہ بھی معدوم ہو گیا۔ اسی طور کئی ماہ گزر گئے۔ کبھی سوچوں میں آتا مگر پھر گردش دوراں کے اوراق سے محو ہوتا گیا۔

کبھی کہانیوں کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے ایک روز وہ لوٹ آیا، بالکل اچانک۔ خود ہی میرے گھر چلا آیا۔ اس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ ایک جھلک نے عہد رفتہ کی کتابیں کھول دیں۔ یادوں سے چند نقوش ابھرنے لگے۔ جونہی میں نے اسے پہچانا، تجسس کے کئی پہلو نمو پا گئے۔

عبدالقدیر بڑا لاغر ہو چکا تھا۔ وقت نے سرعت سے کہانی اس کے چہرے پر لکھ دی تھی۔ جھریوں میں حوادث مزین ہو چکے تھے۔ ریش بڑھ کر بزرگی میں اضافہ کرتی تھی۔ اطوار میں ٹھہراؤ کہیں زیادہ تھا۔

معلوم ہوا کہ وہ شدید تنہائی کا شکار رہا ہے۔ بیوی، بچوں سے محروم ہو چکا۔ فکروں نے اسے مایوسی میں دھکیل دیا تھا۔ بولنے پر آیا تو اس کا جذباتی مدوجزر لمحہ لمحہ تغیر میں رہا۔ اس نے آشا کا کھوج لگا لیا تھا۔ اس سعی میں اس نے بڑے پاپڑ بیلے۔ کئی ناتے استوار کیے، بہت سے وسیلے بنائے۔ وہ آشا سے ملا مگر اسے قتل نہ کر سکا کیونکہ حالات اس کی توقع کے برعکس نکلے۔

عبدالقدیر آشا کی برادری سے ناروا سلوک کی توقع رکھتا تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ گاؤں میں کئی افراد سے ملا۔ گاؤں والوں نے اس کے ساتھ بڑا تعاون کیا۔ تحقیق کرنے پر اسے جس کہانی کا پتا چلا، وہ طویل اور دکھ بھری تھی۔ تمام معاملات کی شکل کچھ یوں ابھری:

آشا بھارت لوٹی تو اس کے خاوند روی کی صحت انتہائی خراب ہو چکی تھی بلکہ وہ قریب المرگ تھا۔ آشا نے اسے سنبھالا۔

آشا کو اپنے پتی سے بے حد پیار تھا۔ دونوں لڑکپن کے پریمی تھے۔ باہمی رشتہ داری نسلوں پر محیط تھی۔ شادی نے ان کے جیون میں رنگ بھر دیے۔ روی پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا، جب کہ آشا نے بی کام کیا تھا۔ ملاپ انھیں تمنا کی تکمیل دکھتا تھا۔ محبت اور محنت کے اوصاف لیے دونوں نے زندگی میں جدوجہد کی تو خوب پھولے پھلے۔ انھیں اپنا گھر خوشیوں سے سجا نظر آتا، جس میں آرزوؤں کے گلاب کھلتے اور ارضی نباتات میں مدغم ہو کر خوابوں کی تعبیر دھار لیتے۔ ان کی دنیا جنت نظیر تھی، مگر کبھی دنیائیں زلزلوں کے باعث غارت بھی ہو جاتی ہیں۔ یہی آشا کے ساتھ ہوا۔

اچانک انکشاف ہوا کہ روی کالے یرقان (ہیپاٹائٹس سی) کا مریض ہے۔ وہ تشخیص کے مراحل سے کبھی نہیں گزرا تھا اور اب بیماری تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ جگر ناکارہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ موت کا

قرب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ شادی کی چھٹی سالگرہ پر معاملات حد درجہ خراب ہو گئے۔

روی کو آپریشن کے لیے بڑے ہسپتال لے جایا گیا۔ بھائی نے اپنے جگر کا حصہ عطیہ کیا اور اس کا معاوضہ بھی لے لیا۔ آشا اور اس کے دیور کی قربانی سے روی کی جان بچ گئی۔

سرجری کے اخراجات دینے کے علاوہ آشا نے شوہر کی خدمت بھی کی جو بساط سے بڑھ کر تھی۔ کڑے حالات میں اس نے ہمت جواں رکھی، حتیٰ کہ روی زندگی میں لوٹ آیا۔

وقت کے ساتھ روی میں قوت لوٹنے لگی۔ میاں بیوی یکجا ہوئے تو کارِ حیات میں نئی راہیں تلاش کرنے لگے۔ روی کے رشتہ دار نیپال میں کاروبار کرتے تھے۔ انھوں نے آشا اور روی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ماہ و سال گزرنے لگے۔

ایک عرصہ تک آشا کی زورقِ حیات پُرسکون لہروں پر چلتی رہی، پھر اسے طوفانی تھپیڑوں نے آن لیا۔ آشا کی عمر بڑھ رہی تھی مگر اس کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس پر انگلیاں اٹھنی شروع ہو گئیں۔

محرومی کی افتاد پڑنے پر آشا بے بسی محسوس کرنے لگی۔ مندر مندر گھوما کرتی۔ سنیاسیوں کے پاس بھی گئی مگر اس کی گود ہری نہ ہو سکی۔ گو شفا خانے اسے صحت مند قرار دیتے، پھر بھی تکمیلِ تمنا کا سراب برسوں پر پھیل گیا۔ پتی کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا گیا۔ باہمی جھگڑے طوالت پکڑنے لگے۔ تلخیاں بلا تمیزی تک بڑھنے لگیں۔ اس کشمکش میں دونوں واپس بھارت آ بسے، مگر باہم فاصلے نہ سمٹ سکے جلد ہی دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔

گزر اوقات کے لیے آشا نے بینک میں ملازمت کر لی۔ تنہائی میں وقت کا پہاڑ دھکیلنے لگی۔ اس نے دنوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ بس مصروفِ کار رہتی، صبح تا شام آس رکھتی کہ زندگی یونہی گزر جائے گی، مگر نصیب میں لکھا کون ٹال سکتا ہے؟

جس بینک میں آشا کام کرتی تھی، فراڈ کا شکار ہو گیا۔ آشا والی برانچ میں بڑے پیمانے پر غبن ہوا۔ اس کا نام بھی مشکوک ملازمین میں آ گیا۔ الزام تھا کہ اس نے مجرموں کی اعانت کی ہے۔ آشا الزام سے انکار کرتی رہی مگر صورتِ حال سے نجات نہ پا سکی۔ معطلی کے بعد اس کے خلاف کارروائی شروع ہو گئی۔ جلد ہی کیس عدالت میں چلا گیا۔ آشا اپنا مقدمہ کچھ بوجھ سے نہ لڑ سکی۔ مؤثر وکالت کی عدم موجودگی میں اسے بھی سزا دے دی گئی۔ وہ 3 سال کے لیے جیل چلی گئی۔

جیل میں وہ واحد خاتون تھی، جس کا کوئی ملاقاتی نہ آتا۔ اس کی صحت بری طرح گرنے لگی۔ وہ کھانا پینا اور معمولات بھول گئی۔ اس کی شخصیت مسخ ہونے لگی، پھر اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے، جو شدید تر ہوتے چلے گئے۔ کچھ عرصہ جیل میں علاج ہوتا رہا، آخر اسے پاگل خانے بھیج دیا گیا۔

عبدالقدیر آشا کے گاؤں پہنچا تو کئی افراد سے ملا۔ انھی کی وساطت سے وہ پاگل خانے آشا سے ملنے گیا۔ آشا اسے نہ پہچان سکی۔ اس کا ایک ہی روپ تھا، جو بار بار نظر آتا۔ وہ ہر کسی سے معافی مانگتی۔ ہر کسی کے مقابل ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی گڑگڑانے لگتی اور قدموں میں ڈھیر ہو جاتی۔ سسکنے لگتی۔ دیکھنے والوں کو اس پر ترس آتا۔ وہ کئی بیماریوں کی مریضہ بن گئی تھی۔

عبدالقدیر نے کہانی ختم کی تو بُری طرح رونے لگا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ دیر تک اداس بیٹھا رہا، پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا:

”محترم آپ نہیں جانتے، پیچھے وطن میں آج میری بڑی دختر کی شادی ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ مبارک دیتا، وہ بول اٹھا:

”میں نے بالواسطہ طور پر بیٹی کو پیغام بھیجا تھا کہ میں تمھاری ماں کا مجرم ہوں مگر اتنی اجازت دے دو کہ گھر جاتے ہوئے میں اپنا دستِ شفقت تمھارے سر پر رکھ سکوں اور اپنی تمناؤں کا ملبوس پہناتے ہوئے تمھیں رخصت کروں۔“

عبدالقدیر کی آواز حلق میں رندھنے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اُبل پڑے۔ بولا: ”بیٹی نے جواب دیا ہے کہ امی کے تو مجرم ہیں ہی، آپ میرے بھی قصور وار ہیں۔ اگر آپ کا دستِ شفقت میرے سر پر رہتا تو مجھے تعلیم نامکمل چھوڑ کر سکول میں ملازمت نہ کرنا پڑتی۔ در بدر دھکے نہ کھانے پڑتے۔ اپنا جہیز خود نہ بنانا پڑتا۔ اگر رشتوں سے اعتماد کی روح نکل جائے تو وہ بے جان ہو جاتے ہیں اور عملاً بے معنی کہلاتے ہیں۔ مجھے اس دستِ شفقت کا کیا فائدہ، جسے میری اکائی کا بھی احساس نہ رہا؟؟“

یہ کہہ کر عبدالقدیر سسکیاں بھرنے لگا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ پھر وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور اونچی آواز میں روتے ہوئے بولا۔

”میری ماں بھی رُوٹھ کر کہتی ہے کہ میں اس کے حقوق و فرائض سے کوتاہی برت رہا ہوں۔ اس کی بیوی اپنی چادر تلے نہیں ڈھانپ سکا۔ آج وہ اپنی بہو کی جزوی دست نگر بن چکی اور بہو کو مجھ سے افضل گردانتی ہے۔ مجھ سے بڑھ کر رسوا شخص اور کون ہو گا، اپنا دشمن کہلانے کو؟“ الفاظ عبدالقدیر کے لبوں پر ٹوٹنے لگے۔ میری اپنی آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے۔

”جب قدرت ہمیں کسی خاندان کی سربراہی عطا کرے تو ہمارے دانشمندانہ یا غیر دانشمندانہ فیصلے 4 نسلوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں...... موجودہ نسل، ایک پچھلی اور دو اگلی نسلوں پر۔“ میری غیر فطری سوچ نے تین نسلوں کو خوار کر دیا۔

■■■

نامعلوم افراد

پہلے شہر میں آگ لگائیں نامعلوم افراد
اور پھر امن کے نغمے گائیں نامعلوم افراد
لگتا ہے کہ شہر کا کوئی والی ہے نہ وارث
ہر پل اپنی دھوم مچائیں نامعلوم افراد
ہم سب ایسے شہر نا پرساں کے باسی ہیں
جس کا ظلم و تشدد چلائیں نامعلوم افراد
لگتا ہے انسان نہیں ہیں کوئی چھلاوا ہیں
سامنے ہوں اور نظر نہ آئیں نامعلوم افراد
ان کا کوئی نام نہ مسلک، نہ ہی کوئی نسل
کام سے بس پہچانے جائیں نامعلوم افراد
نامعلوم افراد کے پیچھے ہیں معلوم افراد
کن معلوم افراد کے گائیں نامعلوم افراد

(عقیل عباس جعفری)

ایسی کہانیاں کم کم لکھی جاتی ہیں اُردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے بطور خاص۔

توشۂ خاص

انتظار

آغا کو دس سال بعد آنے والے چھوٹے آغا کا انتظار تھا

نجم ثاقب

کہتے ہیں جب آغا حکمت اللہ نے قصہ خوانی بازار کے عین دل میں کھڑے تنگ بالکنیوں اور لکڑی کے اونچے چھجوں والی لکڑی بلڈنگ کے صدر دروازے پہ قدم رکھے تو 'یاور خاناں' انھیں دروازے کے پیچھے چار قدم کے فاصلے پہ وہاں کھڑا ملا جہاں مغل شہنشاہوں کی پرانی یادگاری باؤلی پہ ٹوٹی اینٹیں اور ان گھڑے پتھر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر پھیلے آنسوؤں نے گرد، مٹی اور میل کے داغوں کو مزید گدلا رکھا تھا اور وجود پہ بھولپن کے چھینٹوں کی جگہ وحشت اور درماندگی ناچ رہی تھی۔

آغا نے اس کی انگلی تھامی اور اونچے چوبارے کے اس گوشے پہ چڑھ آئے جہاں گول چکر کھاتا تنگ زینہ سب سے اوپری منزل کی جانب مڑ جاتا تھا۔ وہاں فولادی زنجیروں اور لکڑی کے دوہرے تختوں سے بنا ہاتھی دانت کے سے سفید لٹوؤں اور جابجا گڑی میخوں والا وہ تاریخی دروازہ تھا جسے دیکھ کر آغا کی خانم نے بغل میں دابے بچے کو گٹھڑی بھر بوجھ کی طرح زمین پہ اتار دیا اور دو چند ہوئی حیرت سے بولی: ''ایں چیست آغا؟''

اور آغا نے کمال بے نیازی سے سر اونچا کر کے کہا تھا: ''ایں خانہ شماست۔''

''چہ قدر خوب!'' خانم کے لہجے میں چھپے طنز کو شیر قند کی طرح حلق سے اتارتے آغا نے 'یاور خاناں' کی کمر پہ ایک مشفق وہپ رسید کی۔ بولے: ''ایں سوم است (یہ تیسرا بیٹا ہے)۔''

خانم نے ناک بھوں چڑھا کر کہا: ''چہ طور؟ (کیسے؟)۔''

آغا بولے: ''چشم تماشا بیار (دیکھنے والی نگاہ لاؤ)''

خانم نے ایک نگاہِ غلط اس پہ ڈالی اور غڑاپ سے تین در بچوں سمیت دروازے سے اندر گم ہو گئی جہاں سیلے در و دیوار والے بے صحن کے کمروں والے گھر میں دن کو بھی ملگجا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ جہاں آنے والے دو چار سالوں میں خانم آہیں بھر بھر کر گنگنایا کرتی تھی:

''روئے گل سیر ندید و بہار آخر شد
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد''

(ہم نے ابھی پھول کا چہرہ جی بھر کے نہ دیکھا تھا کہ بہار ختم ہو گئی، افسوس! کہ پلک جھپکنے میں محبوب کی رفاقت ختم ہو گئی)

انھیں آنے والے دنوں میں 'یاور خاناں' کو پتا چلا کہ آغا کا اصل وطن ہرات ہے جہاں کی خاص چمڑے اور گدلی روئی سے بنی پوستینیں سارے وسط ایشیا میں جانی جاتی ہیں۔ جہاں آغا چمڑے کے اتنے ہی بڑے تاجر تھے کہ سال میں دو چکر روس اور ایک آدھ پاکستان یا بھارت کا لگا لیتے۔ مگر ان کا گھر زندگی کے لیے ضروری سبھی آسائشوں سے بھرا ہوا تھا اور اتنا کھلا اور کشادہ تھا کہ خانم کو وہاں، یہاں جیسی تنگ دامنی کا احساس کم از کم نہ ہوتا تھا۔

جب کبھی وہ موج میں ہوتیں تو اس سمیت سب بچوں کو سامنے بٹھا کر ایسی تصویر کشی کرتیں کہ یاور خاناں کو لگتا کہ وہ اپنے زندہ وجود سمیت وہاں گھوم آیا ہے۔

جہاں سیاہی مائل پتھروں اور خاکستری اینٹوں سے بنی دیواریں انگور کی بیلوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ کھلے صحنوں میں آلوچے، سرخ انار، سرخ اور سبز کا امتزاج لیے سیب مہک رہے ہیں۔ سردیوں میں دھندلے راستوں پہ بچھی سفید برف قدموں کے نشان ڈھونڈتی ہے۔ کہیں پاس کہیں آبشاروں کے میٹھے پانیوں کی شرر شرر سکوت کی چادر کو دھیرے سے مسک دیتی ہے۔

جہاں وہاں بھیڑوں کی نرم روئی سے گندھا فرغل پہنے خانم قصہ کہتے کہتے منظر کا حصہ بن جاتی۔

پھر آغا آتے، اپنی بوسیدہ ٹی بی زدہ کھانسی کھانستے۔ لکڑی کا بھاری دروازہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ کھلتا اور سلگتے کمرے کا سحر ٹوٹ جاتا۔ بچے مرغی کے چوزوں کی طرح ادھر ادھر کونوں میں پھیل جاتے۔ شکست خوردہ سی خانم تیجے کی طرف چل دیتی جہاں آغا نے کپڑا تان کر عارضی باورچی خانے کی شکل بنائی تھی۔ خانم نے 'یاور خاناں' کی مدد سے دیوار میں دو لمبے کیل ٹھونک کر ایک فرائنگ پین اور ایک توا لٹکا کر نیچے مٹی کے تیل کا چولھا رکھ دیا تھا۔

پھر ایک روز آغا وقت سے پہلے گھر آ گئے۔ وہ پہلے کی نسبت پُر جوش اور خوش دکھائی دیتے تھے۔ ویسے تو ان کے گھر آنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ وہ روزانہ کہاں اور کس غرض سے جاتے ہیں۔ البتہ یہ سب جانتے تھے کہ وہ دن کا بڑا حصہ گھر سے باہر رہتے ہیں۔ جب واپس آتے تو ان کے کپڑے گرد آلود ہوتے۔ ہاتھوں پہ خراشیں اور قدموں سے تھکن لپٹ رہی ہوتی۔ وہ دونوں ٹانگیں لٹکا کر چارپائی پہ بیٹھ جاتے اور خانم گرم پانی سے ان کے ہاتھ پاؤں دھلواتے، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا کرتی۔

پھر جب گھر سے باہر کھلے آسمان پہ تارے چمکنے لگتے۔ عروسِ شب اپنے نقرئی گہنے پاتوں سمیت رونق افروز ہوتی۔ نیچے بازار میں رنگین کپڑوں کی مانند بکھری آواز نیند کی رگوں میں اتر جاتیں اور خانم کے خراٹے بچوں کے معصوم اور البیلے خوابوں سے ہم آہنگ ہونے لگتے۔ آغا اپنی درد بھری آواز میں وہ نغمہ چھیڑتے جسے سننے کی خواہش میں 'یاور خاناں' اپنی چارپائی پہ دیر تک چپکا پڑا رہتا تھا۔

وہ کمرے کے ملال کھلائے سیلے سیلے ماحول میں ''یا قربان'' کی تان اٹھاتے۔ یاور خاناں کا انگ انگ

کوان بن جاتا۔

ستاو ستر گو بلا واخلے ما (اے میری جان! میں تمھاری آنکھوں پر

دجانانہ زما (قربان ہو جاؤں)

اسے اپنی پختون دادی یاد آجاتی جو ہمیشہ چار گز گھیراؤ کی لمبی فراک پہنتی تھی اور ہفتے میں ایک روز بالوں میں خوب تیل ڈال کر انھیں مینڈھی مینڈھی گوندھتی تھی۔ جو کنواری لڑکیوں کے ماتھے کھدوا کر نشانوں کو سرمے سے بھرتی۔ جو پختونوں کو سب سے اچھا مسلمان اور یوسف زئیوں کو سب سے اچھا پختون سمجھتی تھی اور جس نے دشمنی کی بھینٹ چڑھ جانے والے بیٹوں اور پوتوں کی لاشوں پہ کھڑے ہو کر کمال ضبط سے 'یا قربان' کا نعرہ دیا تھا اور 'یاور خاناں' کو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے علاقہ بدر کرا دیا کہ یہاں رہے تو باپ بھائیوں کی طرح اپنے ہی چچیرے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گے۔ دور چلے جاؤ، ایسی جگہ جہاں تمھارے سانسوں کی ڈوری سلامت رہے اور اونچے کوہاٹی طرّوں والے خانوں کے دلوں میں یہ امید باقی رہے کہ ان کے مرقدوں پہ کبھی نہ کبھی کوئی دیا جلانے آئے گا۔

ہاں تو اس روز آغا وقت سے پہلے گھر آ گئے۔ وہ پہلے کی نسبت خوش اور پرجوش دکھائی دیتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی سب بچوں کو آوازیں دے دے کر بلایا۔ وہ اکٹھے ہوئے تو انھیں پشاور کی سیر کرانے نکل کھڑے ہوئے۔ خانم نے اس اقدام پہ پہلے تو انھیں حیرت سے گھور کر دیکھا۔ پھر حسب عادت بڑبڑ کرتی اندر کمرے کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

آغا آگے آگے چل رہے تھے اور بچے ان کے پیچھے۔ یاور خاناں کی نگرانی میں دائیں بائیں یوں تکتے چلے آ رہے تھے جیسے اردگرد کے سارے مناظر، دکانوں کے تھڑوں پر سجی اشیا، شیشے کے دروازوں کے اندر دھرے رنگ رنگیلے کھلونوں سمیت ہر شے نگاہوں میں سمو لینا چاہتے ہوں۔

خود یاور خاناں کو بھی اس روز بازار کی رنگینی معمول سے سوا معلوم ہوئی۔ قہوہ خانے کے باہر دیگ جتنی بڑی کیتلی اینٹوں سے بنے چولھے پر دھری تھی اور اس کے نیچے دھڑا دھڑ جلتی لکڑیاں اب انگاروں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

انہی انگاروں کی تپش کو محسوس کرتے نسوار فروش جابجا زمین پہ کپڑا بچھائے مال لگا کے بیٹھے تھے۔ وقتے وقتے سے دکانوں سے باہر بنے تھڑوں پر بیٹھے تماش بین بوڑھے جو حقے کی نے چھوڑتے تو پہلو میں دھرے تھال سے گڑ کی ڈلیا اٹھا کر منہ تر کرتے۔ کبھی کبھار مزہ دوبالا کرنے کے لیے چٹکی بھر نسوار کلے میں دبا کر بازار کی ان پرانی رونقوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے جنھیں صرف ان کے باپ دادا نے دیکھا تھا۔ جس کے قصے انھوں نے منہ زبانی بڑے شوق سے دہرائے تھے۔ جب خیبر کے درّے سے گزر کر قافلے اس پار اترتے تھے اور کمر سے پٹکی باندھے سارے وسط ایشیا سے آنے والے رنگ رنگیلے تاجر تھے، خوانی بازار کی سرایوں اور قہوہ خانوں میں ان علاقوں کی کہانیاں سناتے تھے۔ جہاں جنگجو برسات کی کھمبیوں کی طرح اگتے ہیں۔ راستے سارا سال برف اوڑھ کے اونگھتے رہتے ہیں۔ جہاں سرد راتوں میں چاندنی چٹکتی تو زمین روئی کا سفید بچھا بستر معلوم ہوتی۔ تارے جھک جھک کر پربتوں سے سرگوشیاں کرنے کے بعد وادیوں کی

[illegible] مناظر کا بوجھ پلکوں پہ دھرے سننے والے [illegible] تھے اور بازار سیاحوں، راہ گیروں اور تاجروں [illegible] کی دھمک سے ہونکنے لگتا۔

[illegible] میں نو عمر لڑکے جابجا خوانچے گلے میں [illegible] امریکی سگریٹ، ایرانی صابن اور روسی ماچس بیچ رہے ہوتے۔ الائچی اور گرم مسالا بیچنے والوں کی پوری [illegible] دیکھ کر بچوں نے ابھی حیرت سے انگلیاں [illegible] میں دبائی ہی تھیں کہ بازار ختم ہو گیا۔ آغا ذرا کلی [illegible] بڑی سی سڑک پر ہو لیے۔ پھر تھوڑی دیر چل [illegible] طرف مڑ گئے۔ پھر بائیں، پھر دائیں اور آخر [illegible] کی سیدھ میں چلنا شروع ہوئے تو بچوں کے کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

[illegible] انگشت شہادت کی طرح سیدھا اکڑ کر کھڑا ہو گیا [illegible] بولا:

"آغا! کجا می روی؟ (کہاں جا رہے ہیں؟)"

آغا پہلی مرتبہ کھل کے ہنسے۔ ان کے ہموار [illegible] کی سفیدی ایک لمحے کے لیے کوندی۔ وہ بولے:

"[illegible] ما دور نیست۔"

پھر کچھ دیر چلتے چلتے وہاں رک گئے جہاں لوہے [illegible] ریلوے اسٹیشن کی حدود شروع ہونے [illegible] تھے اور جس کے اندر لوہے کی وہ فولادی [illegible] تھی۔ جس پر ریل کا کالا بھجنگ انجن دن میں [illegible] اور پیلے ڈبوں کی قطار پیچھے لگائے چھکا چھک [illegible] کرتا تھا۔

[illegible] نے زندگی میں پہلی مرتبہ دور تک جاتی پٹڑی [illegible] کی صورت زمین پر لیٹے دیکھا اور جب وہ [illegible] دھمک کرتی زمین کے سینے پر سیاہ رو انجن [illegible] تو سب سے چھوٹا بچہ آغا کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن اور انجن کی دھمک میں کچھ فرق باقی نہ رہ گیا۔ جب کھلے دروازوں اور سلاخوں والی کھڑکیوں میں رنگ برنگے لوگوں کو بٹھائے شیطان کی آنت جیسی لمبی بلا دھڑ دھڑ کرتی ان کے قریب سے گزر کر گز بھر کے فاصلے پہ رک گئی تو انھوں نے کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگوں کا ایک طوفان بدتمیزی ہے جو ریل کے دروازوں کے اندر باہر آن بپا ہوا ہے۔ باہر آنے والے اندر جانے والوں کو دھکیل رہے ہیں۔ اندر جانے والے باہر آنے والوں کو دوبارہ گاڑی پر سوار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تب آغا نے بچوں کے سیب کی طرح تمتماتے گالوں کو نظر بھر کے دیکھتے ہوئے بتایا کہ اس لمبی بلا کا نام "ریل گاڑی" ہے۔ یہ خاص چیز ان سب کے لیے اس لیے نئی اور انوکھی ہے کہ اس کا وجود ان کے وطن میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

اسی لیے آج وہ ان سب کو اس کی زیارت کرانے لائے ہیں اور جلد ہی جب انھیں موقع ملے گا۔ وہ انھیں اس پر سوار بھی کرائیں گے مگر کئی روز گزرنے پر بھی ایسا موقع نہ آیا۔ آغا بیمار پڑ گئے۔ ان کی روز افزوں کھانسی جان کا روگ بن جاتی تھی۔ وہ خانم کے "خیراتی دوا خانے" سے لائی دوا پی کر دن بھر چارپائی پہ پڑے رہتے۔ دل چیر دینے والی آواز میں گنگنایا کرتے۔

نہ مکتوب تو می آید نہ از حالت خبر دارم

(نہ تمھارا کوئی مکتوب آتا ہے نہ تمھاری حالت کی خبر ہے)

پھر آہ بھر کر کہتے:

چوں مسافر باز شد ہستم یا نیستم

خانم تیر کی طرح اندر سے نکلتی اور چادر کے کنارے سے آنکھیں پونچھ کر کہتی:

"روزی مسافر باز خواہد آمد"

(مسافر ایک روز ضرور واپس آئے گا)

اور آغا کی ذات پر بھی خاموشی کا وقفہ در آتا۔

آغا کا باہر جانا کیا موقوف ہوا۔ یاور خاناں پر ان کی فکار انگلیوں کا راز کھلنے لگا۔ گھر میں اب وہ وقت خمیری روٹی پھیکے قہوے کے گلاس کے ساتھ نگلی جانے لگی۔ قہوے کی کیتلی جو سارا سارا دن آگ پہ دھری کالی ہوتی رہتی تھی، اب وقت کے وقت چولھے پہ چڑھائی جانے لگی۔ تب یاور خاناں کے خالص پختون خون نے ابال کھایا۔ اس نے جنوں دول کی سلی تھیلی سے وہ مڑے تڑے نوٹ نکالے جو کوہاٹ بس اڈے پر دادی نے اس کے حوالے کیے تھے۔ چھتی سے لوہے اور تام چینی کے روغن اترے تھال کو اتار کر اس میں ٹلنگی، سوکھا دھنیا اور الائچی سجا کے بڑی سڑک کے کنارے جا بیٹھا۔ پہلے روز راہگیروں نے صرف اسے دیکھا۔ دوسرے روز اس کے قریب رکے اور تیسرے دن ایک آدھ نے دو چار الائچیاں اور پاؤ بھر دار چینی خرید ڈالی۔

اگلے پندرہ بیس روز میں وہ اس قابل ہو گیا کہ خانم کے دسترخوان پر گوشت نہ سہی سبزی دال ضرور چن دیتا۔ انہی کملائے سنولائے دنوں میں ایک روز وہ واپس آیا تو آغا کے پاس ایک اجنبی صورت پیر مرد بیٹھے دیکھا جس کے چہرے سے تھکن ہویدا تھی۔ نیالی پگڑی کے میل خوردہ پیچ کسی لمبے سفر سے آمد کی گواہی دے رہے تھے۔

البتہ آغا اسے پہلے کی نسبت قدرے خوش اور بشاش معلوم ہوئے۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلایا۔

یہ ہرات میں میرے ہم کار ہوتے تھے۔ آج مدت بعد ملے ہیں اور میرے لیے بڑی خوشخبری لے کر آئے ہیں۔

یاور خاناں کو ان سے ملنے کی خوشی کیا ہوتی وہ اس بات پر مسرور تھا کہ آغا آج بڑے دنوں بعد مسکرائے تھے۔ ان کی کھچڑی داڑھی ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

اگلی صبح انھوں نے پھر اسے پاس بٹھا لیا۔

یاور خاناں! تم جانتے ہو آج میں کتنا خوش ہوں؟ سیف اللہ میرا حقیقی بھائی ہے۔ دس سال پہلے جنگ کے مہلک شعلوں نے اسے نگل لیا۔ وہ دو[?]... کا مسافر بنا اور نامعلوم مدت کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا۔ آج وہ مجھ سے ملنے یہاں آ رہا ہے۔

تب اسے معلوم ہوا کہ کل جو خوشخبری لے کر اجنبی آیا تھا۔ اسی کی تاثیر ہے کہ آج گھر کا ہر ذرہ ہزار داستاں کی طرح چہک رہا ہے۔

تم میرے تیسرے بیٹے ہو یاور خاناں۔ انھوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ مجھے اپنے انتخاب پہ ناز ہے۔

پھر وہ حسب عادت جلدی اٹھے، اور اسی شام انھیں لیے وہ ایک مرتبہ پھر ریلوے اسٹیشن کی جانب رواں ہوا جہاں وہ چند ماہ پہلے بچوں کے ہمراہ گئے تھے۔ فرق یہ تھا کہ تب آغا صحت مند تھے اور اب بیمار۔ مگر چال میں آج بھی پہلے کی سی سبک رفتاری اور روانی تھی۔

انھوں نے اپنا اکلوتا سوٹ دھلوا کر پہنا تھا۔ ہرات کی پوستین کو دوبارہ کر استری کیا تھا اور کوہاٹی چپل کو کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کے بعد اب وہ بازار کے اس حصے میں اڑے اڑے پھر رہے تھے جہاں قہوہ خانوں کی رونق ماند پڑنے لگتی ہے اور ساگودانوں کے ٹھیلوں کے پہلو بہ پہلو دندانہ بیچنے والے کریم ... بازار بند، دیا سلائی، سگریٹ، پان والے خوانچہ بردار ... کا پاؤ و چکاتے ہیں۔

بازار ختم ہوا۔ پھر بڑی سڑک گزری، پھر دائیں اور بائیں مڑتے اور ناک کی سیدھ پہ یک رخ چلنے کے بعد ریلوے کا مخصوص نوکدار جنگلا نظر آیا جو پشاور ریلوے اسٹیشن کی حدود کے شروع ہونے کی نشاندہی کرتا تو آغا کی تھکی چال میں عجیب سی مستی در آئی۔ انھوں نے مڑ کر کسی معمول کی طرح پیچھے پیچھے آتے یاور خاناں کو دیکھا اور بولے: "دس سال ایک ... ہے۔ کسے خبر اب وہ کیسا ہوگا؟"

مجھے پہچانے گا بھی یا نہیں۔

پہچانے گا کیوں نہیں آغا! خون خود بول پڑے گا۔ آغا اس کی بات پہ کھل کر ہنسے۔ یاور خاناں کو لگا جیسے سورج بادلوں کے درمیان سے نکل آیا ہے۔ ہر طرف روشنی چمکنے لگی ہے۔

اسٹیشن پہ وہی معمول کی رونق تھی۔ قلی، خوانچے والے جگہ جگہ پھر رہے تھے۔ چائے کے کھوکھوں پہ مخصوص رونق تھی اور رسالوں ... اکا دکا لوگ فلمی جریدوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

آغا پلیٹ فارم پہ دھرے ننگی بنچ پہ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ٹہلنے لگے پھر جھک کر ریل کی پٹڑی پہ دور تک دیکھا کیے جہاں سے گاڑی کو نمودار ہونا تھا۔ پھر واپس آئے اور بنچ پہ بیٹھ کر گنگنانے لگے۔

... سترگو بلا واخلے ما

... زما

کبھی کبھی سب سے توجہ ہٹا کر وہ یاور خاناں کو پکڑ کر پوچھتے "کیا خیال ہے یاور خاناں! گاڑی آج لیٹ تو نہیں ہو گئی؟

یا... سوچتا ہوں۔ سیف اللہ مجھے پہچان تو لے گا؟

یا... تمھاری خانم نے آج کابلی پلاؤ بنانا تھا۔ اسے میوہ خشک تو پکڑا آئے تھے؟

اور جب یاور خاناں ان کے ہر سوال پہ تسلی بخش جواب دیتے دیتے اکتانے لگا تو گاڑی کا اگلا سرا مخصوص گڑگڑاہٹ کے ساتھ نمودار ہوا اور پلیٹ فارم اس کی آمد سے تھرتھرانے لگا۔ آغا یک لخت کھڑے ہو گئے۔

دھڑ دھڑ کرتے وہ چار ڈبے ان کے سامنے گزر گئے اور گاڑی سست ہوتے ہوتے بالآخر رک گئی۔ پھر وہی معمول کی دھکم پیل، ہر شخص چڑھنے یا اترنے کو لپکا پڑتا تھا۔ پلیٹ فارم پر دور دور تک سروں کی فصل اگ آئی تھی۔

آغا کبھی ایک ڈبے کی طرف دیکھتے۔ کبھی تیز تیز چلتے دوسری جانب جاتے۔ بھیڑ کے اندر سے جھانکنے کی کوشش کرتے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ انسانی جنگل کے اوپر سے تیر کر گاڑی کے اندر داخل ہو جاتے۔

بھیڑ قدرے چھٹی تو آغا پھر آگے کو ہوئے۔ سامنے کے ڈبے سے نکلتے کسی مانوس چہرے نے ان کے قدموں کو اٹھایا۔ پھر یوں جکڑ لیا جیسے پتھر کی طرح ساکت آغا زمین میں گڑ گئے ہوں۔

'یاور خاناں' نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ بے بازو اور بن ٹانگوں کے گٹھڑی سا دھڑ تنومند جوان کے کندھوں پہ دھرا دروازے کے پائیدان سے اتر رہا تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پہ آغا کی سی کھڑی ناک دھری تھی اور سنہری بالوں سے بھرے ماتھے تلے دو بے نور آنکھیں یوں گڑی تھیں جیسے آغا حکمت اللہ کی جوانی دشت لیلیٰ کے صحرا میں مسافر ہو گئی ہو۔

■■■

ہلدی بیچاری کیا کرے

ایک درد کی داستاں اُسے کہنے کو لفظ کم پڑ گئے تھے

سین علی

چل چل چنبیلی باغ میں میوہ کھلاؤں گی...... میوے کی ٹہنی ٹوٹ گئی چادر بچھاؤں گی...... چادر کا پلو پھٹ گیا...... درزی کو بلاؤں گی...... درزی کی سوئی ٹوٹ گئی...... گھوڑا دوڑاؤں گی...... گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی...... ہلدی لگاؤں گی...... میں اور فضہ ہتھیلیوں پہ کبھی سیدھی کبھی الٹی کبھی اوپر کبھی نیچے تالی بجا بجا کر کھیل رہی تھیں۔ لنچ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا اور میرا تو روز کا معمول تھا کھیلنے کودنے میں ہاف بریک گزر جاتی پھر بیتابی سے چھٹی کی گھنٹی کا انتظار......

میں نے کبھی لنچ کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا اور فضہ لے کر ہی نہیں آتی تھی۔ عموماً نہ تو اس کے پاس لنچ ہوتا اور نہ ہی پیسے۔ ہماری تیسری کلاس تھی۔ البتہ اپنا لنچ ضرور ختم کرتی۔ تنگ آ کر امی کہتیں کہ کچھ بھی کھا لینا جو اسکول کی کینٹین سے مل جائے مگر بھوکی مت رہا کرو۔ فضہ کا معاملہ مختلف تھا۔ فضہ قدرے صحت مند، صاف گندمی رنگت والی، بھولی صورت اور گول مٹول سی بچی تھی اور میں دبلی سی۔ اسکول میں میری فضہ کے علاوہ کسی سے خاص دوستی نہیں تھی۔ ہماری کلاس کی لڑکیاں اتنی لمبی اور تیز طرار تھیں کہ مجھے لگتا یہ مجھ سے کافی بڑی ہیں۔ اس لیے میں ویسے ہی ان سے خار کھاتی اور اگر کسی نے میری صحت کا مذاق اڑایا تو کبھو دوستی بھی ہو ہی نہیں سکتی۔ فضہ کم سم اور چپ چاپ، ہر بات ماننے والی اور کبھی نہ جھگڑنے والی لڑکی تھی۔

تیسری کلاس میں ہم دونوں ہی پکی سہیلیاں تھیں۔ میتھ کے سوالوں سے لے کر ٹیسٹ تک ہم دونوں ساتھ ہوتیں، کئی بار ٹیچر سے نظر بچا کر اپنی آنسر شیٹ ایک دوسرے کو دکھاتیں بھی کبھی امی سے چھپا

اپنی تصویروں کا البم اسکول بیگ میں چھپا کر لے آتی۔ فضہ میری نسبت صحت مند تھی تو قدرے سست تھی۔ ہر کام آہستہ اور سستی سے کرتا اور ہر ٹیچر سے ڈانٹ کھاتی۔ کئی بار میں فضہ سے کہتی کہ تم اتنا ڈرتی ہو، حالانکہ تمہیں کبھی سزا بھی نہیں ملتی۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی سزا والا کام کرتی تو سزا ملتی۔ فارغ وقت میں اپنے گھر کی باتیں اور بہن بھائیوں کے قصے سنائے جاتے۔ فضہ کی ایک چھوٹی بہن اور ایک بھائی بھی تھا۔ بتاتی کہ اس کی امی بہت سخت ہیں اور اسے اپنے ابو یاد آتے ہیں اور جس دن فضہ نے مجھے بتایا کہ اس کے ابو فوت ہو گئے ہیں، اس وقت تک شاید مجھے فوت ہونے کا مطلب بھی نہیں پتا تھا۔ بچی کی جبلت میں باپ کی محبت ازل سے موجود ہوتی ہے خواہ باپ کی شکل یاد بھی نہ ہو...... میں جب بھی کبھی اپنے ابو کا تذکرہ کرتی فضہ بے انتہا اداس ہو جاتی۔

فضہ کی امی کو میں نے ریفرنڈم پر دیکھا تھا چھوٹا قد، عام سی صورت، قدرے موٹی سی اور خوش لباس خاتون تھیں۔ ہمارے اسکول کے ساتھ ہی ایک بڑا پلے گراؤنڈ تھا جہاں میں اکثر شام کو کھیلتی تھی۔ گراؤنڈ کے ساتھ ہی سرکاری ڈسپنسری اور اسکول تھا۔ جس دن ریفرنڈم ہوا، ہمارے لیے تو وہ کھیل کود اور چھٹی کا دن تھا۔ صبح سے شام تک گراؤنڈ میں اچھل کود ہوتی رہی۔ فضہ کی امی اور دس پندرہ خواتین اسکول کی بلڈنگ میں ہماری ٹیچرز اس دن ووٹ ڈلوا رہی تھیں۔ پہلی مرتبہ کان لفظ ووٹ سے آشنا ہوئے تھے۔ مجھے ووٹ کو دیکھنے کا بہت شوق تھا، کیونکہ کئی بار میری امی کہتی تھیں کہ لگتا ہے تم نے بڑی ہو کر جرنلسٹ بننا ہے۔ تب شاید اس پیشے کی بہت قدر تھی۔ مجھے کچھ علم

نہیں تھا کہ یہ جرنلسٹ کیا بلا ہے۔ کسی نے کہا آج یہاں جرنلسٹ اور اخبار والے بھی آئیں گے، موقع اچھا تھا، میں انتظار کرتی رہی کہ دیکھوں یہ اخبار والے کیسے ہوتے ہیں؟ اتنی جلدی کیسے لکھتے ہیں اور اتنی زیادہ باتیں انہیں کیسے پتا چلتی ہیں؟ خیر مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور پولیس کے ساتھ ہی صحافیوں کی وین بھی آگئی۔ انھوں نے عورتوں کو دیکھا، پھر آپس میں ناجانے کیا باتیں ہوئیں۔ انھوں نے دس پندرہ عورتوں کو کھینچ کر قریب قریب کھڑا کیا تاکہ فوٹو اتار کر اخبار میں لگا سکیں۔ اگلے دن اخبار میں فوٹو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ بہت رش میں لی گئی تصویر ہے۔ پولیس والوں کو پتا نہیں کس بات کا غصہ تھا، نا جانے کس جلدی میں تھے......؟ ٹیچرز کو حکم ہوا کہ جلدی سے ساری کاپیوں پر دستخط کر دو، حکم کی تعمیل ہوئی، انگوٹھے لگانے کا مرحلہ آیا تو پولیس والے، فضہ کی امی اور کئی دوسرے لوگ ہاتھ کی ہر انگلی کو سیاہی سے رنگ کر ٹھپے لگا رہے تھے۔

فضہ کی امی میں مجھے کوئی جاذبیت نظر نہیں آئی تھی مگر میری اور فضہ کی دوستی وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔ کم سنی سے لے کر بلوغت تک ہر سنگ میل پر ہم ساتھ ہی تھیں۔ جب ہم پانچویں کلاس میں تھیں تو فضہ نے دوپٹا بھی اوڑھنا شروع کر دیا جب کہ کلاس کی بیشتر لڑکیاں اسکول یونیفارم میں دوپٹے کے بغیر ہی اسکول آتی تھیں۔ فضہ کی اٹھان بھی عام لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ مگر اٹھان زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، اصل بات ذہنی عمر کی ہوتی ہے اور ذہنی عمر میں شاید وہ ہم سب سے پیچھے تھی یا آگے، مگر ہمارے ساتھ نہیں تھی۔

تب میرا پسندیدہ مشغلہ ابر جاتی اور گلوکوز کو زبان پر رکھ کر ٹھنڈک کا مزہ لینا تھا، بسکٹ بھی میری دسترس

سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ کئی بار گھر میں مہمان موجود مگر اسی وقت منگوائے گئے بسکٹ غائب ملتے۔ امی نے کھانے پینے پر کبھی روک ٹوک نہیں لگائی تھی...... اور چٹخارے لے لے کر فضہ کو یہ سارے قصے سنانا روٹین کا حصہ تھے۔ فضہ کی کہانیاں قدرے مختلف ہوتیں۔ اس کی امی ہر کھانے والی چیز لاک میں رکھتی تھیں اور یہ بات کم از کم مجھ سے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ کئی بار لگتا کہ فضہ جھوٹ کہتی ہے۔ فضہ ابھی بھی ویسی ہی تھی معصوم سی، قدرے موٹی، گیلی سی، کئی بار اس کی باتوں سے لگتا کہ وہ ماں کے اتنا قریب نہیں ہے، بلکہ اپنے مرحوم باپ کے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ اس کی ہر بات کا محور اس کے ابو ہی ہوتے۔ کبھی اپنے ماموں اور خالاؤں کا تذکرہ بھی کرتی، مگر پھوپھو یا تایا چچا کا ذکر کبھی نہیں سنا تھا۔ فضہ کی امی کہیں جاب کرتی تھیں، مگر اس نے کبھی زیادہ نہیں بتایا۔ اتنی گہری دوستی کے باوجود نہ کبھی فضہ نے مجھے اپنے گھر بلایا اور نہ ہی کبھی ہمارے گھر آئی۔ ظاہر ہے ایک بیوہ اور ورکنگ وومین کے پاس اپنے بچوں کو گھمانے کا وقت کہاں سے نکلتا ہوگا۔

ٹین ایج میں بھی اکٹھے قدم رکھا۔ اب سوچ کا انداز اور پسند ناپسند تبدیل ہو رہی تھی۔ میری بڑی بہن کالج میں پہنچ گئی تھی اور اب ہمارے موضوعات میں آگے کیا کرنا ہے؟ کون سے مضامین اختیار کرنے ہیں؟ سائنس پڑھنی ہے کہ آرٹس، شامل ہو گئے تھے۔ نہ جانے ہم سب لڑکیوں نے کب سے خود کو بہت بڑا سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اب ٹیچرز کے مذاق اڑائے جاتے، کارٹون بنتے اور اُلٹے سیدھے ناموں سے نوازا جاتا...... دیکھنا تو سہی یہ جو سائنس کی ٹیچر ہیں...... ان کی پی ایچ کافی کم لگتی ہے...... ایک قہقہہ بلند ہوتا...... بڑی ایمنڈک ہیں...... ہاہاہاہا...... ایک اور کھنکتا ہوا [illegible] شگاف قہقہہ...... اور اردو ٹیچر کو دیکھو اُف! اتنی [illegible] ہیں، کپڑے ایسے پہنتی ہیں جیسے گلو لگا کر ساتھ چپکائے ہوں...... ؟ پھر ایک قہقہہ...... مگر سب سے مدھم آواز فضہ کی ہی ہوتی۔ فضہ تمہارے ابو ڈاکٹر تھے نا؟ فضہ جواب دیتی، اچھا تو تم بھی ڈاکٹر بنو گی؟ یا نہیں؟ فضہ جواب دیتی۔ مگر کیوں؟ پتا نہیں امی کو پتا ہوگا۔

اس چھوٹے سے شہر کے لوگ ابھی مغربی تہذیب کے اتنے عادی نہیں ہوئے تھے۔ کوئی بھی انوکھا واقعہ لوگوں کے لیے نا صرف اچنبھے کا باعث ہوتا بلکہ موضوعِ سخن بھی بن جاتا۔ شہر کے پوش علاقے میں ایک آنٹی نے ریسٹوران کھولا تھا اور اس کا خوب چرچا تھا۔ ہم لڑکیاں بھلا کب باز رہنے والی تھیں، ایک دن انہیں ریسٹوران والی آنٹی کا تذکرہ چل رہا تھا کہ فضہ میرا بازو کھینچ کر الگ لے گئی۔ فضہ کا گلا رندھا ہوا تھا کہنے لگی اتم بھی سب کے ساتھ میری امی کا مذاق اڑا رہی ہو؟ میں نے حیرت سے پوچھا کیسے؟ کہنے لگی کہ وہ ریسٹوران میری امی نے کھولا ہے۔ میں حیرت زدہ اس کا منہ تکتی رہ گئی، مگر دوبارہ کبھی اس کے سامنے اس کی امی کے متعلق کوئی بات نہ کر سکی۔

ہائی اسکول میں ہم دونوں الگ الگ سیکشن میں چلی گئیں، میں نے اسکول بدل لیا اور فضہ سے کبھی دوبارہ رابطہ نہیں رہا۔ اسکول پھر کالج پھر یونی ورسٹی کی نئی سہیلیاں، نئے سے نئے لوگ مگر میں فضہ کو کبھی بھلا نہیں پائی۔ وقت اتنی جلدی بیت جاتا ہے کہ احساس ہی نہیں ہوتا۔ اگر انسان کو یہ علم ہو جائے کہ سب سے [illegible] دولت کیا ہے تو وہ کبھی مادی چیزوں کے پیچھے لگ کر خود کو اتنا خوار نہ کرے۔ علم کیا ہے؟ ڈگریاں تو حصول روزگار

ذریعہ ہیں یا پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت، وقت پیسہ اور انرجی ہمارے سب سے اہم اور قیمتی وسائل ہیں، ہم ہر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کو تبدیل یا ری پلیس کرتے ہیں۔ وقت بچانا ہے تو انرجی خرچ کریں، کچھ وقت بچ جائے گا۔ انرجی بچانی ہے تو پیسہ خرچ کریں، پیسہ چاہیے تو وقت اور انرجی ادا کیجیے۔

میں کبھی بھی اتنی سوشل نہیں رہی، زیادہ دوستیاں یا تعلقات بنانا یا نبھانا نہیں آتا، مگر میری بہن کافی سوشل اور دوستانہ مزاج کی ہیں۔ کالج یونیورسٹی میں ان کی بہت سہیلیاں تھیں اور وہ سب سے ملتی۔

ایک سہیلی فضہ کی فرسٹ کزن بھی تھی جو یونیورسٹی میں سینئر تھی۔ ایک دن اس سے پتا چلا کہ فضہ کی شادی کو عرصہ ہو گیا، اس نے تو تب میٹرک بھی نہیں کیا تھا جب پیا دیس سدھار گئی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ اتنی کم سنی کی شادی، اس عمر میں تو لڑکیوں کو اپنے بالوں کی چٹیا بنانا بھی نہیں آتی تھی۔ پھر میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ یتیم لڑکی ہے، اس کی ماں نے جلد فرض ادا کرنا مناسب سمجھا ہوگا۔

بیٹیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ہمیشہ ان کے فرض ماں باپ کی نظریں اُٹھائے رکھتے ہیں، خواہ ساری دنیا کا بوجھ اپنی پلکوں پر اُٹھائے پھرتی رہیں، پھر بھی بوجھ ہی کہلاتی ہیں۔ "اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے فرمایا کہ بیٹیاں روزِ محشر ماں باپ کی شفاعت کریں گی، آگ سے بچنے کی ڈھال بن جائیں گی۔" مگر دنیا میں یہی بیٹیاں آگ کی ڈھالیں، کبھی خود سلگتی ہیں، کبھی معاشرہ ان کے والدین کو سلگاتا رہتا ہے۔ جنت اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی ہے۔ خواہ بیٹیوں کی پرورش ہو یا ماں بن کر قدموں میں جنت کا شرف...... جنت اتنی آسانی سے ہاتھ کہاں آتی ہے؟

الیکشن در الیکشن کا سلسلہ چل نکلا تھا ہر دو ڈھائی سال بعد کے الیکشنوں نے عجیب بے دلی کی فضا پیدا کی ہوئی تھی۔ وہی لوگ جو ریفرنڈم پر ہر الیکشن سے پہلے لگا رہے تھے، کبھی پی پی کی اور کبھی دوسری پارٹی میں موجود ہوتے۔ مہنگائی تو طے ہے کہ صرف اوپر کا سفر کرتی ہے نیچے کبھی نہیں آتی۔ یونیورسٹی میں طلبا کا موضوعِ سخن بھی الیکشن کے ساتھ سیاست اور ملکی نظام ہوتا پھر سے الیکشن کا میلہ سجا اور لمبی بحثیں شروع ہو گئیں۔

یونیورسٹی میں میری بہت سی سہیلیاں بنیں مگر فریال اور عائشہ سب سے قریبی تھیں۔ ہر بات پر کھل کر اظہار اور اختلافِ رائے کے باوجود فضہ کے بعد اگر دوستی ہوئی تھی تو فریال اور عائشہ سے۔ فریال کے والد ایک سرکاری محکمے میں اہم پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے وہ لوگ کئی شہروں میں رہے اور اس کا مشاہدہ ہم سب سے کہیں بہتر تھا۔ یونیورسٹی میں ہی ہماری جونیئرز میں ڈیرہ کے ایک سردار کی بیٹی ربیعہ بھی تھی، جب فریال کے والد کی پوسٹنگ ڈیرہ میں تھی تو وہ دونوں تب سے اسکول کی سہیلیاں تھیں۔ فریال کے ساتھ ساتھ ربیعہ سے بھی گہری چھننے لگی۔

علم بڑا ہے یا پیسہ؟ کیا انسان پیسے کے بغیر علم حاصل کر سکتا ہے؟ کیا تعلیم بکتی ہے؟ کیا علم سے یا ڈگری سے کوئی غریب انسان، کسی کسان کا بیٹا، کسی فیکٹری مزدور کا بیٹا بزنس مین یا صنعت کار بن سکتا ہے؟ کیا سرمائے کے حصول کے بغیر یہ سب ممکن ہے؟ فریال کہتی نہیں...... پڑھ لکھ کر وہ اچھی نوکری کرے گا تھوڑا سا معیارِ زندگی بلند ہو جائے گا مگر مزدور کا بیٹا مل

کا مالک نہیں بنتا۔

میں کہتی نہیں علم بڑا ہے۔ قائد اعظم کو دیکھو، نیلسن منڈیلا کو دیکھو، فریال صرف مسکرا دیتی۔ ایک دن اسی بحث و تکرار میں ربیعہ بھی شامل ہو گئی۔ میں، فریال اور عائشہ اس بات پر متفق تھیں کہ تعلیم سے انسان کا معیارِ زندگی کسی حد تک بہتر ہو سکتا ہے مگر ربیعہ کہنے لگی، ”مجھے تمہارے شہر میں آکر عجیب عجیب باتیں دیکھنے کو مل رہی ہیں، ساری لڑکیاں پڑھ رہی ہیں، ارے پڑھ کر انھوں نے کون سا تیر مار لینا ہے، یہی کسی اسکول میں یا کالج میں استانیاں لگ جائیں گی۔“ فریال مسکرا کر کہنے لگی، اچھا ہے نا۔ ربیعہ نے کہا اچھا خاک ہے، ان کو اتنی نوکریاں کون دے گا؟ جو کام ان کے باپ دادا کر رہے ہیں وہی ان لوگوں کو کرنے چاہئیں۔ اب دیکھو گرلز ہوسٹل کی جمعدارنی کی بیٹی بی اے کر رہی ہے۔ کل یہی لڑکی ہوسٹل کے باتھ روم دھونے پر تیار نہیں ہو گی...... مجھے خواہ مخواہ طیش آ گیا۔ مگر پھر بھی ضبط کر کے کہا ربیعہ کل کو جب ہماری قوم ترقی کرے گی تو ہم سب اپنے باتھ روم خود دھوئیں گے۔ ربیعہ کہنے لگی ارے یہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ میں نے کہا کہ ہمارے اسکول کی خاتون چپراسی کی بیٹی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے، تعلیم سے کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی حد تک تو ترقی کرے گا۔ فریال نے مجھے روکا کہنے لگی چھوڑو دو بحث، تعلیم ان جاگیرداروں کی سوچ تبدیل نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا کہ اسی لیے تو میں ان لوگوں کی سیاست کی مخالف ہوں، کیا نظام لائیں گے یہ لوگ ہمارے ملک میں جن کی سوچ صرف لوگوں کو دست نگر بنائے رکھنے تک محدود ہے۔ ربیعہ چلی گئی مگر بحث جوں کی توں جاری رہی، علم بڑا ہے یا پیسہ؟ میں نے کہا علم ہی بڑا ہے ہر حال میں علم ہی بڑا ہے...... عائشہ بولا میری باتوں پر متفق اور ہم خیال ہوتی تھی مادی.... کہنے لگی، نہیں یار...... پیسہ ہی بڑا ہے۔ پچھلے سال ہمارے کالج کی سالانہ تقریبات میں وفاقی وزیر بلاول کی بیگم مہمان خصوصی تھی۔ گورنمنٹ کالج کی پرنسپل ان کے سامنے بچھی جا رہی تھیں، دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور زیادہ دکھ تب ہوا جب اس وزیر کی جاہل بیوی نے مائیک ہاتھ میں لے کر پنجابی میں صرف اتنا کہا ”تہاڈی میڈم نے کالج لئی بسا منگیاں سن..... اپنے کولوں دو بسا دے دتیاں نیں“ (آپ کی پرنسپل نے کالج ٹرانسپورٹ کے لیے بسوں کی درخواست کی تھی، ہم نے اپنے پاس سے دو بسیں آپ کے کالج کو دے دی ہیں)

نیاز احمد کا نام سیاسی حلقوں میں بہت معتبر نام تھا۔ مارشل لا ہو یا جمہوری دور، ہمیشہ حکومت میں رہے۔ جاگیردار، صنعت کار، اونچی فصیلوں والے محل اور ان طیارہ تک ملکیت میں تھا۔ اس الیکشن میں ان کا صوبائی نشست سے امیدوار تھا۔ نیاز احمد کا نام تب آیا کہ نئی بحث شروع ہو گئی، نیاز احمد آج کل صنعت کاروں اور تاجروں کی پارٹی کے ساتھ تھا وہ ایسا سیاست دان تھا کہ جسے کسی بھی پارٹی کا ٹکٹ مل سکتا ہے۔ جب اس کو پارٹی ٹکٹ پارٹی لیڈر کی وفاداری پر مت ملتا بلکہ برادری کی بنیاد پر کہ اس حلقے میں اس کی برادری کے ووٹرز زیادہ تھے، کبھی اس علاقے میں اثر و رسوخ کی بنا پر، کبھی دھونس کبھی دھاندلی، کبھی چندہ کے یہی جمہوریت کے پھندے ہیں۔

عائشہ دکھ سے کہنے لگی، اتنے سالوں سے میرے والد محنت کر رہے ہیں مگر کاروبار ترقی نہیں کر سکا۔ ان

کی ایمان داری محنت اور خلوص سے کام کیا۔ نتیجہ کیا، میں ایم بی اے میں نہیں پڑھ سکی کہ وسائل اتنے نہیں تھے، بڑی بہن کی شادی، گھر کے اخراجات...... اب ابو نے موجودہ حالات کے مطابق اپنا راستہ چن لیا ہے۔ فریال نے کہا کہ بات وہی ہے، اپنے کاروبار کو چھوٹ دینے کے لیے یہ لوگ سیاست کرتے ہیں، ان کی خدمات کے ڈھونگ اور منشور تمہارے جیسے کتالی لوگوں کو الو بنانے کے لیے ہوتے ہیں۔

اسی دن شام کو اپنی بہن کے ساتھ اس کی سہیلی کی سالگرہ میں جانا تھا، لفضہ کی کزن کے گھر پارٹی تھی، میں نے اس لیے حامی بھر لی کہ شاید لفضہ سے یا اس کی ماں سے ملاقات ہو جائے، جب بھی لفضہ کا ذہن میں خیال آتا تو پہلا احساس یہ ہوتا کہ اتنی کم عمری کی دلہن صرف پندرہ سال کی لڑکی، اب تو اس کے دو یا تین بچے بھی ہوں گے۔ پتا نہیں اب دیکھنے میں کیسی لگتی ہو؟ خوش شکل تو وہ تھی ہی اب کافی پیاری ہو گئی ہو گی۔ انھیں سوچوں میں گم شام کو تقریب میں پہنچ کر جب لفضہ کی کزن سے لفضہ کا پوچھا کہ لفضہ کہاں ہے پارٹی میں آئی کیوں نہیں؟ اس کے کتنے بچے ہیں؟ مجھے ان کا نمبر ہی دے دو؟ اس نے طنزیہ نظروں سے میرے سوال سنے اور کہا تمہیں پتا ہے لفضہ کی شادی کہاں ہوئی ہے؟ جواب سن کر میں سکتے میں آ گئی۔ ایک چیخ میرے اندر اٹھی مگر میں آج تک اس چیخ کو باہر نہیں نکال سکی۔ پیٹ میں ایک دم سے درد کی شدید لہر اٹھی اور میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

لفضہ کی شادی پندرہ سال کی عمر میں نیاز احمد سے ہو گئی۔ سب سوال فضول تھے، ایسی شادیاں جو صیغۂ راز میں رہتی ہیں۔ ایسی بیوی جو معاشرے میں آ

گر شوہر کا نام تک نہیں بتا سکتی، ماں نہیں بن سکتی، نکاح ہو بھی جائے تو اعلان نہیں ہوتا...... شادی نہیں ہوتی...... پتا نہیں کیا ہوتی ہے؟ ایک دم سے ذہن میں بے شمار فلیش بیکس آنے لگے...... چل چل چنبیلی! باغ میں میوہ کھلاؤں گی...... ریستوران کی سرپرستی...... کاش میرے ابو زندہ ہوتے...... ویلفیئر مام...... سیاسی کے دھبے...... جاگیرداروں کی...... صنعت کاروں کی حکومت...... اونچے محل...... میرے کی ٹہنی ٹوٹ گئی...... سرمایہ دارانہ نظام...... بیلی کا پنجرہ...... چادر کا پلو پھٹ گیا۔ شاہین اب اونچی پرواز نہیں کرتا...... لارنس آف عریبیا...... قمر کی لالیوں پر پلتا ہے...... اڑان اب طیاروں کے ساتھ ہے...... کاروبار کا تحفظ...... قربانی، گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، بلدی لگاؤں گی اونچی فصیلوں سے چیخ باہر نہیں آتی...... میرے درد کو جو زباں ملے...... لفضہ لب خاموش...... کسی نے سارے جسم کی سوئیاں نکال چھوڑی تھیں مگر آنکھوں کی رہنے دیں۔ اللہ کے ساتھ پتلے تراشنے والوں پر ایسا غضب پڑا کہ باہر سے تو سب انسان ہی رہے، مگر اندر سے جون بدل گئی۔ شیر کھلانے والے الّو بھکّو کی طرح بنتے گئے۔ شاہین کے بال و پر گرنے لگے، سر اور گردن پروں سے محروم ہوئے...... پیٹ بڑھتا گیا...... پتا نہیں کیسی بھوک ہے جو مٹتی ہی نہیں؟...... ایک عجیب ساخت کا گدھ......

آنکھیں اندھی رہیں، کچھ دکھائی دیا نہ سجھائی دیا، آنکھوں کے زخم بھی عجیب ہوتے ہیں، بلدی بیچاری کیا کرے؟

ہوا باز جو 18 گھنٹے تیرتا رہا

موت و حیات کے درمیان زبردست کشمکش

عاصم محمود

دوپہر دو بجے مائیکل ٹریپ کا سیسنا۔ 150 فضا میں بلند ہو گیا۔ یہ 26 جولائی 2013ء کی بات ہے۔ جلد ہی وہ شمالی امریکا کی عظیم جھیلوں میں سے ایک جھیل ہیورون (Huron) پر پرواز کرنے لگا۔ اس کا جہاز سطح آب سے تین ہزار فٹ بلند تھا۔ وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے جہاز چلاتے ہوئے لطف اندوز ہونے لگا۔

لیکن ٹریپ کی بیوی جولیا اس سفر سے خاصی ناخوش تھی۔ اس نے یہ تک کہا تھا کہ وہ جانے سے پہلے وصیت لکھ جائے، مگر ٹریپ نے بیگم کی بات ہنسی میں اڑا دی۔ گو یہ حقیقت ہے کہ اس سفر میں خطرات زیادہ تھے اور سکون کے لمحے کم!

اول خطرہ یہی تھا کہ ہوائی جہاز 42 سالہ ٹریپ سے بھی زیادہ بوڑھا تھا۔ دوم وہ پہلی بار اتنے لمبے سفر پر نکلا تھا۔ سوم اس نے کبھی پانی پر جہاز نہیں چلایا تھا۔ چہارم ٹریپ نے ابھی تک صرف 130 گھنٹے ہی جہاز اڑایا تھا۔ لیکن ان خطروں کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ بحفاظت اپنی منزل تک پہنچ جائے گا۔

مائیکل اب تک سیکڑوں بار جہاز اڑا اور اتار چکا تھا۔ پھر اس نے منصوبہ احتیاط سے بنایا اور ایک دن قبل ہی چل پڑا تاکہ خراب موسم اسے تنگ نہ کرے۔ وہ نیویارک کے مضافاتی قصبے گورونر کا باسی تھا۔ جب کہ اسے ریاست وسکونسن کے شہر ایوکلیئر جانا تھا۔ وہاں ایک تقریب میں دور و نزدیک کے بھی رشتے دار جمع ہو رہے تھے۔ اپنے جہاز پر سفر کرنے سے وہ کئی سو ڈالر بچا لیتا۔ پھر ہوائی اڈوں میں جو بھیڑ بھاڑ اور سخت چیکنگ ہوتی ہے اس سے بھی اسے نجات مل جاتی۔

آدھ گھنٹے سفر کے بعد اچانک انجن کی آواز بلند ہونے لگی۔ مائیکل نے سوچا ''کیا ایندھن ختم ہو رہا ہے؟ مگر نہیں اس نے تو ٹنکیاں پوری بھروائی تھیں۔'' بہرحال اس نے سوئچ دبا کر جہاز کو نئی ٹینکی پر ڈال دیا۔ لیکن آواز میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ انجن بدستور اپنی طاقت کھو رہا تھا۔

اب جہاز کی بلندی کم ہونے لگی۔ مائیکل نے گھبرا کر کاربوریٹر ہیٹر چلایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس نے تھراٹل پورا کھول دیا۔ لیکن جہاز کی اڑان جاری رہی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا دور افق پر جھیل کا کنارہ نظر آ رہا تھا۔

مائیکل نے بذریعہ ریڈیو قریبی ہوائی اڈے میں واقع لانسنگ ریاست مشی گن رابطہ کیا اور کنٹرول ٹاور والوں کو بتایا "میں جھیل ہورون پر محو پرواز ہوں۔ میرا انجن خراب ہو چکا ہے۔ برائے مہربانی مجھ پر نگاہ رکھیے تاکہ میں بہ حفاظت ساحل تک پہنچ جاؤں۔"

کنٹرول ٹاور نے اسے تاکید کی کہ وہ ایمرجنسی ریڈیو فریکوئنسی پر چلا جائے تاکہ امدادی کارکن اس کی جگہ شناخت کر سکیں۔ دوسری طرف جہاز بڑی تیزی سے سطح آب کے نزدیک ہو رہا تھا۔ چنانچہ مائیکل نے لانسنگ کنٹرول ٹاور کو بتایا "میں بس پانی میں غوطہ لگانے لگا ہوں۔"

تب تک جہاز کی رفتار 79 کلومیٹر فی گھنٹہ ہو چکی تھی۔ اگر وہ 77 کلومیٹر ہوتی تو جہاز پھر فضا میں نہ اڑ پاتا۔ اچانک جہاز کا انجن پھر چل پڑا...... لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے اوپر لے جانا ناممکن تھا۔ چنانچہ جہاز کا اگلا حصہ پہلے پانی سے ٹکرایا۔ مائیکل ریڈیو پر "مے ڈے، مے ڈے" کہنا چاہتا تھا مگر پانی کی تیز بوچھاڑ نے اسے ڈبو کر رکھ دیا۔ تب شام کے سوا چار بجے تھے۔

42 سالہ مائیکل ٹریپ ماہر اور کامیاب موٹر مکینک تھا۔ سوا چھ فٹ لمبے اس امریکی نے خود کو خاصا فٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ باقاعدگی سے ورزش کرتا اور کار دوڑ میں حصہ لیتا تھا۔ اسے ہنسنا ہنسانا پسند تھا اور غم و مایوسی کو قریب نہ پھٹکنے دیتا۔ کاریں چلانا اور ان کی مرمت کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

مائیکل نے کبھی پائلٹ بننے کا نہیں سوچا تھا۔ بس تین سال قبل ایک واقعے نے اسے ہوا بازی کی طرف مائل کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دوست اسے اپنے سیسنا پر سیر کرانے لے گیا۔ ہوائی جہاز کی سیر کرتے ہوئے اسے اتنا لطف آیا کہ اس نے خود بھی پائلٹ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ کئی ماہ کی تربیت کے بعد اسے لائسنس ملا تو مائیکل نے 14 ہزار ڈالر میں سیسنا طیارہ خرید لیا۔

جب اس نے اپنے بچوں 17 سالہ نکولاس اور 9 سالہ ڈریک کو پہلی بار ہوائی جہاز میں سیر کرائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ تاہم جولیا سیسنا سے متاثر نہ ہوئی۔ اسے اس پر سوار ہوتے ہوئے خوف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی دفعہ کے سوا وہ کبھی شوہر کے "پالتو" پر نہیں بیٹھی۔

زیر آب آتے ہی مائیکل نے نشست کی پیٹی کھولی، دروازے سے باہر نکلا اور اوپر پہنچ کر جہاز کی دم پکڑ لی۔ سیسنا تیزی سے پانی میں ڈوب رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ مائیکل نے "بائی بے بی" کہہ کر دکھی دل سے اسے خدا حافظ کہا۔

اب اسے خود کو بچانے کی جدوجہد کرنی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک زندہ ہے۔ خوش قسمتی سے ابھی جھیل کا پانی زیادہ سرد نہ تھا۔ اس کا درجہ حرارت 18 تا 22 ڈگری سیلسی گریڈ کے درمیان تھا۔ لیکن کوئی سہارا نہ ہونے کے باعث اسے تیرتے ہوئے ہی ساحل کی سمت بڑھنا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ پانی کی لہریں 6,5 فٹ بلند تھیں۔

زیادہ تیرتے ہوئے مائیکل کو ڈبونے کی سعی کرنے لگیں۔ وہ ہاتھ اور ٹانگیں چلاتے ہوئے ایک سے نبرد آزما ہوتا تو دوسری آ پہنچتی۔ اس نے سوچا کہ بدبخت لہروں کا مقابلہ کرنے کی خاطر کوئی پلان بنانا چاہیے۔

وہ نوجوانی میں کچھ عرصہ فوج میں رہا تھا۔ وہیں اسے پتلون کے ذریعے ایمرجنسی میں لائف جیکٹ بنانا سکھایا گیا تھا۔ لہٰذا اب اس نے اپنی جینز اتاری، اس کے پائنچوں میں ہوا بھری، دونوں سرے باندھے اور پھر پتلون کو گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ لیکن جب ایک بڑی لہر آئی تو پائنچے حلق کے گرد کھنچ گئے اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ چنانچہ عارضی لائف جیکٹ ناکارہ جان کر پھینک دی گئی۔

ایک بار مائیکل نے چت لیٹ کر آرام کرنا چاہا، مگر لہروں نے اسے سکون نہ لینے دیا۔ وہ عالم بے بسی میں سوچنے لگا "ہوائی جہاز کا حادثہ تو مجھے نقصان نہ پہنچا سکا لیکن لگتا ہے ڈوب کر مرنا میرے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔" چند میٹر دور پتلون تیر رہی تھی۔ مائیکل نے پتلون سے بٹوا نکالا اور زیر جامہ میں اڑس لیا تاکہ اس کی شناخت بآسانی ہو سکے۔

ادھر شام جولیا نے فون کال سنی۔ کوسٹ گارڈ نے اسے نامکمل معلومات دیں اور بس یہی بتایا: "مائیکل نے مدد کا (مے ڈے) پیغام دیا تھا۔ اب وہ غائب ہو چکا۔ امدادی کارکن اسے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اس کے ساتھ رابطہ رکھیں گے۔" غم سے نڈھال جولیا نے فون رکھ دیا۔ پہلے تو کچھ عرصہ وہ صدمے کی حالت میں رہی پھر غصے نے اسے بے حال کر دیا۔ جولیا زیر لب بڑبڑائی "میں نے کہا تھا نا کہ نہیں جانا۔" اب انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کوسٹ گارڈ نے مائیکل کو تلاش کرنے کے لیے تین ہوائی جہاز اور تین کشتیاں بھجوا دیں۔ بدقسمتی سے کنٹرول ٹاور یہ تعین نہیں کر سکا تھا کہ سیسنا کہاں گرا ہے۔ چنانچہ چھان بین کا علاقہ 4800 کلومیٹر تک پھیل گیا۔ مرے کو ماریں شاہ مدار کے مصداق 6 فٹ بلند لہروں سے جھانکتا انسانی سر ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

ادھر مشکلات کے باوجود مائیکل نے اپنی ہمت جوان رکھی کیونکہ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ لہریں شوریدہ سر تھیں مگر اسے یاد آیا کہ ایک بارہ سالہ لڑکی نے تیر کر انگلش چینل پار کیا تھا۔ اس نے سوچا "اگر ایک بارہ سالہ لڑکی طویل فاصلے تک تیر سکتی ہے تو میں بھی تادیر پانی میں رہ سکتا ہوں۔"

اسے پھر یاد آیا کہ جہاز میں موجود بعض کام کی اشیاء نکالنا وہ بھول گیا۔ مثلاً آب روک، موبائل فون اور پلاسٹک کولر جس کے سہارے اسے سطح آب پر رہنے میں بہت آسانی رہتی۔ اس نے آزردہ ہو کر پہلو بدلا تو دور اسے کوئی شے نظر آئی۔ شاید شناور (Buoy) تھا۔ یہ سوچ کر مائیکل خوش ہو گیا۔ وہ پھر شناور کی سمت تیرنے لگا۔ مائیکل اس تک پہنچ کر شناور سے لپٹ جانا چاہتا تھا۔ پھر جب کوئی کشتی یا جہاز آتا تو اسے اٹھا لیتا۔ چنانچہ وہ جوش و خروش سے تیرنے لگا۔ ایک گھنٹہ بیتا تھا کہ اسے انجن کی آواز آئی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ایک مال بردار جہاز کو اپنی طرف بڑھتا پایا۔ اس نے بڑی آوازیں دیں، ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ عرشے پر کوئی موجود نہ تھا۔ چنانچہ جہاز گزر گیا۔ ابھی ایک اور بری خبر اس کی منتظر تھی۔

جب وہ گھنٹے کی مشقت کے بعد شناور تک پہنچا تو انکشاف ہوا وہ کسی جہاز سے گرا پیپا تھا۔ اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ ''پھر ساحل تک پہنچنے کی سعی کرتا ہوں۔'' اس نے سوچا۔

تب تک سورج ڈوب چکا تھا۔ لہٰذا ساحل پر بنے گھروں اور ہوٹلوں کی بتیاں جل اٹھیں۔ وہ مائیکل سے تقریباً تین کلومیٹر دور تھیں۔ لیکن رات پڑتے ہی پانی تیزی سے ٹھنڈا ہونے لگا۔ یہ ایک نئی بلکہ بڑی مصیبت تھی۔ کیونکہ سرد پانی عضلات اکڑا دیتا ہے اور سانس بھی بہ مشکل لیا جاتا ہے۔ وہ جلد ہی اس آفت میں گرفتار ہونے والا تھا۔

ادھر اس کے گھر میں متوحش و پریشان اہل خانہ، خاندان والے اور دوست جمع تھے۔ جولیا قدرتاً خاموش عورت تھی۔ لہٰذا کم ہی بولتی، اسے بس فون کا انتظار تھا۔ خاصی رات ہوگئی تو سب اپنے اپنے گھر چلے گئے مگر فون نہ آیا۔ شوہر کے غم میں مبتلا جولیا کروٹیں بدلتی سوگئی۔

جیسے ہی مائیکل کی مے ڈے کال ملی، دو ہیلی کاپٹر، شمالی کیرولینا کا سی۔130 ہوائی جہاز، مقامی شیرف کے ڈپارٹمنٹ کا چھوٹا جہاز اور کینیڈین فضائیہ کا ایک طیارہ اسے ڈھونڈنے نکل پڑے۔ لیکن ان سب کو مائیکل نے نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ انھیں ملا۔

جب مائیکل تھک جاتا تو خود کو ڈھیلا چھوڑتا اور پانی پہ چت لیٹ کر تیرنے لگتا۔ رات ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لہروں کی شوریدگی ختم ہوگئی اور پانی پُرسکون ہوگیا۔ وہ پہلی بار چت لیٹا تو اسے آسمان پر ستارے نظر آئے۔ وہ سوچنے لگا:

''اب کوئی نہیں آنے والا مجھے سورج نکلنے تک انتظار کرنا ہوگا۔''

پھر اسے اپنے گھر والے یاد آنے لگے۔ کئی لوگ اس پر انحصار کرتے تھے۔ بیوی، دو چھوٹے بچے، گیراج میں اس کے ملازم اور دوست۔ وہ اپنے خیالوں میں بیوی، بچوں کے پاس پہنچا اور ان سے میٹھی خوشی کی باتیں کرنے لگا۔ اس خواب آگیں اور مدہوش نیند سے وہ اسی وقت جاگتا جب کوئی شرارتی لہر اس کے منہ میں پانی ڈال دیتی۔ وہ کھانس کر پانی باہر نکالتا اور پھر اپنی حسین تصوراتی دنیا میں پہنچ جاتا۔

ایک دفعہ اچانک کوئی سخت شے اس سے ٹکرائی۔ پہلے وہ سمجھا کہ کوئی لٹھ یا کوڑا ہوگا۔ مگر ہاتھ پاؤں چلائے تو وہ ایک خاصی بڑی مچھلی سے جا ٹکرائے۔ یہ سوچ کر خوف کے مارے مائیکل کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ ایک شارک مچھلی منہ کھولے اسے ہڑپ کرنے آ رہی ہے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے خود کو تسلی دی کہ جھیل ہوروون میں شارک کہاں سے آگئی؟

وہ سکون سے لیٹ کر پھر آرام کرنے لگا۔ اچانک ایک مچھر اس کے کانوں میں بھنبھنانے لگا۔ مائیکل حیرت سے بڑبڑایا ''مچھر یہاں کیا کر رہا؟'' میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ خدا کی پناہ! اس نے ہاتھ پاؤں چلائے اور مچھر کو بھگا دیا۔

رات کے آخری پہر جب مائیکل نے پہلو بدلا تو ساحلی روشنیوں اور اس کے درمیان ایک سایہ آگیا۔ اس نے بغور دیکھا تو پانی پہ ایک ماہی خور پرندہ (Cormorant) کو بیٹھے پایا۔ پرندہ پھر اڑا، اس کے گرد تین چار چکر لگائے، اترا اور مائیکل کی سمت بڑھنے لگا۔ اسے لگا کہ پرندہ چونچ مار کر اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالے گا۔ وہ چلایا ''دفع ہو جاؤ۔'' پرندہ سہم کر اڑ گیا۔

رفتہ رفتہ افق پر اجالا نمودار ہوا۔ سورج نکلنے کا انتظار کرتے کرتے وہ اپنی پوری زندگی کے متعلق سوچنے لگا۔ اس نے کئی احمقانہ فیصلے کیے تھے۔ جولیا سے فضول بحث بھی کی۔ تب اسے بیگم بہت یاد آئی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور پروردگار سے دعا مانگنے لگا ''اے خدا! مجھے آخری بار بیوی سے ملنے دے، آخری بار بچوں کو آغوش میں لینے دے، براہِ مہربانی اس آفت کا انجام اچھا بنا۔''

صبح 9 بجے سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا۔ اس کی گرمائش مائیکل کو بہت بھلی لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کشتی آئی۔ اس نے ہاتھ پاؤں ہلائے مگر کوئی اسے نہ دیکھ سکا۔ شاید وہ کشتی والوں کو دور سے کوئی کوڑا کرکٹ یا لٹھ نظر آتا تھا۔ کشتی غائب ہوئی تو پہلی بار اس پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے سوچا:

''رات کے سرد پانی نے میرے پٹھے اکڑا دیے ہیں۔ تیرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب میرے پاس دو راہیں ہی بچی ہیں..... زندگی یا موت۔ لیکن میں آخری سانس تک موت سے لڑتا رہوں گا۔''

اسی وقت اسے ایک لانچ نظر آئی۔ اس پر تین نوجوان کھڑے تھے۔ انھوں نے ہاتھوں میں مچھلیاں پکڑنے والی بنسیاں تھام رکھی تھیں۔ وہ پوری قوت سے چلایا، ہاتھ ہلائے مگر اس بار بھی کوئی نوجوان اسے نہیں دیکھ سکا۔ اس ناکامی نے مائیکل کو دل شکستہ کر دیا۔ پھر بھی اس نے ساحل کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔

سرد پانی نے اس کے ہاتھ بے حس کر ڈالے تھے۔ اب بازوؤں میں بھی سنسنی دوڑنے لگی۔ حتیٰ کہ آرام کرنے سے بھی اسے سکون نہ پہنچا۔ مائیکل کو محسوس ہونے لگا کہ اب اس کی جسمانی توانائی آخری دموں پر ہے۔ حقیقتاً وہ محض روحانی طاقت کے ذریعے ہی تیر رہا تھا۔ آخر اسے تیرتے ہوئے 18 گھنٹے بیت چکے تھے۔

اگلے 2 گھنٹوں میں مزید دو کشتیاں اس کی طرف توجہ دیے بغیر گزر گئیں۔ کسی کو خبر نہ ہوئی کہ کچھ ہی دور زندگی سے بھرپور ایک شخص موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ جب مائیکل کو تیسری کشتی نظر آئی تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے جیب سے کریڈٹ کارڈ نکالا اور سورج کی شعاعوں میں اسے چمکانے لگا۔ مدعا یہی تھا کہ شاید کشتی میں بیٹھا کوئی انسان کارڈ سے منعکس ہونے والی متحرک چمک دیکھے اور اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مگر کشتی اس کی طرف آنے کے بجائے پرے ہٹتی گئی۔ مائیکل پھر رب سے مدد کا طلب گار ہوا: ''اے خدا! کسی کو میری جانب متوجہ کر دے، شاید پھر مجھے بچاؤ کا کوئی موقع نہ مل سکے۔ پلیز، پلیز!

ڈین پیٹرسن اپنی بیگم ڈیانا کے ساتھ نیویارک میں طویل عرصے سے مقیم تھا۔ چند دن قبل کینیڈا سے ان کے ہاں مہمان آئے۔ آج صبح وہ انھیں جھیل ہوروون کی سیر کرانے لے آئے۔ ایک بڑی کشتی کرائے پہ لی اور جھیل کی سیر سے لطف اٹھانے لگے۔

بیگم ڈیانا کو اچانک کوئی چیز چمکتی نظر آئی جو بار بار لشکارے مار رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ اس نے کشتی کے ڈرائیور سے کہا کہ ذرا اس چمکتی شے کے پاس تو چلو۔ جب نزدیک پہنچے تو کشتی کے بھی مسافر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پانی میں ایک آدمی تیر

رہا تھا۔ ڈین پیٹرسن نے پکار کر اسے کہا "اے بھائی! تم تو ساحل سے بہت دور آ نکلے۔"

صبح ساڑھے دس بجے جولیا ٹریپ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اٹھایا اور خوفزدہ آواز میں بولی:

"ہیلو!"

"کیا تمھارے شوہر کا نام مائیکل ہے؟" یہ کشتی میں سوار ڈیانا تھی جو تیزی سے ساحل کی طرف رواں دواں تھی۔

"ہم نے اسے بھیل ہور دون میں پالیا ہے۔" تبھی عقب سے ڈین بولا "ڈیانا! اسے بتاؤ کہ وہ زندہ ہے۔"

مائیکل جلد ہی نزدیکی ہسپتال پہنچ گیا۔ وہ شدید تھکن اور یخ بستگی (ہائپو تھرمیا) کا شکار تھا۔ اگر مزید کچھ دیر ہو جاتی تو اس کا ڈوبنا یقینی تھا۔ اس شام مائیکل جب بستر پہ دراز اپنی خوش بختی پر ناز کر رہا تھا تو جولیا بچوں کے ساتھ آ پہنچی۔ بچے روتے ہوئے باپ سے ملے۔ تب وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ملاپ کا یہ منظر بڑا جذباتی اور متاثر کن تھا۔

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ جو انسان 15 سے 21 درجے سینٹی گریڈ درجہ حرارت رکھنے والے پانی میں رہے، وہ دو تا سات گھنٹے میں تھکن کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ لیکن مائیکل 18 گھنٹے تک تمام مشکلات برداشت کرتا رہا اور زندہ رہا۔ اگرچہ اس دوران وہ اپنا 3 کلو وزن کھو بیٹھا۔ نیز اس کے عضلات سے تقریباً ساری پروٹین خارج ہو گئی۔ لہٰذا اسے تین ماہ تک علاج کروانا پڑا تاکہ بدن میں پروٹین کی سطح معمول پر آ جائے۔

پانی کی قید سے رہا کروانے والوں نے جب مائیکل کو کشتی پر سوار کیا تو اسے اوڑھنے کے لیے ایک دبیز کمبل دیا۔ نیز ایک کیلا بھی جو اسے دنیا کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ و ارفع معلوم ہوا۔ وہ کہتا ہے: "اس ایک کیلے نے مجھ میں نئی توانائی بھر دی اور کمبل میں سمٹ کر مجھے بہت آرام و سکون ملا۔"

وہ مزید کہتا ہے: "انسان کی زندگی میں انتہائی قیمتی لمحے کم ہی آتے ہیں اور وہ ایسے ہی لمحے تھے۔ لہٰذا میں نے ان سے بھرپور انداز میں لطف اٹھایا۔ میں نے موت سے زبردست مقابلہ کیا، حوصلہ نہ ہارا اور آخر اسے شکست دینے میں کامیاب رہا۔"

■■■

یوگوسلاویہ کے علاقے البانیہ میں پیش آنے والے ایک دکھ بھرے واقعے کی داستان جو بیسیوں زبانوں میں ترجمہ ہو کر دلوں میں گھر کر چکی۔ ایک مسلمان سپہ سالار نے اپنی حسین بیوی کو ایک عجیب سی دلیل بنا کر اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

حسن آغا، زنیچا

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

1198ء کی بات ہے اس وقت ہمارا بھی دنیا کے ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ قسطنطنیہ سے سلطان روم تین براعظموں پر حکومت کر رہا تھا اور یوگوسلاویہ اس سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ تھا۔ اس وقت مغل بادشاہ بھی دارالسلطنت دہلی سے ہمالیہ تلے کے سارے براعظم ہند کو جنت نشان بنائے ہوئے تھا۔ اس وقت جب کہ اگرچہ ہم ہسپانیہ اندلس کے آشیانے سے بستر لپیٹ چکے تھے، لیکن افریقی مراکش سے ملایا تک ہم ہی خلافۃ فی الارض کے اسمادار تھے۔ اس زمانے میں یوگوسلاویہ کی اسلامی سرزمین کے علاقہ البانیہ کے قلعہ ایموتسکی (Imotsaki) کے قریب ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس میں کوئی ندرت نہ تھی۔ وہی بیسیوں گھروں میں اس سے پہلے بھی پیش آئی ہو گی اور اس کے بعد بھی یقینی ساس بہو کے جلاپے میں ایک مسلمان سپہ سالار حسن آغا اپنی حسین اور نیک بیوی فاطمہ کو اس لیے طلاق دے دیتا ہے کہ اس کے زخمی ہونے کی خبر ملنے کے باوجود بیوی اس کی عیادت کو نہ آئی۔ ماں کی ممتا سے پوچھنا چاہیے کہ اپنے پانچ بچوں سے، جن سے ایک ابھی شیر خوار ہی تھا، جدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

عدت گزرنے کے بعد اولیا اور رشتہ دار اس کا ایک مقامی قاضی سے نکاح کرا دیتے ہیں۔ نئے شوہر کے ہاں جاتے وقت راستہ ایسا تھا کہ پرانے شوہر کے مکان پر سے گزرنا تھا۔ اس نے برقع پہن لیا کہ نہ وہ اپنے بچوں کو دیکھ سکے اور نہ بچے اسے دیکھ سکیں۔ لیکن جب وہ گھر آیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ بچوں کو محبت سے لپٹایا، پیار کیا، تحفے تحائف بھی دیے۔ بچے بھی محبت سے اس سے لپٹ گئے۔ اس پر باپ نے بچوں کو پکارا "یہاں آؤ، اس ظالم سنگ دل ماں کی باتوں میں نہ آؤ۔" یہ حقارت آمیز جملہ سن کر فاطمہ پر کیا گزرتی ہے۔ یہ نظم اس کا اظہار ہے۔

اس افسوس ناک کردار نگاری میں نہ معلوم کیا بات تھی۔ بیسیوں زبانوں میں پچاسوں اہل قلم نے اسے ترجمہ کر کے منتقل کیا۔ اصل یوگوسلاوی شاعر تو معلوم نہیں لیکن ان مترجموں میں جرمنی کے گوئٹے، انگلستان کے اسکاٹ اور براؤننگ، فرانس کے میریمے اور روس کے پشکن جیسے معروف نام بھی آتے ہیں۔ اس نظم کے

ترجمے اطالوی، جرمن، فرانسیسی، ہنگروی، لاطینی، انگریزی، چیکوسلواکی، پولینڈی، روسی، سویڈنی، سلوویتی، اسپینی، یوکرینی، اسپرانتو، رومانوی، عبرانی، ولندیزی، البانی، مقدونی، ڈنمارکی کی ہی میں نہیں، عربی، فارسی، ترکی، ملاوی میں بھی ہو چکے ہیں۔ متعدد زبانوں میں تو کئی کئی ترجمے ہوئے لیکن اردو میں نہ ہونا شرم کا باعث تھا۔ دیر آید درست آید تو ٹھیک نہ ہو گا لیکن کبھی نہ آنے سے دیر سے آنا بہرحال بہتر سمجھا جائے گا۔ مجھے نہ شاعری سے لگاؤ، نہ ادبیات سے دلچسپی۔ اصل پر دسترس نہ ہونے سے سات آٹھ زبانوں کے ترجمے سامنے رکھ کر اردو میں منتقل کرتا ہوں کہ فرض کفایہ تھا۔ اسے کوئی بھائی نظم کا جامہ پہنانے کا وقت پائیں تو ہمارے دور افتادہ یوگوسلاوی بھائیوں کی ہمت افزائی ہو گی جو موجودہ مشکل زمانے میں اپنی ثقافتی شخصیت اور مذہبی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک مرحوم یوگوسلاوی رفیق پروفیسر محمد طیب اوکچ نے بتایا کہ ترکی لفظی ترجمہ اصل سے سب سے زیادہ مطابق ہے۔ میں نے اس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا ہے۔

اس زبان زد نظم کا ترجمہ

1۔ سبز پوش پہاڑوں میں یہ سفید سفید کیا چمک رہا ہے؟
برف کے تودے ہیں یا کلنگوں کے جھرمٹ؟
2۔ برف کو تو پگھل چکنا چاہیے
کلنگ کو تو اڑ کر جا چکنا چاہیے۔
3۔ یہ ہیں نہ برف کے تودے نہ کلنگ
بلکہ ہیں خیمہ ہائے آغا حسن
4۔ وہ ہے زخموں سے چور چور
ماں اور بہن آئی ہیں عیادت کے لیے از دور
5۔ بیوی سخت دردمند
آنے سے مگر آتی ہے اسے شرم
6۔ جب زخم اس کا کچھ بھر گیا
تو اس نے باوفا بیوی کو یہ کہلوایا
7۔ خبردار اب سفید بنگلے میں میرا انتظار نہ کرنا،
نہ میرے بنگلے میں، نہ رشتہ داروں کے ہاں
8۔ بیوی سنتی ہے یہ سخت پیام
ششدر رہ جاتی ہے، دل ہوتا ہے پاش پاش
9۔ شوہر کے محل کے اطراف گھوڑوں کی ٹاپ سنتی ہے۔
تو اس محل کے ایک برج پر چڑھتی ہے
10۔ ایک کھڑکی سے کود کر خودکشی کرنا چاہتی ہے۔
اس کی وہ ننھی لڑکیاں گھبرا کر اس کے پیچھے دوڑتی ہیں۔
11۔ اماں، اماں بھاگ نہیں۔
یہ گھوڑے ابا کے نہیں، ملنے آئے ہیں ماموں جان
پنتوروچ (Pintorovic)
12۔ یہ سن کر بیگم حسن پلٹ پڑتی ہے۔
اور آگے بھائی سے لپٹ جاتی ہے۔
13۔ بھائی جان! دیکھو یہ شرمناک بات
پانچ بچوں کی ماں کو ملتی ہے طلاق
14۔ بھائی کچھ نہیں بولتا، چپ ہو جاتا ہے
ریشمی استر والے جیب میں سے طلاق نامہ نکالتا ہے۔
15۔ اس میں صبر لے کر ماں کے گھر جانے کا حکم تھا۔
اس کو پڑھ کر وہ لڑکوں کی پیشانی اور لڑکیوں کے رخسار چومتی ہے۔
16۔ مگر گہوارے میں کے شیرخوار سے جدا ہونا ممکن نہ تھا۔
سخت گیر بھائی اسے اس سے بھی چھڑاتا ہے۔
17۔ جبراً گھسیٹ کر اسے ایک گھوڑے پر سوار کرتا ہے۔
آبائی مسکن میں لاتا ہے
آبائی گھر آئے چند ہی دن گزرے ہوں گے
بلکہ ابھی ایک ہفتہ گزرا ہو گا
نسبی بھی ہے، حسب و نسب بھی
ہر طرف سے ایک ہو منگنی
سب سے زیادہ اصرار ہے ایموتسکی کے قاضی کو
پر وہ پُر درد آواز سے کہتی ہے اپنے بھائی کو
پیارے آغا بھائی مجھے کسی اور سے بیاہ نہ دو۔
میرے بچوں کے خیال سے میرا دل پاش پاش نہ کرو۔
بھائی کچھ نہیں سنتا۔
ایموتسکی کے قاضی سے کرا دیا جاتا ہے نکاح
وہ مگر بھائی سے التجا کرتی ہے
ایک پرچے پر کچھ لکھتی ہے
اسے ایموتسکی کے قاضی کو بھجوانا چاہتی ہے
تمہاری منگیتر ادب سے سلام کرتی ہے
اور دل و جان سے یہ التماس کرتی ہے۔
کہ سرداروں کے ہمراہ رخصتی کے لیے یہاں آنے کے وقت
ایک برقع لاؤ کہ حسن آغا کے محل کے سامنے سے گزرتے وقت
اپنے بچوں کو نہ دیکھ پاؤں
اس خط کے ملتے ہی قاضی صاحب سرداروں کو جمع کرتے ہیں۔
دلہن کو رخصت کرا لینے جاتے وقت اس کے لیے برقع بھی لے جاتے ہیں۔
نوشہ کے ساتھ دلہن کے ہاں پہنچتے ہیں
عزت و احترام سے اسے لاتے ہیں
حسن آغا کے گھر کے سامنے سے گزرتے وقت
اس کی دونوں لڑکیاں کھڑکی سے ماں کو دیکھ کر پہچان جاتی ہیں۔
30۔ دو لڑکے بھی باہر آتے ہیں
اور ماں سے مخاطب ہوتے ہیں
31۔ پیاری اماں ہمارے ہاں آؤ
اور کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ
32۔ اس کو دیکھ کر وہ نوشہ کے ہمراہیوں میں سے
جو سب سے سامنے تھا اس سے کہتی ہے
33۔ اے نوشہ کے ساتھیوں کے سردار
اے برادر دین و ملت
34۔ گھوڑوں کو اس محل کے سامنے ذرا ٹھہراؤ
اپنے یتیم بچوں کو کچھ تحفے دینا چاہتی ہوں
35۔ گھوڑے محل کے سامنے ٹھہر جاتے ہیں
وہ اپنے بچوں کو قیمتی ہدیے دیتی ہے
36۔ لڑکوں کو زرکار ٹوپیاں
لڑکیوں کو چوغے
37۔ گہوارے کے شیرخوار
کو ایک لپٹے میں بھیجتی ہے کپڑے
38۔ سنگدل حسن آغا دور سے یہ سب دیکھتا ہے
باہر نکلے ہوئے بیٹوں کو پکارتا ہے
39۔ یہاں آؤ میرے یتیم بچو
تمہاری سنگ دل ماں کو نہ آیا رحم تم پر
40۔ جوں ہی فاطمہ یہ جملے سنتی ہے
چیخ مار کر زمین پر گر پڑتی ہے
41۔ جیسے بچے واپس جاتے ہیں
ماں کی بھی روح پرواز کر جاتی ہے۔

(انتخاب: مظہر سلیم مجوکہ)

جاپانی گڑیا

ایک جاپانی گڑیا کا قصہ، اس کے دل میں سوال بہت تھے

نوید اسلام صدیقی

یہ نومبر 2012ء کی بات ہے ہم اہل خانہ فیملی کے ایک بزرگ کا استقبال کرنے لاہور ائیر پورٹ پہنچے ہمارے یہ بزرگ حج کرکے واپس تشریف لا رہے تھے۔ انکوائری والوں نے بتایا تھا کہ جہاز دو گھنٹے لیٹ ہے ہم اسی حساب سے گھر سے روانہ ہوئے، جب ائیر پورٹ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مزید ایک دو گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔ ہماری طرح اور بھی کئی خاندان وہاں آئے ہوئے تھے۔ سیکڑوں لوگ تھے خوب انجوائے کر رہے تھے۔ ہم نے بھی بچوں کو کھلی چھٹی دے دی اور خود دور جا کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

بینچ پر دو آدمی پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب متواتر میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے جب اُن کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگے میں نے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے، آپ بتائیں آپ کہاں کہاں رہے ہیں شاید اس طرح مجھے یاد آجائے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایلیٹ کالج سے ایم کام کیا تھا۔ میں نے پوچھا کون سے سال میں؟ انھوں نے بتایا 1970ء میں۔ میں نے کہا میں نے بھی اسی سال میں کیا تھا۔ انھوں نے اپنا نام ارشد بتایا۔ میں نے کہا چالیس سال میں انسان کی شکل بدل جاتی ہے اس لیے مجھے تو کچھ یاد نہیں آرہا۔ انھوں نے کہا آپ کی شکل تو بالکل نہیں بدلی اسی لیے میں نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی شناسا چہرہ ہے۔ ارشد صاحب کے ساتھ جو نوجوان تھا اُس کا تعارف انھوں نے کرایا اور بتایا کہ یہ میرا بھانجا معظم ہے۔ یہ آٹو انجینئر ہے۔ سال قبل اس کی کمپنی نے اس کو ٹریننگ کے لیے جاپان بھیجا تھا۔ چند دن قبل یہ وہاں سے ایک ماہ کی چھٹی آیا ہے، میرے والدین حج کرکے واپس

آ رہے ہیں اس سلسلے میں ہم یہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ ارشد صاحب اور میں ماضی کی یادیں تازہ کرتے رہے۔ پھر معظم سے جاپان کے بارے میں بات چیت شروع ہوگئی۔ اس نے بتایا سال قبل جب میں جاپان پہنچا تو کوئی ہم زبان، ہم مذہب نظر نہیں آرہا تھا، بہت بوریت محسوس ہورہی تھی۔ چند دن بعد اتفاق سے وقفے کے دوران کینٹین میں کھانا کھاتے ہوئے دوسری ٹیبل سے اردو میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ایک سانولا سا نوجوان اور ایک جاپانی لڑکی اس میز پر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ میں اپنی ٹیبل سے اٹھ کر ان کے پاس گیا اور السلام علیکم کہا۔ لڑکا اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور وعلیکم السلام کہا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے بتایا کہ میرا نام عبدالستار ہے میرا انڈیا سے تعلق ہے، اور اس لڑکی کا نام بڑا عجیب سا ہے۔ اس نے خود ہی بتایا تھا کہ لیکن ایک مسلمان فیملی نے اسے جاپانی گڑیا کا نام دیا تو میں نے بھی اسے جاپانی گڑیا کہنا شروع کردیا۔ شام ہونے والی تھی، فیصلہ ہوا کہ شام کو چھٹی کے بعد دوبارہ ملیں گے۔

شام کو جاپانی گڑیا ہم دونوں کو ایک ہوٹل میں لے گئی۔ گڑیا نے بتایا کہ وہ کاریں اور ٹرک بنانے والی کمپنی میں کمپیوٹر کے شعبے میں کام کرتی ہے۔ اس نے بتایا اسے اسکالرشپ ملا تھا وہ سافٹ ویئر انجینئرنگ کا کورس کرنے کے لیے انڈیا میں چار سال رہی، وہیں اس نے اردو سیکھی ہے۔ گڑیا نے بتایا کہ دنیا میں سافٹ ویئر انجینئرنگ پڑھانے کی سب سے بڑی یونیورسٹی امریکہ میں ہے، وہاں انڈیا کی اس یونیورسٹی کی نگرانی کرتی ہے۔ اس لیے یونیورسٹی کا معیار تعلیم بھی بہت اعلیٰ ہے اسی لیے اب زیادہ تر جاپانی طالب علم انڈیا جاتے ہیں۔

اس نے بتایا کہ میں انڈیا جاتے ہی اپنے کلاس فیلو ہندو لڑکے لڑکیوں کے درمیان گھر گئی تھی۔ انھوں نے مجھے کئی مندر دکھائے لیکن نجانے کیا بات تھی کہ کسی بھی مندر کے اندر قدم رکھتے ہی میرا دم گھٹنے لگ جاتا اور ایک دہشت سی ہونے لگتی۔ ایک جمعہ کے دن میں اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ شہر میں دوپہر کے وقت پھر رہی تھی، چلتے چلتے ایک جگہ میں نے دیکھا کہ بہت سے مرد و خواتین ایک سادہ سی عمارت کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے ہیں، عمارت کے اوپر ایک بلند مینار نظر آرہا تھا۔ میں نے ہندو دوستوں سے کہا کہ آؤ اس عمارت کو اندر سے چل کر دیکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک بولا ''او احمق لڑکی! یہ کوئی عام عمارت نہیں ہے یہ تو مسلمانوں کی مسجد ہے۔ اس کے اندر جو قدم رکھتا ہے اس پر یہ لوگ جادو کر دیتے ہیں وہ پھر تمام عمر کے لیے ان کا ہی ہو جاتا ہے، آدمی کو پھر اپنے تن من دھن کی ہوش نہیں رہتی، وہ پھر ساری عمر مسجدوں کے چکر ہی کاٹتا رہتا ہے۔ پانچ وقت روزانہ بندہ خود ہی مسجد کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ خبردار! ادھر جانے کی غلطی کبھی نہ کرنا'' باری باری سب نے مجھے خوب ڈرایا۔ میں اُن کی باتیں سن سن کر بہت حیران ہوتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ عمارت میں گھستے ہی آدمی پر کوئی جادو کردے۔ اسی وقت میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں اس عمارت کے اندر ضرور جاؤں گی، اکیلی جاؤں گی اور دیکھوں گی کہ کیسے کوئی مائی کا لال میرے اوپر جادو کرتا ہے۔

میں دوستوں کو رخصت کرکے، جب ہوسٹل اپنے کمرے میں پہنچی تو رات گئے تک کمپیوٹر پر بیٹھی اس جادو گھر کے بارے میں انٹرنیٹ پر معلومات تلاش کرتی

رہی۔ مجھے اسلام کے بارے میں کافی باتیں معلوم ہوئیں، دنیا کے بہت سارے ملکوں کی خوبصورت مساجد اندر باہر سے دیکھیں، خانہ کعبہ کے روح پرور مناظر دیکھے، اور کئی کئی بار دیکھے۔ بہت کچھ دیکھا لیکن جادو والی بات کی سمجھ نہیں آئی۔

دو تین ہفتے اسی طرح انٹرنیٹ پر اسلام اور مساجد کو دیکھتے دیکھتے گزرے لیکن یہ جادو والا معمہ پھر بھی حل نہیں ہوا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس جادو کا اس مسجد میں جا کر ہی پتا کیا جائے۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ میں نماز جمعہ سے قبل ہی اکیلی اس مسجد میں جا پہنچی۔ میں پہلی دفعہ جب یہاں سے گزری تھی تو اس دن میں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ زیادہ تر لڑکیوں نے کالی چادریں اوڑھی ہوئی تھیں، میرے دل میں خیال آیا کہ شاید اس کالی چادر کا بھی جادو سے کوئی تعلق ہو، بہر حال میں نے بھی بازار سے ایک کالی چادر خرید کر اوڑھ لی۔ جب میں مسجد کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو وہاں ایک بابا جی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اشارہ کیا کہ ادھر سے جاؤ۔ میں اس طرف چل پڑی، سامنے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر چلی گئی۔ اوپر کی منزل خواتین کے لیے مخصوص تھی۔ وہاں ایک لڑکی کھڑی ہوئی نظر آئی، اس نے بتایا کہ وضو کرنے کی جگہ اس جانب ہے، میرے ساتھ ساتھ آؤ۔ میں اس کے ساتھ ادھر چلی گئی۔ جیسے وہ وضو کر رہی تھی میں بھی کرتی رہی۔ پھر اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور نماز پڑھنے کی جگہ پر لے گئی۔ میں نے اس کے ساتھ ساتھ نماز (سنتیں) اسی طرح پڑھی جیسے وہ پڑھ رہی تھی۔ پھر ہم نے امام کی تقریر سنی، پھر باجماعت نماز جمعہ ادا کی، نماز پڑھنے سے مجھے ایک عجیب قسم کا قلبی سکون ملا، میں وہاں بہت دیر سر جھکائے بیٹھی رہی، میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرا مادی وجود ختم ہو چکا ہے اور کوئی غیبی طاقت مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے، مجھ پر ایک عجیب قسم کی غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ کافی دیر ہو گئی ہے اب مجھے چلنا چاہیے پھر دل میں خیال آیا کہ چلتے چلتے ایک سجدہ کر لوں، میں سجدے میں چلی گئی، جلد ہی میں نے اپنے آپ کو خانہ کعبہ کے سامنے صحن میں پایا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ بے حساب مرد و زن، کالے گورے، عربی عجمی، لمبے چھوٹے، دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک عالم وارفتگی میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔ لاکھوں انسان میری طرح خانہ کعبہ کے چاروں طرف گول دائروں کی صورت میں سجدے میں گرے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑی حیرانی سی ہو رہی تھی۔ خانہ کعبہ کے گرد صفوں پر صفیں بنتی جا رہی تھیں، لوگ جوق در جوق مشرق، مغرب، شمال جنوب ہر سمت سے چلے آ رہے تھے وہ لاکھوں تھے، پھر وہ بڑھتے بڑھتے کروڑوں ہو گئے، آخر وہ ایک ارب سے بھی زائد ہو گئے۔ حد نظر تک انسانوں کا ایک سمندر تھا، میں بہت فخر محسوس کر رہی تھی کہ میں بھی اتنے بڑے سمندر کا ایک قطرہ ہوں۔ اب اس بات پر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ میں سجدے میں بھی تھی اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک کہیں سے بہت اونچی آواز آئی، اللہ اکبر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا زمین و آسمان سب ہی بآواز بلند کہہ رہے تھے اللہ اکبر، سب لوگ سجدے سے اٹھے اور میں بھی اٹھ کر بیٹھ گئی، اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں تو انڈیا میں ایک مسجد میں ہوں۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کتنی دیر اس طرح

گزر گئی ہے۔ میں نے مسجد میں ادھر ادھر دیکھا تو عورتوں کے اس حصے میں گنتی کی صرف چند خواتین ہی موجود تھیں، باقی نماز پڑھ کر جا چکی تھیں۔ جب میں واپس جانے کے لیے اٹھی تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی پچھلی صف میں بیٹھی ہوئی ہے جس نے مجھے وضو کرنا سکھایا تھا۔ کہنے لگی ”میں تمہاری نماز ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ تم کہو گی یہ کیسی میری مسلمان بہن تھی جو نماز پڑھ کر چپکے سے بھاگ گئی ہے“۔ ہم مسجد سے باہر نکل آئے۔ اس نے مجھ پر سوالات کی بارش کر دی، وہ ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی جا رہی تھی۔ تمہارا کیا نام ہے؟ تم کہاں سے آئی ہو؟ تم کہاں رہتی ہو؟ کیا تم کو اردو زبان آتی ہے؟

اس کے تمام سوالات کے میں نے جواب دیے۔ وہ کہنے لگی میرا گھر قریب ہی ہے، میں تم کو اپنے گھر چلنے کی دعوت دیتی ہوں۔ میں اس کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل پڑی جو مسجد سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ آج تک مجھے میری کسی کلاس فیلو ہندو لڑکی نے اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ راستے میں چلتے چلتے اس نے بتایا اس کا نام جمیلہ ہے۔ اس کے والد کا دو سال قبل انتقال ہو چکا ہے، وہ اپنی والدہ اور دو بہنوں کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ اور اس کی بڑی بہن ملازمت کرتے ہیں، اور چھوٹی بہن کالج میں پڑھ رہی ہے۔

ہم جب جمیلہ کے گھر میں داخل ہوئے تو جمیلہ نے پکار کر کہا: ”امی، باجی، منی، سارے جلدی آؤ، دیکھو میں اپنے سے بھی بڑی ایک بہت ہی پیاری جاپانی گڑیا پکڑ کر لائی ہوں جو اردو میں باتیں بھی کر سکتی ہے۔“ اندر سے اس لڑکی کی دو بہنیں اور والدہ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر ہمارے پاس آ گئیں۔ وہ سب باری باری مجھ سے گلے ملیں، ان کی والدہ نے گلے ملنے کے بعد مجھے پیار کیا اور کہا کہ بیٹا جیتی رہو، سدا خوش رہو، خدا تمہارے چہرے کا نور ہمیشہ قائم و دائم رکھے، نظر بد سے بچائے، آج سے تم بھی میری بیٹی ہو اور یہ گھر تمہارا گھر ہے، جب چاہو آؤ، جتنا مرضی چاہے یہاں رہو۔ پھر وہ محترمہ اپنی بچی سے مخاطب ہوئیں کہ آج تم نے مسجد میں بہت دیر لگا دی، میں تو پریشان ہو رہی تھی۔ لڑکی نے کہا ”اماں! کیا بتاؤں آج تک میں نے اپنی زندگی میں اتنا طویل سجدہ کبھی نہیں دیکھا جتنا جاپانی گڑیا کا دیکھا ہے۔“ اس کی ماں نے کہا ”سبحان اللہ“ اور پھر میرے ساتھ چمٹ گئی۔ کہنے لگی ”کہاں ہم گناہ گار اور کہاں یہ“ اور میں دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

جمیلہ نے میرا پورا تعارف کرایا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں بتایا کہ یہ مسلمان نہیں ہے لیکن اس کا دل مسلمانوں جیسا ہے۔ آج اس نے اپنی زندگی کی پہلی نماز میرے ساتھ مسجد میں پڑھی ہے۔

قسم خدا کی مجھ پر واقعی جادو ہو چکا تھا، جادو بھی عام قسم کا نہیں بلکہ ایسا ظالم قسم کا کہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہ معلوم نہیں مسجد میں ہوا یا جمیلہ کے گھر میں آ کر ہوا، یا دونوں نے مل کر کیا۔ میں حیران تھی، ایک پردیسی لڑکی، جان نہ پہچان، لیکن یہ پیار یہ محبت یہ خلوص اور وہ بھی صرف اس لیے کہ میں نے مسلمانوں کی مسجد میں ایک نماز ادا کی تھی۔ ایسا بے لوث خلوص اور پیار تو میں نے ساری زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔ میرے دل میں بار بار خیال آتا تھا کہ کتنا سیدھا سادا مکر و فریب سے پاک مذہب ہے جس کے عبادت خانوں کے دروازے ہر ایک کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھلے ہوئے ہیں، جس

کو ماننے والوں کے دل کتنے بڑے ہیں کہ اپنے گھر کے دروازے کھول کر آنے کی کھلی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ بات بھی میں نے محسوس کی کہ مسلمانوں کی زندگی کھلی کتاب کی مانند ہے، ان کی عبادت گاہیں کھلی، روشن، ہوادار ہیں۔ اسی طرح ان کے گھر فراخ اور سادہ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے دل بھی اسی طرح فراخ اور سادہ ہیں۔

میں انڈیا میں چار سال رہی، اس دوران میں نے اردو سیکھی، عربی سیکھی، قرآن پڑھنا سیکھا۔ لیکن میں مسلمان نہ ہوسکی وجہ یہ تھی کہ میں جمیلہ اور سب اہل خانہ سے بار بار پوچھتی تھی کیا یہ مذہب ایک تصوراتی (ideal) مذہب ہے یا یہ ایک ایسا مذہب ہے کہ جس کی تعلیمات پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں جن کے شب و روز قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق گزرتے ہیں۔ وہ کون سا معاشرہ ہے جو اسلام کے اصولوں پر قائم ہے۔ وہ کون سا ملک ہے جہاں یہ نظام عملی صورت میں نافذ ہے۔ انڈیا میں جس عام آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے عالم دین سے میں نے پوچھا، اس نے کہا کہ چھوڑیں ان بے مقصد باتوں کو، آپ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں، بس کلمہ پڑھیں اور مسلمان ہوجائیں۔ کوئی کہتا ایسی باتیں انسان کے دل میں شیطان ڈالتا ہے، آپ شیطان کی باتوں میں بالکل نہ آئیں۔ میں ہمیشہ یہی کہتی کہ ایک تصوراتی مذہب کو میں کیسے اختیار کرسکتی ہوں۔ اس طرح تو ہر وقت میرے دل و دماغ میں کشمکش ہوتی رہے گی، میں پاگل ہوجاؤں گی۔ قول و فعل کا تضاد کتنے دن چلے گا، میری روح یہ برداشت نہ کرپائے گی۔ میں مجبور ہوں میری تعلیم و تربیت ہی کچھ ایسی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے ماں باپ اور اساتذہ سے یہی سیکھا ہے کہ جس کے قول و فعل میں تضاد ہو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں اور میں چار سال انڈیا میں گزار کر واپس جاپان آچکی ہوں۔

یہ مسلمان لڑکا عبدالستار انڈیا کا رہنے والا ہے۔ میں اس سے اسلام کو ڈسکس کرتی رہتی ہوں لیکن اس بیچارے کو اسلام کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے۔ کل میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی آواز خود سنتا ہے، پھر اس نے ہر انسان کے کندھوں پر یہ دو فرشتے کیوں بٹھائے ہوئے ہیں جو آدمی کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نوٹ کررہے ہیں۔ یہ مجھے کہہ رہا تھا کہ اس طرح کی باتیں کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ اسلام تو دنیا کا واحد مذہب ہے جو بار بار انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ غور و فکر کرے۔ ہر بات کو سوچے، مجھے اس کے بارے میں دوسروں سے تبادلہ خیال کرے۔ پھر وہ جاپانی گڑیا عبدالستار سے مخاطب ہوئی اور اس سے کہا "آپ خود ہی ان کو بتاؤ کہ تم نے مجھے کیا جواب دیا تھا۔" عبدالستار بولا "میں نے اسے کہا تھا، غور و فکر کرنا اپنے بس کی بات نہیں ہے، ہم تو بس نام کے مسلمان ہیں۔ ہم نے تو نہ کبھی قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھا ہے نہ حدیث کی کوئی کتاب دیکھی ہے، اللہ معاف کرے، نماز روزے کی پابندی بھی ہم سے نہیں ہوتی، لیکن ہمیں یقین ہے" رؤف و رحیم اپنے محبوب ﷺ کے صدقے ہمیں جنت میں داخل کردے گا۔ ہمارے بزرگ تو یہی پڑھتے پڑھتے اگلے جہان سدھار گئے:

خوار ہیں بدکار ہیں، ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں کچھ بھی ہیں، لیکن تیرے محبوب ﷺ کی امت میں ہیں

میں نے محترمہ سے یہ بھی کہا ہے کہ آپ

ضرور ریسرچ کرتی رہیں، اللہ نے چاہا تو ہم بھی آپ کی ریسرچ سے فائدہ اٹھالیں گے۔"

جاپانی گڑیا نے عبدالستار کو مخاطب کرکے کہا کہ "آپ نے تو مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے بچپن میں ایک مولوی صاحب سے قرآن کے صرف چند پارے پڑھے تھے، پھر آگے نہ پڑھ سکا۔ اب تو کئی سال ہوگئے میں نے قرآن پاک کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھا۔"

عبدالستار نے سر ہلا کر بتایا کہ یہ بات درست ہے۔

جاپانی گڑیا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ آج دوپہر آپ سے جدا ہونے کے بعد کینٹین سے نکل کر جب ہم اپنے شعبے کی طرف جارہے تھے تو عبدالستار مسکراتے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم اگر آج کے اس دور میں اسلام کی اصل شکل دیکھنا چاہتی ہو تو اسلامی جمہوریہ پاکستان چلی جاؤ، یہ ملک بنا ہی اسلام کے نام پر تھا۔ اور اگر تم نے مسلمان دیکھنے ہیں تو افغانستان چلی جاؤ، وہاں تم جہاد میں بھی حصہ لے سکتی ہو۔ میں نے سوچا ہے کہ میں پاکستان جا کر اسلامی معاشرہ دیکھوں گی، وہ تو یقیناً دنیا میں جنت ہوگی اور پھر افغانستان جا کر جہاد میں حصہ لوں گی۔ کہتے ہیں وہ مسلمان انتہائی خوش قسمت ہوتا ہے جس کو شہادت کی موت نصیب ہو کتنا مزہ آئے گا اس طرح سیدھی جنت میں پہنچ جاؤں گی۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ مل گئے ہیں، آج کے بعد میں آپ سے رہنمائی حاصل کیا کروں گی۔

اچانک شور مچا کہ مسافر باہر آنا شروع ہوگئے ہیں اور ہم بینچ سے اٹھ کر استقبال کرنے والوں میں جا شامل ہوئے۔ شور شرابے میں ارشد اور معظم کا فون نمبر لینے تک کی ہوش نہ رہی۔ بہت ساری پوچھنے والی باتیں دل میں ہی رہ گئیں۔

■■■

کراچی سے لندن ایک گھنٹے میں

ایک ماہ قبل بحیرہ قطب شمالی میں واقع امریکا کے ایک خفیہ فوجی اڈے سے عجیب و غریب طیارہ فضا میں بلند ہوا۔ یہ دیکھنے میں طیارہ لگتا تھا۔ مگر اس میں جدید ترین راکٹ نصب تھا۔ طیارہ جیسے ہی زمین سے 218 میل (350 کلومیٹر) اوپر پہنچا تو واپس نیچے آنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے 8 ماخ (Mach) یعنی تقریباً 9800 کلومیٹر (6100 میل) فی گھنٹہ کی رفتار پکڑلی۔

یہ طیارہ دراصل ایک بہت بڑے منصوبے ہائی فائر یعنی ہائپر سونک انٹرنیشنل فلائٹ ریسرچ ایکسپیریمینٹیشن (Experimmation) پروگرام سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ منصوبہ امریکا، برطانیہ اور آسٹریلیا مل کر انجام دے رہے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ ایسا مسافر بردار طیارہ تخلیق کیا جائے جو ہائپر سونک (یعنی 5 ماخ) کی رفتار سے اڑسکے۔ گویا یہ آواز کی رفتار سے پانچ گنا زیادہ رفتار ہوئی۔

کچھ عرصہ پہلے اس (Hifire) ہائی فائر طیارے کا پانچواں تجربہ ہوا۔ یہ امر خفیہ ہے کہ تجربے کو کامیابی ملی یا ناکامی! ماہرین کا کہنا ہے کہ جونہی یہ طیارہ ایجاد ہوا، انسان لندن سے نیویارک صرف ایک گھنٹے میں پہنچ سکے گا۔ دونوں شہروں کے درمیان فاصلہ تقریباً 5587 کلومیٹر بنتا ہے اور روایتی ہوائی جہاز اسے طے کرنے میں آٹھ دس گھنٹے لگا دیتا ہے۔

کراچی سے لندن کا فاصلہ (بذریعہ ہوائی جہاز) 6320 کلومیٹر ہے۔ گویا ہائی فائر طیارہ سے سفر شروع ہوا تو برطانیہ میں مقیم پاکستانی صرف ایک گھنٹے میں پاکستان پہنچ سکیں گے۔

(فوزیہ چوہان۔ لاہور)

باتیں نئی
تحریریں نئی

آپ بھی اپنی عمدہ سوچ، اچھے مشاہدے اور گہرے مطالعے کی حامل تحریر کے ساتھ "باتیں نئی تحریریں نئی" کا حصہ بن سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

پیلی کار

محمد قاسم رضا

اپنی ہم جولی سے دور ہونے والی ایک کار کا ماجرا
اس سے جڑی یادیں دل کی سڑک پر رواں تھیں

علی بابا کمرے میں آ رہا تھا، وہ ہر بار ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھوٹی سی کار گھماتے ہوئے مجھے دکھاتا۔ میں اپنی سوچوں میں گم چہرہ ہاتھوں پر ٹکائے، اسے دیکھ کر صرف مسکرا دیتا۔ تقریباً پندرہ سال بعد میں اپنے خالو کے گھر گیا تھا۔ علی بہت خوش تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش تھا یا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے۔

باقی لوگوں کے چہروں پر خوشی کم اور ہچکچاہٹ زیادہ دکھائی دیتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں ابھی کسی اجنبی ملک کے ائیرپورٹ پر اترا ہوں اور لوگ مجھے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں ان میں سے کوئی اپنا ڈھونڈ رہا ہوں، جو مجھے پہچان کر میرا بازو پکڑے اور ہجوم چیرتا ہوا مجھے ساتھ لے کر کسی پُرسکون جگہ پہنچ جائے۔

لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ جیسے میں سب تبدیلیاں دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وہ سب مجھے پرکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پریشانی کم کرنے کے لیے میں نے گھر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دو کمروں کے بجائے اب پانچ کمرے تھے۔ ایک وسیع ہال اور ہر طرف قالین چمکتی دیواریں، کھلا لان۔ غرض کہ خالو کی محنت رنگ لائی تھی جو گھر میں جا بجا نظر آ رہی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ بچپن کی یادیں میرے ذہن میں فلم کی طرح چل رہی تھیں۔ اب علی اندر آیا تو کار میری طرف پھینک کر بھاگ گیا۔ میں نے پتا نہیں کیوں گرتی ہوئی کار پکڑی اور اسے پکڑ کر کرسی کے بازو پر چلانے لگا، جیسے ہی وہ کار چلی میرے اندر یادوں کی ہوا آندھی بن کر چلنے لگی۔ کچھ لہریں میرے اندر ابھرنے لگیں تو مجھے کار سے وابستہ بچپن کی کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔ جن سے میری ذہنی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔

اس وقت میں اور شاہ، علی کی طرح چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ ہم پلاسٹک کی گیند کے ساتھ گھر کے صحن میں کھیل رہے تھے کہ خالہ نے ہمیں پانچ روپے دیے اور بازار سے سبز دھنیا اور ٹماٹر لینے کے لیے بھیج دیا۔ ہم بڑی خوشی سے اچھلتے کودتے، بھاگتے دوڑتے گھر سے نکلے، گندا نالہ پار کیا اور بازار میں سبزی کی ایک دکان سے دھنیا اور ٹماٹر خرید لیے۔ سامنے ہی ایک دکان کے شیشے میں پڑے ہوئے کچھ کھلونے ہمیں نظر آئے اور ہم دونوں دکان کے اندر چلے گئے۔ میں نے پیلے رنگ کی ننھی سی کار پسند کی اور شاہ نے سرخ، واپسی پہ ہم نالے کی دیوار پہ کاریں چلانے لگے۔ وہاں کار ریس کے تین چار چکر ہی لگے تھے کہ خالہ بڑے غصے سے ہمارے سر پہ کھڑی نظر آئیں۔ وہ ہمیں گھر لے آئیں۔ اگلے پندرہ بیس دن ہم کاریں ہی بھگاتے رہے، کبھی میری پیلی کار آگے نکل جاتی اور کبھی شاہ کی سرخ گاڑی۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں کہ امی ہمیں واپس لے آئیں، ہم روتے ہوئے ان کے گھر سے واپس آئے۔

امی نے کہا! بیٹا پھر آ جائیں گے پھر بھی تو چھٹیاں ہوتی ہی ہیں۔ میں اپنی پیلی کار ساتھ لے آیا اور گھر آ کر سارا دن اسے سرف سے دھوتا رہا۔ شام کو ٹی وی والی میز کی سب سے نچلی دراز کے پیچھے میں نے کار اس لیے سنبھال کے رکھ دی کہ اگلی بار پھر جائیں گے تو کار بھی ساتھ ہوگی اور پھر کھیلیں گے۔ لیکن اگلی بار ماں نے کہہ دیا کہ اب ہم کبھی بھی وہاں نہیں جائیں گے۔ ابا کا خالو سے کوئی اختلاف ہوا اور یوں ہمارا ان کے ہاں آنا جانا ختم ہو گیا۔

دو سال کار یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں محفوظ ہوتی رہی، پھر مجھے یقین ہو گیا کہ اب واقعی ہم کبھی خالہ کے ہاں نہیں جائیں گے۔ اب میں نے اپنی وہ ننھی سی پیلی کار نکالی اور گاؤں کی کچی گلیوں میں دوڑانے لگا۔ گاؤں میں کار بھگانے کا یہ بڑا فائدہ ہوتا تھا کہ میری کار اکیلی ہوتی اور یوں شاہ کی کار آگے نہ نکلتی، میں بڑا خوش ہوتا۔ ایک دن یہ اتنی آگے نکل گئی کہ پھر کبھی مل ہی نہ سکی، تب میں کار کے لیے بڑی دیر روتا رہا۔

مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس وقت کار گم نہیں ہوئی تھی بلکہ میں خود زندگی کی راہوں میں گم ہو گیا ہوں۔ ہمارے بچپن میں کاریں آگے پیچھے دور دور نکل جاتی تھیں لیکن آج ہم ایک دوسرے سے بہت دور نکل چکے تھے کہ واپسی ممکن نہ تھی۔ میں انھیں سوچوں میں گم تھا کہ شاہ، آہستہ سے آئی اور جاتے کپ میز پہ چائے رکھ کر واپس چلی گئی۔ میں نے ٹھنڈی چائے میں بسکٹ ڈبوتے ہوئے علی کی محبت بھری آنکھیں دیکھیں، جو کسی نئی شرارت کے بجائے کسی نئی بات کا پتا دے رہی تھیں۔ اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما کر میری طرف پھینکا، پورے صفحے پہ چند الفاظ بڑی خوبصورتی سے لکھے ہوئے تھے۔ ''کیا آپ نے بھی وہ پیلی کار ابھی تک سنبھالی ہوئی ہے؟''

■■■

زہرخند مسکراہٹ

ایک صلح جو اور نرم خُو کا ماجرا اس کے ذہن میں شیطانی مکڑی نے جالا بنا لیا تھا

محمد ذوالقرنین خان، کوئٹہ

کبھی کبھار کہنے اور سننے میں چھوٹا سا مسئلہ جب کسی شخص کو پیش آ جائے تو اس کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ سوچ کا پہیہ صرف اسی مسئلے کے گرد گھومنے لگتا ہے۔ عبدالرشید بھی ان دنوں اسی طرح کے ایک مسئلے سے نبرد آزما تھا۔ اس کی پریشانی کی وجہ پانی کی قلت تھی۔ وہ چڑچڑے پن کا شکار ہو گیا تھا۔ سارا وقت وہ بیوی بچوں پر غصہ کرتا کہ پانی کا استعمال کم کریں حالانکہ وہ پہلے سے ہی بہت کفایت شعار تھے۔ وہ مقامی ڈاکخانے کا ایک کلرک تھا۔ صبح کا گیا وہ کہیں چار بجے شام کو گھر میں داخل ہوتا۔ سارا دن بل جمع کر کے اور لائسنسوں پر ٹھپے اور ٹکٹ لگا لگا کر جب وہ گھر پہنچتا تو آرام کرنے کے بجائے بالٹیوں میں پانی ڈھونڈنے لگتا۔

اسے مسجد سے پانی لے جاتا دیکھ کر محلے والے ناک بھوں چڑھاتے مگر کسی کو یہ پوچھنے کی توفیق نہ ہوئی کہ پانی تو روز آتا ہے۔ کسی کو پانی کی کمی کا سامنا نہیں پھر یہی کیوں اس مصیبت کا شکار ہے؟ گھروں کے آگے پودوں کے لیے، گلی میں، ایستادہ درختوں کے لیے، دھول مٹی بٹھانے کے لیے پانی موجود ہے، اگر نہیں ہے تو ایک انسان کے لیے نہیں۔ کسی نے سوچنے کی زحمت نہیں کی اور کرتے بھی کیوں، ان کے نزدیک یہ اس کا اپنا مسئلہ تھا۔

پانی روز آتا تھا مگر عبدالرشید کا گھر گلی کے کونے میں واقع تھا۔ جس کی وجہ سے وہ پائپ میں سے صرف اس کے غرانے کی آواز ہی سن پاتا اور اس کے دیدار سے محروم ہی رہتا۔ تمام گلی والوں کی تیز موٹریں پانی اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اچک لیتیں۔ اس کے پاس بھی ایک موٹر تھی جو سیاست والوں کی طرح چنگھاڑتی، دھاڑتی تو بہت مگر کام کے کا بھی نہ رہتی۔ اس کا تو خیال تھا اس نے وہ موٹر صرف ہمسایوں کو مطلع کرنے کے لیے رکھی ہوئی تھی موٹر چلا پانی آ گیا ہے بھر لو۔ صبح سویرے وہ سب سے پہلے اٹھ جاتا۔ پانی کے لیے جیسے ہی موٹر چلاتا سارے محلے کو خبر ہو جاتی اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ جب اس کی موٹر پانی نہ کھینچ پاتی۔

وہ صلح جو، نرم طبیعت کا مالک تھا۔ منمناتے ہوئے اس نے محلے والوں کے سامنے اس سلسلے میں کچھ احتجاج بھی کیا مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ جس کسی سے اپنا مسئلہ بیان کرتا وہ ہنکارا بھر کر گفتگو کا رخ دہشت گردی، فرقہ واریت، کرپشن جیسے مسائل کی طرف موڑ دیتا۔

اس دن وہ دفتر سے تھکا ہارا گھر پہنچا۔ بیوی نے اس کی توقع کے عین مطابق اسے بتایا کہ پانی ختم ہو گیا ہے۔ وہ جو بھوک سے ادھ موا ہو چلا تھا، اس نے کھانا کھانے پر پانی لانے کو ترجیح دی اور بالٹیاں لے کر نکل کھڑا ہوا۔ کیونکہ بعد میں مسجد میں نمازیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اسے موقع نہیں مل پاتا۔ جیسے ہی وہ مسجد کے وضو خانے سے پانی بھر کر نکلنے لگا ایک شخص آ دھمکا اور اسے اطلاع دی کہ مسجد کمیٹی کے اراکین اسے طلب کر رہے ہیں۔ مسجد کمیٹی کے صدر ایک ریٹائرڈ سیکرٹری تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے مسجد سے خوب تعلق استوار کر لیا تھا۔ انھوں نے عبدالرشید کی خوب گوشمالی کی اور اسے بتایا، مسجد کا پانی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال میں لانا حرام ہے۔ باقی تمام ارکان نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق اسے جھاڑ پلائی۔ اس کی انا نے گوارا نہ کیا کہ وہ محلے والوں کے دروازے کھٹکھٹا کر پانی مانگتا پھرے۔ آدھے میل کی دوری پر ایک ٹیوب ویل تھا، وہ وہاں سے پانی لانے لگا۔

اس نے پانی کا ٹینکر منگوانے کا سوچا مگر اس کی ٹنکی میں بمشکل اس کا چوتھا حصہ ہی سما سکتا تھا۔ ٹینکر والے کا کہنا تھا یہ اس کا قصور نہیں، وہ پیسے پورے ٹینکر کے لے گا۔

اس مسئلے نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین ختم کر دیا۔ محلے والوں سے اسے نفرت سی ہونے لگی جب وہ ان کی بھری ٹنکیوں میں سے پانی باہر گرتے دیکھتا۔ کہیں اور منتقل ہونے کے بارے میں بھی اس نے سوچا، مگر مالی حالات کی وجہ سے وہ کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکا۔

اس رات بھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی حالانکہ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ اس نے اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی پوری کوشش کی مگر اس کے ذہن نے کسی پھرتیلی مکڑی کی مانند اس تیزی سے تانے بانے بنے کہ لمحوں میں وہ خام خیال ایک جامع

منصوبے کی شکل میں آن موجود ہوا۔ اب وہ خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ نجانے کتنے عرصے بعد وہ آج پُرسکون نیند سونے جا رہا تھا۔ حسبِ معمول صبح سویرے پانی آنے سے پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھا تو ایک زہرخند مسکراہٹ اس کے لبوں پر ثبت تھی۔ پانی کی موٹر چلانے سے پہلے اس کے ضمیر نے رسمی سا احتجاج کیا اور خاموش ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک پانی آتا رہا اور اس کی موٹر چلتی رہی۔ اس دن اس نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ خوشگوار موڈ میں بیوی بچوں سے گپ شپ لگا کر انھیں حیران اور خوش کیا اور دفتر چل دیا۔ ڈاکخانے میں بھی اس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔

گھر واپسی پر محلے میں ہلچل دیکھ کر اس کے لبوں پر کھلتی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ شام کو تمام محلے والوں کو میٹنگ میں بلایا گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس کی بیوی نے اسے بتایا، اس کی آواز میں تجسس اور پریشانی کا ملا جلا عنصر تھا۔ مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کیا بات ہے؟ آخر وہ ہی تو اس کا ذمہ دار تھا۔ محلے والوں کی ٹینکیوں میں گندا اور بدبودار گٹر کا پانی گھس گیا تھا۔ پانی فراہم کرنے والا پائپ کہیں سے پھٹ گیا تھا جس کی وجہ سے صاف پانی میں گندا پانی شامل ہو رہا تھا اور یہی میٹنگز کا ایجنڈا تھا۔ پائپ پھٹنے والی بات پر عبدالرشید کا دل چاہا کہ وہ ایک زوردار قہقہہ لگائے۔ ان سب کے اترے چہرے دیکھ کر اسے تھوڑی دیر کے لیے شرمندگی بھی ہوئی مگر پھر اسے اپنی اذیت یاد آ گئی جس سے وہ روزانہ گزرتا تھا۔

گندا پانی اس نے ہی ٹینکیوں میں پہنچایا تھا۔ اس کے لیے اسے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی۔ اپنی موٹر کے ذریعے گٹر سے پانی کھینچ کر اس نے پانی کے پائپ میں پہنچا دیا اور محلے والوں کی تیز رفتار موٹروں نے اسے ٹنکیوں میں منتقل کر دیا۔ اگلی صبح سب کی پانی کی موٹریں خاموش تھیں۔ محلے والے اپنے حلقے کے ایم۔این۔اے، ایم۔پی۔اے کے پیچھے پھر رہے تھے مگر کہیں کوئی شنوائی نہ ہونے پر وہاں سے قریب ایک مرکزی شاہراہ کو بند کر کے وہاں دھرنے کا اہتمام کیا گیا تب کہیں جا کر سوئی ہوئی انتظامیہ جاگی۔ وعدوں قسموں سے محلے والوں کو یقین دلایا گیا۔ ان کا مسئلہ جلد حل کیا جائے گا۔ ایک مہینے بعد کھدائی کا کام شروع ہوا جو پندرہ دن چلتا رہا۔ اس کے بعد مزید ایک مہینہ پائپوں کی خشک میں لگا۔ اس دوران محلے والوں نے پانی ٹینکر کے ذریعے منگوانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ عبدالرشید محض دو سو میں اپنی ٹنکی بھروا لیتا اور 10.15 دن عیش کرتا۔ ڈھائی، تین مہینے بعد محلے والوں نے یہ خبر سن کر سکھ کا سانس لیا کہ کل سے پانی کی فراہمی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ریٹائرڈ سیکرٹری صاحب اور ان جیسے اثر و رسوخ رکھنے والے صاحبان نے تو موقع کا فائدہ اٹھا کر دو دو کنکشن حاصل کر لیے تھے۔

صبح جب عبدالرشید اٹھا تو پائپ میں سے آنے والے پانی کی غراہٹوں کا سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔ محلے والوں کی موٹریں پوری رفتار سے چل رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر وہی زہرخند مسکراہٹ نمودار ہوئی جو ایک دفعہ پہلے بھی ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کی موٹر بھی چل پڑی۔

■ ■ ■

باتیں نئی تحریریں نئی

دو بوڑھی آنکھیں

ناجیہ ملک ۔ چناری آزاد کشمیر

ایک جھریوں بھرے ہاتھ کا تذکرہ اسے کتابوں بھرا سکول بیگ بہت عزیز تھا

یہ 2007ء کے اوائل اپریل کے دن تھے۔ مارچ میں ہونے والی بارشیں قیامت ڈھا کر ختم چکی تھیں۔ سورج کی نرم رو کرنیں آہستہ آہستہ پھیل رہی تھیں۔ وادی نے سبز پوشاک پہن لی تھی۔ سورج کی سنہری کرنوں سے درخت نہا رہے تھے۔ ہر طرف کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ زندگی کے رنگوں سے عاری تھا۔

ان بارشوں نے کشمیر کے ایک حصے میں قیامت ڈھا دی تھی۔ آسمانی بجلی گرنے سے مکین اپنے مکانوں سمیت لقمۂ اجل بن گئے۔

فضا میں سوگواری رچی بسی تھی اور پرندوں کے گیت بھی درد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مایوسیوں کی تاریک آندھی چاروں طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔

احتیاط سے قدم اٹھاتی میں پہاڑی سے نیچے اتر رہی تھی۔ ہر طرف پتھر ہی پتھر تھے یا پھر ملبہ ہی ملبہ۔ لینڈ سلائیڈنگ نے اس علاقے میں بھی تباہی مچا دی تھی۔ اس لینڈ سلائیڈنگ میں راستہ اپنے نشان تک کھو چکا تھا۔ ایک ارضیاتی سروے نے اس علاقے کو بھی ریڈ زون پر واقع قرار دیا تھا۔ اس لیے اس زمین پر قدم جما کر چلنا دوبھر تھا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکنا شروع ہو جاتی یا پھر پاؤں زمین کے اندر دھنسنا شروع ہو جاتے اور دل خوف سے تیز تیز دھڑکنا شروع کر دیتا۔ 18 اکتوبر 2005 کے زلزلے نے تباہی کے بہت سے دروازے کھول کر امید کی شمع گل کر دی تھی۔ بچپن کی یادوں کو ان بھاری پتھروں نے نگل لیا۔ اب احساسات میں وہ چاشنی نہیں رہی تھی اور ہاتھوں میں زندگی سے بے یقینی کے کچھ مرجھائے پھول تھے۔

پہاڑی سے اتر کر میں سٹاپ پر پہنچی۔ منٹوں کا راستہ گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ تھکن اور خوف نے کپکپی طاری کر دی تھی۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا، دل خوف سے لرز اٹھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پہاڑوں کا دریا بہتے بہتے رک گیا ہو۔

سلائیڈنگ کا سلسلہ جہاں ختم ہوتا وہیں سے آبادی شروع

ہو جاتی۔ سڑک پر پہنچنے کیلئے اس سلائیڈ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

بارشوں کا سلسلہ ختم ہو کر جیسے ہی دھوپ نکلی تو سڑک کا بند راستہ کھول کر زندگی کے کچھ آثار پیدا کیے جانے لگے۔

چونکہ آج راستہ کھلا تھا تو چند لمحوں کے انتظار کے بعد گاڑی بھی مل گئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں باہر کے مناظر میں کھو گئی۔ اتنی ٹوٹ پھوٹ کے باوجود کشمیر کی اس وادی کا حسن ماند ضرور پڑا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ دریائے جہلم کی شوریدہ لہریں خوف میں اضافے کا باعث بن رہی تھیں۔ گاڑی جھٹکے کھاتی تو زندگی ہاتھ سے سرکتی ہوئی محسوس ہوتی۔

نجانے کون سا موڑ موت کا موڑ ثابت ہو گا، لیکن آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اس خیال نے شانت کر دیا کہ زندگی موت کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے نہایت سکون سے گاڑی کی سیٹ کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ اس وقت گاڑی ایک خطرناک موڑ سے گزر رہی تھی۔ تمام افراد دم سادھے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے بائیں جانب بیٹھی بوڑھی عورت کے چہرے پر بکھرے خوف کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور نظریں ہٹا لیں۔ آگے پھنکارتا ہوا دریائے جہلم تھا، بے اختیار میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ معاً اپنے ہاتھوں پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، میں چونک کر مڑی۔

ایک جھریوں بھرا ہاتھ بڑے پیار سے میرے ہاتھوں میں پکڑی کتابوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا، دکھ بھری آنکھوں سے نکلنے والے آنسو جھریوں سے راستہ بناتے نیچے گر رہے تھے۔ آنکھوں کو دوپٹے سے رگڑتے ہوئے اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری گود میں رکھی کتابوں کو حسرت سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر دکھوں کی ایک گہری تہہ بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ پڑھتی ہو بیٹا۔۔۔؟

جی...... ! مختصر جواب دیتے ہوئے حسرت و یاس کی تصویر بنے اس چہرے پر نظریں جمائے میں اپنے سارے لفظ نجانے کہاں کھو چکی تھی۔

بہت سے سوالوں نے لبوں پر آتے آتے ہی دم توڑ دیا۔ زخم کو کریدنے کا خیال مجھے خود ہی زخم خوردہ کر گیا اور میرے سارے لفظ وہیں دب گئے۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

پھر وہ خود ہی گویا ہوئی ”میں اس علاقے کی رہنے والی ہوں جہاں آسمانی بجلی گری ہے۔ میری نواسیاں میرے ساتھ رہتی تھیں...... وہ بھی پانی میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے ددھیال اپنے ماں باپ کی قبر پر گئی تھیں...... پھر واپس نہیں آئیں...... میرا بیٹا ان کے لیے کتابیں لایا تھا...... اپنے سکول بیگ وہ میرے پاس چھوڑ کر گئی تھیں...... وہ بیگ آج بھی میرے پاس رکھے ہیں......

بیٹا! میں اُن کتابوں کا کیا کروں؟ کرب میں ڈوبے اس سوال نے میری زبان گنگ کر دی۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایک آنسو خاموشی سے میری آنکھ سے نکلا اور گود میں رکھی کتابوں پر جا گرا۔ دل میں ڈھیروں درد لیے میں گاڑی سے اترنے لگی، میرا اسٹاپ آ گیا تھا...... اور اس نے کہیں آگے جانا تھا۔ گاڑی سے قدم نیچے رکھتے سے لمحہ بھر پہلے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا...... آنکھوں میں کرب کا جہاں بسائے وہ بوڑھی آنکھیں مسلسل میری کتابوں کو دیکھ رہی تھی۔

دوہرا قتل

ایک دھواں دھوں چھوڑے والی لڑکی کا ماجرا اس کے وجود میں بہت کرچیاں جمع ہو گئی تھیں۔

توقیر عائشہ۔ کراچی

مجھے اس علاقے میں رہائش اختیار کیے ہوئے چند دن ہوئے تھے۔ یہاں آ کر دونوں بیٹوں کے لیے اسکول وین لگوانا پڑی۔ بیٹی کو قریبی اسکول میں داخل کیا۔ ان سب چکروں میں پھنس کر ابھی پاس پڑوس سے مل بھی نہ سکی تھی۔ سب کو اسکول اور آفس بھیجنے کے بعد میں صمد کو تیار کرتی اور خود اسکول چھوڑنے جاتی۔ جب میں نکل رہی ہوتی تو ایک لمبی سی خاتون ہاتھ میں کچھ کتابیں لیے نقاب دار چادر کے حصار میں مجھ سے کچھ آگے جا رہی ہوتی۔ دل چاہتا کہ ان سے کچھ بات کروں، لیکن اسکول کے وقت میں اتنی گنجائش نہ رہ پاتی اور یوں بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ایک دن شاید انھیں کچھ دیر ہو گئی تھی اور مجھے علم نہ تھا کہ وہ میرے پیچھے آ رہی ہیں۔ میں صمد سے باتیں کرتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی:

”السلام علیکم! کیا آپ شازی ہیں؟“ میں انھیں جی ہاں کہہ کر حیرت سے دیکھنے لگی۔ قدرے گرم جوشی سے انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ”تم بدل تو گئی ہو لیکن میں نے تمھیں آواز سے پہچان لیا۔“ میرے ذہن پر اس کی آواز سے شبیہ بن رہی تھی۔ وہ کالج گروپ کی شوخ ترین لڑکی عارفہ کی تھی لیکن یہ مستور سراپا اس شبیہ کو اتھل پتھل کر رہا تھا۔

”تم مجھے نہیں پہچان سکو گی۔ میں عارفہ ہوں، عارفہ اسمٰعیل۔“ ارے واہ کیسے ملاقات ہو گئی۔ تم کہاں جا رہی ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ دونوں نے ایک دوسرے پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ پتا چلا میرے گھر سے چار گھر پہلے والا گھر عارفہ کا ہے جہاں وہ بڑے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔ والدین اب نہ

رہے تھے اور قریب ہی واقع ایک مدرسے میں تجوید کے ساتھ قرآن سیکھنے جا رہی تھی۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہم نے دوپہر کو ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

بچوں کو اسکول سے آنے کے بعد کھانے سے فراغت ہوئی ہی تھی کہ میرا بیٹا آ گیا۔ ''امی! کوئی آنٹی ہیں؟'' ''ارے کوئی نہیں ہم تو تمھاری خالہ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عارفہ نے اس کے ہاتھ میں بسکٹوں کا بڑا سا پیکٹ تھما دیا۔ چونکہ ہم سڑک پر گلے نہیں مل سکی تھیں اس لیے اب خوب گلے ملیں۔ بچے بھی ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے کہ آج امی بھی ہماری طرح شور مچا رہی ہیں۔

وہ ویسے ہی سلم اسمارٹ تھی اور میں...... تین بچوں کی ماں جس کی گردن اور پیٹ فربہ، چہرہ گول ہو چکا تھا اور آنکھیں شوہر اور بچوں کے سرہانے پر طمانیت سے مسرور تھیں۔ ''میری داستان'' میں تو کوئی نیا پن نہیں۔ فائنل ایئر میں شادی، گھر داری اور بچوں اور میاں کی خدمت جیسا معزز کام، بس یہی ہیں ہمارے صبح و شام'' میں نے ہنستے ہوئے کہا، ''تم اپنی سناؤ؟ شادی کیوں نہیں کی اور اتنی سنجیدگی کیسے؟ دل ٹوٹنے کا چکر ہے کیا اور یہ چادر وادر یہ سب کیا ہے بھئی؟''

عارفہ بولی: ''تم کو پتا ہے کہ مجھے نئے نئے کام کرنے کا شوق ہے۔ تم لوگ تو گریجوایشن کے بعد جدائی کا داغ دے گئیں۔ میں نے ایم اے بھی کیا، امی کی ڈانٹیں سن کر سلائی بھی سیکھی، بیوٹیشن کورس بھی کیے......'' ''وہ تو سب ٹھیک ہے شادی کیوں نہیں کی؟'' میں نے ٹوکا۔

''ارے جی! یہ میرے اختیار میں ہے کیا؟ یہ تو آج کل کا حساب ہے کہ بالا ہی بالا سب معاملات طے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ رسماً رشتہ لینے کی کارروائی نمٹا دیتے ہیں۔ ہم تم جس زمانے کے ہیں ... ہی سمجھا جاتا تھا۔'' ''تو پھر کیا تھا؟'' میں جلد ... جاننا چاہتی تھی۔

''محترمہ! میں آپ کی طرح خوبصورت ... ہوں۔ بس یہی مسئلہ تھا۔''

''شروع ہو گئیں نا تمھاری فضول باتیں ... نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

''یہ فضول باتیں نہیں۔ حقیقت ہے۔ کسی ... ماں ایسی لڑکی کو بہو نہیں بناتی جس کے حسن ... کے در و دیوار منور نہ ہو سکیں۔ چاندنی ... سکے......'' اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا رہا تھا...... انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کتنی خوبصورت ... اس سے غرض نہیں کہ آپ کو گھر داری بھی آتی ... نہیں۔ خاندان میں شامل ہونے کی صلاحیت ... نہیں......''

''تو تمھارے لیے کوئی رشتے تو آتے ہوں گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں! اگر رشتہ آنا اس کو کہتے ہیں کہ لڑکے کی ماں، بہن، بھابھی دیکھنے آئیں، وہ تو بہت آئیں لیکن جب ان کو سیاہ شفون کا دوپٹا اوڑھے ... سے ہالے کی جگہ طاق سا منہ ملا جس نے گھونسلے کی طرح چشمہ بھی پہنا ہو تو وہ پلٹ کر نہ آئیں۔''

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ''اپنا ایسا نقشہ تو نہ کھینچو۔ مجھے تو تمھاری شکل میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔''

''مجھے پتا ہے تمھارا کوئی بھائی نہیں۔ اگر ہوتا تو تم کو میری ناک موٹی لگتی، آنکھیں بھینگی، قد کی لمبائی نیزے کی مانند اور ہاتھ ایسے جیسے چھپکلی نے چھت کو پکڑ رکھا ہو۔''

مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ کچھ دیر کی خاموشی ... میں نے موضوع بدلتے ہوئے موجودہ ... کے بعد ... مصروفیات پوچھیں۔ بات کو پیچھے سے جوڑتے ہوئے ... ''دنیا والوں کے ہاتھوں اپنی اس تذلیل ... بہت دن تک ذہنی دباؤ کا شکار رہی۔ میرے ... میرا اچھا گھر، گھر والوں کی ضروریات کو ... پورا کرنا، بزرگ پھوپھی کی خدمت ان ساری ... میرے خوش شکل نہ ہونے کے باعث پانی ... پڑھانا میرا بھی شوق نہیں رہا۔ اگر بت نئے ... کے اسٹائل بناؤں، جدید ملبوسات زیب تن ... اور اردو انگریزی کا کیچر بول کر سامنے والے ... مرعوب کروں تو شاید کسی کو پسند آ جاؤں مگر یہ خود ... تذلیل مجھ سے تو نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں ... ف ہوں۔''

''بس وقت گزر رہا تھا۔ میری بھتیجی کو ایک مولوی صاحب پڑھانے آتے ہیں میں نے سوچا کہ میں بھی ... قرآن کا تلفظ درست کر لوں تو انھوں نے مجھے اس ... کا بتایا۔ میں یہاں جاتی ہوں، پڑھی لکھی ... خواتین کے لیے قرآن بامعنی پڑھنے کی کلاس بھی ہوتی ... یہاں سے میں نے اپنے دین کی روح کو، ... اور ان کی حکمتوں کو سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ... باپردہ بھی نظر آ رہی ہوں۔''

... محلے میں آ کر تو مجھے بھی اپنے بچوں کے لیے ... کی ضرورت تھی سو میں نے بھی اس کے مدرسے ... کا پروگرام بنا لیا۔

دوسرے دن میں مدرسے کی منتظمہ رضیہ خاتون ... سے ملی۔ وہ جوان العمر خاتون تھیں۔ عارفہ کی بہت ... تعریف کرنے لگیں کہ اس میں دین کو سمجھنے کی بہت فکر اور جستجو ہے۔ عارفہ یہاں ایک سال سے آتی تھی اور دونوں کی خوب دوستی بھی تھی۔ میں نے بچے کے پڑھنے کے اوقات طے کیے اور اجازت چاہی۔ باقاعدگی سے تو نہیں لیکن میں بھی کبھی کبھی قرآن کی کلاس میں شرکت کر لیتی تھی۔ ایک دن میں وہاں کچھ دیر میں پہنچی۔ موضوع گفتگو کچھ یوں تھا کہ ''اسلام نے شادی کے لیے کیا معیار دیا ہے اور اس میں لڑکی کو کتنا اختیار دیا ہے؟''

اس سلسلے میں انھوں نے ایک حدیث پڑھ کر سنائی جو یوں تھی:

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ عورت سے چار چیزوں کی بدولت شادی کی جاتی ہے۔ اس کے مال، اس کی خاندانی شرافت، اس کی خوبصورتی اور اس کی دین داری۔ تم دین دار عورت حاصل کرو تمھارا بھلا ہو۔''

شادی شدہ خواتین اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ لیکن لڑکیاں اس موضوع پر بھلا کیا بولتیں سو عارفہ بھی خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھی مگر مجھے پتا تھا کہ وہ اس موضوع پر صرف مجھ سے ہی بات کر سکتی تھی۔

لہٰذا میں نے اس کی دلی نمائندگی کرنے والے سوالات کیے۔ ''آج ہمیں یہ معیار کہاں نظر آتا ہے؟ شادی تو صرف لڑکی کی شکل یا پیسے سے کی جاتی ہے۔''

ایک خاتون بولیں! ''نہ تعلیم دیکھتے ہیں نہ خاندان بس شکل دیکھتے ہیں۔ اسی لیے بعد میں جھگڑے ہوتے ہیں۔'' دوسری بولی! ''آگے ہونے کو تو بے چین رہتی ہیں اور میاں آفس سے آئے تو ایک پیالی چائے بھی وقت پر دینے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔''

"اے بہن! ناشتہ بن بھی جائے تو جب تک اپنی پسند کا مارننگ شو نہ دیکھ لیں، نہ بستر سے اٹھیں گی نہ ناشتے کی میز صاف ہوگی۔"

سب ہی نے اپنے تجربات بیان کرنے شروع کر دیے۔ "نہیں جی! کمسنی بھی ضروری ہے۔ چاہے اپنا لڑکا چالیس سے اوپر ہی ہو، اگلی نسل کے رنگ و روپ کی بھی ابھی سے منصوبہ بندی کر لی جاتی ہے، رنگ تو سفید ہونا لازم ہے۔"

"رہی بات اختیار کی تو اول تو لڑکے خود ہی پسند کر لیتے ہیں ورنہ یہ اختیار تو لڑکے کی ماں یا بہن کے پاس ہوتا ہے جس کو وہ وہاں کر دیں، اسی سے ہو جاتی ہے۔ لڑکی کے پاس کوئی اختیار نہیں۔"

موضوع ایسا تھا کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ رضیہ خاتون نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا کہ جو لوگ اس معیار کو پسند کر لیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کیا ہے تو انھیں اسی معیار کو اپنے بھائی یا بیٹے کی شادی کے وقت مدنظر رکھ کر دنیا کو دکھانا ہوگا۔ آپ خواتین اور تمام وہ لوگ جو دین کو سمجھ چکے ہیں اور دوسروں کو سمجھانے کے نیک کام میں مصروف ہیں ان ہی کو دنیا والوں کے معیارات بدلنے ہیں۔ اگر وہ ہی ایسا نہ کریں تو ہم اس کی توقع ان لاکھوں لوگوں سے نہیں کر سکتے جن سے معاشرہ بھرا پڑا ہے، جو دین کو اپنی زندگی کے معاملات میں ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔

سب خواتین نے خوب سر ہلا ہلا کر تائید کی۔ محفل برخاست ہونے پر میں بھی گھر آ گئی۔ کچھ عرصہ میں وہاں نہ جا سکی۔ ایک دن رضیہ خاتون نے مجھے پیغام بھجوایا کہ میں ان سے ملاقات کروں۔ اتفاق سے میں فارغ بھی تھی، شام کو پہنچ گئی۔ وہ بڑے تپاک سے ملیں۔ بیٹی سے چائے بنانے کو کہا اور مجھ سے ذکر کیا کہ "پہلے ہم دوسرے شہر میں رہتے تھے وہاں میں نے ایک مدرسے سے دینی تعلیم حاصل کی ہے۔ وہاں مدرسے میں بہت سی خواتین سے دوستی تھی۔ ایک خاتون سے میری اچھی دوستی رہی حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔ مگر کچھ مزاج ملتا تھا تو دوستی بھی اچھی رہی۔ اب وہ بھی اسی شہر میں آ گئی ہیں۔ میں ان سے ملنے گئی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ آج کل اپنے بیٹے کے لیے کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں ہیں جو دین کی اچھی سمجھ رکھتی ہو۔ والد کی وفات کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش اور شادیاں کرتے کرتے کافی عمر ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھ سے عارفہ کے بارے میں مشورہ مانگا۔ میں دل میں خوش ہوئی اور لڑکے کی تعلیم اور خاندان وغیرہ کے بارے میں اطمینان کر لیا۔ پھر میں نے عارفہ کی بھابھی سے بھی اس سلسلے کا ذکر کیا۔ اب مجھے عارفہ سے بات کرنی تھی۔

اس نے تو سنتے ہی منع کر دیا کہ میں نے ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دیے ہیں جہاں اتنے دن گزر گئے ہیں تھوڑے اور بھی گزر جائیں گے۔ لیکن میں نے اسے بہت ڈانٹا، مایوس ہونے سے منع کیا۔ "یوں بھائی کے سہارے کب تک بیٹھی رہو گی۔ تم کو تو خود دین کی باتوں کی سمجھ ہے۔ وہ بھی ایسی ہی لڑکی کی تلاش میں ہیں تو تم کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔" بہرکیف ملاقات اگلے ہفتے میرے گھر طے پائی۔ میں خوش تھی کہ ایک اچھا کام میرے ہاتھوں انجام پائے گا۔ عارفہ اس دوران ایک دوبار ملنے بھی آئی۔ اس کی مخصوص سنجیدگی میں ہلکی سی خوشی کی جھلک میری پرخلوص محبت نے دیکھ لی تھی۔

وہ دن بھی آ گیا۔ رضیہ خاتون کے ساتھ ایک عمر رسیدہ باپردہ خاتون تھیں۔ ہم سب نے مصافحہ کیا کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ عارفہ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ خاتون گاہے گاہے ایک نظر اس پر ڈال لیتی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہم سے عارفہ کے اہل خانہ کے متعلق کوئی سوال کریں گی لیکن انھوں نے کچھ نہ پوچھا۔ چائے پی کر رخصت ہو گئیں۔

میں ان کا جواب معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی مگر اتنے بے صبرے پن کا اظہار اچھا نہ لگا اور نہ ہی اس دوران عارفہ میرے گھر آئی۔ لیکن مجھے اس کی کیفیت کا پتا تھا۔ میں بھی ایسے ہی ایک انتظار سے گزر کر شازیہ صدیق سے شازیہ اطہر بنی تھی۔ کسی طرح ایک ہفتہ گزار کر میں رضیہ خاتون کے گھر پہنچ گئی۔ انھوں نے بڑی شرمندگی سے بتایا کہ ان خاتون کو عارفہ پسند نہیں آئی۔ میں حیران ہوئی کہ انھوں نے اس کے خاندان کے بارے میں کچھ پوچھنا نہ جانا تو انھیں کیا چیز پسند نہیں آئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی چاند چہرہ ستارہ آنکھوں کی متلاشی تھیں۔ باقی چیزیں تو ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور افسوس بھی ہوا۔ میں بہت الجھے ہوئے خیالات کے ساتھ واپس آئی اور اپنے بیٹے سے عارفہ کو بلا بھیجا۔ اس کا پُرامید چہرہ دیکھ کر مجھے اپنی ہمتوں کو جمع کرنا پڑا اور بمشکل اسے بتایا کہ وہ وہاں معاملہ طے نہیں ہو سکا۔

یہ سن کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ پھر وہ ہلکے سے مسکرائی مگر اس مسکراہٹ میں شیشے کی کرچیاں چبھی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا گئی، چلو قسمت میں یہاں نہیں ہونا تھا۔ تم گھبراتی کیوں ہو؟ میں نے اسے تسلی دی۔

تو وہ آہستہ آہستہ بولی! "یہ کھیل تو میرے ساتھ بہت دفعہ ہو چکا ہے لیکن اس دفعہ اذیت کئی گنا بڑھ کر ہے۔ کیونکہ یہ کام ان لوگوں نے کیا جو دنیا والوں کو دین کے معیارات بتاتے ہیں۔ پھر اپنے عمل سے بتاتے ہیں کہ وہ معیارات اپنانے کے لیے نہیں صرف بیان کرنے کے لیے ہیں۔"

وہ بولی! "نہیں نہیں! اس میں تمھارا تو کوئی قصور نہیں وہ لڑکی جو دو ہزار سال پہلے زندہ گاڑی جاتی تھی قصور تو اس کا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے جسم قتل ہوتے تھے، زمانہ جدید تو اور بھی سفاک ہے جسم رہنے دیتا ہے اور روح کو قتل کر دیتا ہے۔" آنسوؤں کی نمی نے اس کی آواز کو بھی بھگو دیا تھا۔ پھر وہ ایک عزم سے بولی! "جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا (ترجمہ: تو کس جرم میں ماری گئی؟) وہ اس بے قصور کو نہیں بھولا تو مجھے کیسے بھول جائے گا۔ ہم دونوں کی پوزیشن تو ایک ہی ہے نا! میں بھی بارگاہ رب العزت میں فریاد کروں گی۔" وہ خاموش ہو گئی اور میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ میرے آنسو بھی بس اسی اشارے کے منتظر تھے وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔

میرے سر میں خیالات کی گردش نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ تو دہرے قتل کی واردات ہے۔ ایک اس ہنستی بولتی لڑکی کا قتل اور دوسرے اس معیار کا قتل جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کیا تھا۔ نجانے اس دفعہ میری دوست کو اپنے ڈپریشن سے نکلنے میں کتنا وقت لگے گا؟

کاش! میں نے یہ سلسلہ چھیڑا ہی نہ ہوتا......

■■■

الیکشن بیتیاں

ایک پریذائیڈنگ آفیسر کی داستان
الیکشن اتنی سادگی اور آسانی سے کب مکمل ہو پاتے ہیں

خیر سے موجودہ حکومت کے پانچ سال پورے ہو چکے ہیں اور اسی سال 2013ء میں نئے الیکشن کی آمد آمد ہے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان اور سیاستدان بھرپور طریقے سے آمدِ الیکشن کے استقبال اور حصہ لینے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ادھر یو این ڈی پی الیکشن پراجیکٹ نے مرد و خواتین سے ماسٹر ٹرینر برائے الیکشن 2013ء کے لیے سی وی اکٹھے کر لیے ہیں۔

میں نے محکمہ تعلیم میں طویل ملازمت کے دوران ہمیشہ بطور پریذائیڈنگ آفیسر اور ایک آدھ بار وانستہ اسسٹنٹ پریذائیڈنگ کے فرائض سرانجام دیے۔ یوں کہہ لیں کہ کچھ ایسے حالات تھے کہ ضمیر نے اجازت نہ دی پریذائیڈنگ ہونے کی۔ خیر چھوڑیے اس بات کو، اس مضمون کو تحریر کرنے کے اصل مدعا کی طرف چلتے ہیں۔

تاج کمپنی کراچی کی شائع کردہ ایک کتاب حصن حصین اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 319 پر ایک دعا ہے جس کو احاطہ تحریر میں لانا ضروری خیال کرتی ہوں:

"ترجمہ: اے اللہ جو علم تو نے مجھے دیا ہے، اس سے مجھے نفع بھی پہنچا اور جو مجھے نفع دے اس کا بھی عطا فرما اور مجھے وہ علم نصیب فرما، جس سے تو مجھے نفع پہنچائے۔"

اس دعا پر غور کیجیے۔ آج علم حاصل کرنے کی دعا ... لوگوں

فرحت قادر
سرگودھا

...کرلی۔ مگر اس سے نفع لینے یا پہنچانے کا سوچا تک نہیں۔ ان کے خیال میں شاید اس کا مطلب ملازمت کے عوض ملنے والی تنخواہ ہے یا پھر وہ مہارتیں ان کاموں میں استعمال ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھے لکھے اکثر افراد کے کئی روپ ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم اپنا اور اپنے ملک کا وقار کھو بیٹھے ہیں۔ اپنے ... پس منظر، مذہب اور جذبہ حب الوطنی کو قطعی فراموش کیے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے اسلاف کے کارنامے تک یاد نہیں رہے۔ ہم دورِ اندیشی سے کام نہیں لیتے نہ ہی روزِ آخرت کا خوف ہے۔ وقتی فائدے کی تلاش میں رہتے ہیں ہماری سوچیں اس قدر محدود ہو گئی ہیں کہ گہرائی میں جا کر کسی مثبت فیصلے تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ غلط رائے دہی اور اس کے نتیجے میں ہم پر نازل ہونے والے مصائب ہمارا مقدر بن گئے ہیں۔

قارئین کرام! انتخابی امیدوار ہوں یا رائے دہندگان، میں یقین سے کہہ سکتی ہوں میرا یہ مضمون ان کے لیے الیکشن 2013ء میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کو غور سے پڑھیں اور دورانِ الیکشن ذہن میں رکھیں۔

امیدواروں کی طرف سے اکثر دیکھنے میں آیا کہ وہ پولنگ ایجنٹ کو معاوضے کی ادائی کرتے ہیں، مگر انہی کے بعض پولنگ ایجنٹ ایسے بھی نظر آئے کہ ان کی سیاسی ہمدردیاں کسی اور پارٹی کے ساتھ ہوتی ہیں مگر وہ معاوضے کے لالچ میں کسی اور پارٹی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایسے ایجنٹ مرد و خواتین کو دوسری پارٹی کے لیے ووٹ کاسٹ کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ پولنگ ایجنٹ کے فرائض سرانجام دینے والے کچھ ایسے لوگ بھی دکھائی دیے جو گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ قانونی طور پر ایسے افراد کے خلاف کارروائی ہو سکنے کے باوجود یہ سرعام دندناتے پھرتے ہیں۔ اگر ان کے ڈائریکٹ محکمانہ افسر بھی وہاں بطور پریذائیڈنگ تعینات ہوں تو ان کے ساتھ بھی بدتمیزی کا مظاہرہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

دراصل ان بے چاروں کو خوش فہمی ہوتی ہے کہ اگر یہ امیدوار جیت گیا تو ان کو نچلے گریڈ سے اعلیٰ گریڈ پر ترقی دلوا دے گا۔ مزید برآں گھر سے نکل کر جائے ڈیوٹی تک جانے کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ افسران ان کی ماہانہ تنخواہ نہایت ادب کے ساتھ ان کے گھر بھجوا دیا کریں گے۔ یہ کہ مختلف محکموں کے سربراہان ان کو خاص اہمیت دیں گے۔ ان کی وساطت سے ہی عام آدمی کی سنی جائے گی۔ اس کے عوض یہ عام آدمیوں سے دعوتیں کھائیں گے، مال کمائیں گے۔

اگر ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو کئی سرکاری ملازم اپنی جائے تعیناتی پر حاضری دینے کے بجائے منتخب نمائندوں کے آس پاس نظر آئیں گے۔ بعض افسران حکومتِ وقت سے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لیے ایسے ملازمین کی ذاتی طور پر سرپرستی کرتے ہوئے پائے گئے۔ اکثر ان کی اس محکمانہ غیر حاضری و گستاخ رویے سے تنگ ہوتے ہیں۔ مگر اپنی نوکری بچانے کے لیے ان پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اگر کوئی غلطی سے ان کے خلاف رپورٹ کر بیٹھتا ہے تو کوئی کارروائی نہ ہونے پر الٹا شرمندگی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسے ملازمین اپنے افسران کے لیے بہت مفید بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی اعلیٰ افسر کی ریٹائرمنٹ سے قبل مدت ملازمت میں توسیع، اس

کی اپنی پسندیدہ جگہ پر تعیناتی افسر کے خلاف آنے والی درخواستیں غائب ہونا اور بہت سے ایسے فوائد جن کا ذکر میں یہاں کرنا مناسب نہیں خیال کرتی، اسی ڈیوٹی چور ملازم کے سبب ہوتا ہے۔

ماضی میں کئی ملازمین کے سیاسی تبادلے انھی ملازمین سے ناراضی یا ان پر اعتراض کرنے کی وجہ سے ہوئے۔

انتخابی امیدواروں کے گھروں میں انتخابی مہم شروع ہوتے ہی ختم قرآن و ورد وظائف وغیرہ تو دیکھنے میں آتے ہی تھے مگر گزشتہ انتخابات میں ماہرین روحانیات کی خدمات بھی دیکھنے میں آئیں کہ الیکشن مہم کے دوران ایک مولانا گاڑی میں موجود رہتے اور ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ہر گھر پر دم پڑھنا اور پھونک مارنا ہے تاکہ امیدوار کے لیے ہمدردی اور ووٹ دونوں مل سکیں۔

کچھ پیشہ ور لوگ انتخابی مہم چلانے کی آڑ میں انتخابی امیدوار سے خوب رقمیں بٹورتے ہیں۔ ان کے سو فیصد کامیاب مہم کے بیانات اکثر جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ نتیجہ آنے پر خوب ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض حلقوں میں غنڈہ گردی اور طاقت کے ذریعے مخالف گروپ کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی ہوتی ہے۔

مخالف امیدوار کے خلاف اخلاق سے گری ہوئی تقاریر کا ہمارے ملک میں بہت رواج ہو گیا ہے۔ اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ اور اس کا بھی ضابطہ اخلاق بننا ضروری ہے۔ کچھ بینرز تو مخالفین کی طرف سے اتار لیے جاتے ہیں اور کچھ عادی چور اپنے گھروں میں استعمال کے لیے چوری کر لیتے ہیں۔ یوں امیدواروں کو اچھا خاصا نقصان پہنچتا ہے۔

پولنگ اسٹاف سے ہیرا پھیری، جعلی ووٹ کی کاسٹ، رزلٹ میں رد و بدل کے لیے اس پر ناجائز دباؤ کے واقعات بھی دیکھنے میں آئے۔ بعض اوقات مخالف گروپ پر پرچے کرانے یا انتخاب رکوانے کے لیے بھی پریذائیڈنگ آفیسر پر دباؤ ہوتا ہے۔

سال 2008ء میں UNDP ELECTION PROJECT نے پولنگ اسٹاف برائے الیکشن 2008ء کی ٹریننگ کے لیے ماسٹر ٹرینرز خواتین کو تیار کیا۔ جنھوں نے اپنے اپنے ضلع میں پولنگ اسٹاف کو تربیت دی۔ اتنے صاف شفاف ادارے کی زیر نگرانی فرائض سر انجام دینے والوں نے بھی ہیرا پھیری سے گریز نہیں کیا اور زیر تربیت اسٹاف کو جو کھانا دوران تربیت فراہم کیا گیا وہ انتہائی غیر معیاری تھا۔

تربیتی اسٹاف کو انفرادی طور پر اسٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک سے بذریعہ چیک ادائی کی گئی۔ مگر اس میں بھی اکثر لوگ چیک سے محروم رہے۔ چیک کی تلاش میں ایک صاحب کے بارے میں علم ہوا کہ وہ انچارج ہیں۔ مگر انھوں نے رابطہ کرنے والے کو قانون سے بے بہرہ سمجھتے ہوئے اس کی بات تک نہ سنی۔

اس واقعہ کا ذکر اس لیے ضروری خیال کیا کہ شاید اس کو پڑھنے سے الیکشن 2013ء کے پولنگ اسٹاف سے سابقہ کہانی نہ دہرائی جائے۔

■■■

دنیا میں نہ کہیں ایسے صارف موجود ہیں نا ایسے مصرف، ایسے تاجر ہیں نہ ہی ایسے آجر۔ نہ ایسے بے مثال و لاجواب خریدار کہیں موجود ہیں نہ بیوپاری، نہ ایسی پراڈکٹ کہیں دستیاب ہیں، نہ ایسی پراڈکٹ بنانے والی فیکٹریاں، نہ دھڑا دھڑ بے مصرف اور غیر ضروری اشیا اس ڈر سے خریدنے والے ہیں کہ پتا نہیں کل ملے نہ ملے، نہ ہی اتنا کہیں کسی کاروبار میں منافع جتنا اپنے ہاں، کوئی سی بھی چیز مارکیٹ میں لے آئیں میڈیا کے ذریعے تھوڑی سی تشہیر کرا دیں پھر دیکھیں کہ آپ کا مال کیسے ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے۔ کوالٹی کی فکر ہے نہ مال کے معیاری و غیر معیاری ہونے سے اس قوم کو کوئی فرق پڑتا ہے، کوئی سی بھی چیز کہیں سے بھی مارکیٹ میں آجائے ہاتھوں ہاتھ بکتی ہے اور عموماً لینے کے بعد اس کی کوالٹی چیک کی جاتی ہے گھر لے جانے کے بعد، اور اپنے ہاں کا وطیرہ ہے کہ یار لوگوں نے دکان کے اندر اور کچھ نمایاں کیا ہو یا نہ ہو لیکن "خریدی ہوئی چیز واپس یا تبدیل نہیں ہوگی۔" کی تختی نمایاں جگہ پر لگا رکھی ہوتی ہے۔ ادھر آپ کوئی چیز خرید کر دکان سے باہر نکلے ادھر تو کون میں کون، اور چند لمحے قبل کی وہ مروت بھی بھول جاتے ہیں جس کا مظاہرہ گندی سی پیالی میں گاہک کو پیسے لینے سے قبل دو گھونٹ چائے پلا کر، کر چکے ہوتے ہیں، پیسے دینے کے بعد آپ

سود مافیا کے جنگل میں پھنسے لوگوں کی مدد کو بھی کوئی نہیں آتا

قسطوں سے عذاب بنی زندگی

لاکھ کہیں کہ جناب میں نے قیمت ادا کی ہے پوری تو مال بھی ایک نمبر چاہیے۔ جواب ملتا ہے جناب! ہم نے گھر تو بنایا نہیں اب جیسا ہے اور جیسا بھی ہے مجبوری ہے۔

حالانکہ اللہ کے آخری رسول ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بھی چیز بیچنے سے پہلے اس کے نقائص خریدار کو بتا دو اور اگر خریدنے کے بعد اس کو پسند نہ آئے تو نہ صرف واپس لے لو بلکہ جو بھی تاجر ایسا کرے گا اس کے لیے اللہ کے ہاں اجر و ثواب ہے۔ مگر اپنے ہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ کافروں کے ہاں ایسا نہیں۔ وہ کافر ہیں، مگر خرید و فروخت کے تمام معاملات اسلام کے مطابق ہیں۔ میرے ایک کزن نے چند سال قبل کینیڈا سے ایک اچھے معیار کی جیکٹ لی، وہاں چونکہ سردی تھی اور انھوں نے جرسی کے اوپر ہی پہن کے چیک کی اور ادائی کر دی اور پاکستان آگئے۔ یہاں آکر جب غور سے چیک کیا تو پتا چلا کہ جیکٹ تو کھلی ہے، انھوں نے بل نکال کے کینیڈا اس سٹور پہ فون کیا کہ جیکٹ تبدیل کرنی ہے کوئی حل بتایئے کہ آپ کو بھیجیں یا ایک اچھی خاصی رقم ضائع سمجھیں تو اس انٹرنیشنل چین رکھنے والے اسٹور کے منیجر نے پوچھا کہ آپ پاکستان کے کس علاقے میں ہیں اور آپ کو نزدیکی شہر کون سا پڑتا ہے، لاہور یا کراچی میں سے؟ جواب دیا کہ لاہور، تو جواب ملا کہ جناب پھر کوئی مسئلہ نہیں آپ لاہور ہماری برانچ پہ جائیں اور بل دکھا کے ان سے اپنا کوٹ تبدیل کر لیں جو آپ کو پسند آئے اور جب یہ صاحب وہاں پہنچے تو بلا حیل و حجت صرف دو منٹ کے اندر اندر اپنی پسند کی جیکٹ سلیکٹ کر لی گئی۔ کیا ایسا ممکن ہے اگر یہی چیز ہم نے اپنے ملک سے لی ہوتی اور کچھ عرصے بعد پتا چلتا کہ یہ تو گڑبڑ ہے تو کیا وہ دکاندار واقف ہوتا؟ اور اب اپنے ہاں ایک اور نہایت بڑا اور گھناؤنا رجحان زور پکڑتا جا رہا ہے کہ دوسروں کو دیکھ دیکھ کے نجانے کیوں لوگ عجیب سے کمپلیکس کا شکار ہو کر ایک نئے مافیا کا شکار ہو رہے ہیں، جی اس مافیا کا نام ہے سود یا قسط مافیا۔ اس مافیا کے لوگ سادہ لوح لوگوں کو لبھا کے اور قرض کی نہایت آسان اور خوشنما شکل دکھا کے اپنی پراڈکٹ خریدنے پر آمادہ کرتے ہیں اور غربت اور تنگ دستی سے ستائے لوگ جو قیمتی اشیاء عام طور پر خریدنے کی سکت نہیں رکھتے مگر دوسروں کو دیکھ دیکھ کے اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں، بڑی آسانی سے اس مافیا کا شکار ہو جاتے ہیں، اور ایک دفعہ جو ان کے چنگل میں پھنس جاتا ہے عموماً مرحوم ہونے کے بعد ہی نکل پاتا ہے۔ یہ جو چیز عام مارکیٹ میں پچاس ہزار کی ملتی ہے فقط پہلی قسط بغیر ایڈوانس مہیا کرنے کا جھانسا دے کر 80 ہزار میں ڈیل کر کے اگریمنٹ پر سائن کروا لیتے ہیں۔ اس ڈیل کی شرائط اتنی سخت اور گھناؤنی ہوتی ہیں کہ اگر ساری تفصیلات ایک ایک کر کے گاہک کو سمجھائی جائیں تو شاید کوئی ایک بھی بندہ ان سے ڈیل نہ کرے۔ مگر یہ تمام تفصیلات سودا طے ہو جانے کے بعد سامنے آتی ہیں اور جب تک ان کی سمجھ آتی ہے اس وقت تک چڑیاں کھیت کو چگ کے اڑ چکی ہوتی ہیں۔ نتیجتاً پھندا صارف کے گلے میں فٹ ہو چکا ہوتا ہے اور اسے چالیس ہزار کا فریج 70 ہزار میں گھر لے جانا

پڑتا ہے۔ یہ مافیا اتنا سنگدل اور ظالم ہے کہ پچیس فیصد رقم ایڈوانس وصول کر لیتا ہے مگر سود بقایا رقم کی بجائے پراڈکٹ کی پوری قیمت کا لیتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو چاہیے کہ جتنی رقم ادا کر دی گئی اس کے بجائے بقایا رقم پر سود وصول کیا جائے اگر کرنا ہی ہے تو، مگر انتہائی دھڑلے اور دیدہ دلیری سے پورے ملک میں ظلم و جبر کا سودی کھیل دن کی روشنی میں جاری و ساری ہے مگر مجال ہے کوئی اس کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت کرے۔ کوئی انتظامیہ، کوئی عدلیہ، کوئی ریاست، کوئی صحافت، ان کو نہیں پوچھتی اور پھر قسطوں کی وصولی ایک الگ ظلم کی پوری داستان ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اول تو کنٹریکٹ ہی اتنا سخت اور شکنجہ اتنا کڑا کسا ہوتا ہے صارف کی گردن کے گرد کہ وہ کھانا کھائے یا نہ کھائے بچوں کو سکول بھیجے نہ بھیجے، والدین دوائی کے بغیر مرتے ہیں تو مر جائیں، اسے ہر حالت میں یکم سے پانچ تک قسط پہنچانی ہے ورنہ ایک فون کال کے بعد وہ دو دکاندار جو گارنٹی دیتے ہیں قسط سنٹر کا ہرکارہ ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جب وہاں سے کام نہ چلے تو لیے گئے چیک پر جو اکثر خریدار سے بلینک لیے جاتے ہیں، مرضی کی رقم بھر کے سیدھا بینک پہنچ جاتا ہے اور غریب آدمی جو اکاؤنٹ کھلواتا ہی ان کے کہنے پہ ہے فقط چیک بک کے لیے تا کہ چیک قسط سنٹر والوں کو دے سکے، اس کے اکاؤنٹ میں نہ کچھ ہوتا ہے۔ بینک ڈس آنر کی مہر لگا دیتا ہے اور پھر سیدھا تھانے، اور دفعہ 489 تو بنی ہی اسی نیک مقصد کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے جن میں اب بینک بھی شامل ہو چکے ہیں باقاعدہ غنڈوں اور بدمعاشوں کو معاوضہ دے کر معاملات طے کر رکھے ہوتے ہیں اور کچھ نے تو اپنے بھی پال رکھے ہوتے ہیں جن کا واحد مقصد ان غریبوں کو ڈرانا دھمکانا اور بے عزت کرنا ہے۔ وہ کسی بھی غریب شخص کے گھر دندناتے ہوئے چادر اور چار دیواری کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے گھس جاتے ہیں اور بیوی بچوں کے سامنے گھر کے سربراہ کی تذلیل، بہو بیٹیوں پر غلیظ نظریں ڈالتے اور گالم گلوچ کے ذریعے اپنے صارف کی خدمت جاری رکھتے ہیں اور بعض اوقات آدھی سے زیادہ پیڈ شدہ پراڈکٹ اٹھا کے اپنی کھٹے ڈالے والی بھدی سی سوزوکی وین میں بھی ڈال لیتے ہیں۔ نہ کوئی پوچھنے والا ہے ان کو نہ کوئی قانون ہی ان کے خلاف حرکت میں آتا ہے۔ یہ ایسا روگ ہے جس سے مرنے کے بعد بھی جان نہیں چھوٹتی۔ لینے والا اگر اس دنیا میں نہ رہے تو وہ دو دکاندار جو گارنٹر ہوتے ہیں، بال بچوں کی جان کو آ جاتے ہیں اور ہر صورت میں قرض مع سود وصول کرتے ہیں۔ لیکن اس سب ظلم و بربریت میں سارا قصور ان کا بھی نہیں، اس میں کچھ قصور ان کا بھی ہے جو اپنی چادر دیکھے بنا پاؤں پھیلا لیتے ہیں اور اسلام کے قناعت پسندی کے سنہرے اصول کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی لاکھ روشن خیال ہو جائے اور کتنا ہی ماڈرن کیوں نہ ہو جائے نجات صرف اور صرف اسلامی اصولوں، طریقوں اور تعلیمات پہ عمل پیرا ہو کے ہی ممکن ہے۔

علم کی شمع

ایک محبت سمیٹنے والے پوتے کی داستان اسے اپنے دادا کی لفظی تبدیلی دعاؤں کی طرح لگتی تھی

آصفہ ضیاء احمد

پروفیسر علی احمد کا نام علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ اندرون و بیرون ملک ان کے مداحوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ باذوق قارئین ان کی تخلیقات اپنی لائبریری کی زینت بنانا باعث فخر سمجھتے۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے اتنی خوبصورتی اور چابک دستی سے لکھا کہ اس سے ایک زمانہ فیض یاب ہو رہا تھا۔ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ان کی نگارشات کسی انمول خزانے سے کم نہیں تھیں۔

ادبی خدمات کے صلے میں جب حکومت نے انھیں تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا تو اس موقع پر ان کے بے شمار انٹرویو لیے گئے۔ ان میں پروفیسر صاحب کے حالاتِ زندگی اور علمی کاوشوں پر روشنی ڈالی گئی۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے ہر سوال کا جواب دیا۔ ایک معروف جریدے سے متعلق صحافی نے دوران انٹرویو ان سے سوال کیا "پروفیسر صاحب! آپ کی کتابوں کے شہرۂ آفاق مصنف ہیں۔ یہ آپ کی خداداد صلاحیت ہے یا اس میں کسی کی تربیت کا بھی ہاتھ ہے؟ وضاحت فرمائیے۔"

پروفیسر علی احمد نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ بڑے شستہ انداز میں کہا، "ذوق اور صلاحیت میرے رب کی ودیعت کردہ ہے جب کہ تربیت میرے دادا علی محمد نے کی ہے۔ وہ میرے دادا، استاد اور میرے پہلے طالب علم بھی تھے۔"

صحافی نے استفسارانہ لہجے میں کہا، "وہ کس طرح سر؟"

پروفیسر صاحب بولے "میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں۔ سندھ میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں میری پیدائش ہوئی۔ میرے کچے پکے گھر میں میرے والدین، دادا اور چچا نہایت پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ وہ زندگی دنیاوی آسائشوں سے تو خالی لیکن طمانیت سے بھرپور تھی۔ جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو دیکھا کہ میرے والد اس خاندان کے واحد کفیل ہیں۔ وہ سخت محنت مشقت سے کماتے۔ صبر و سادگی کا پیکر میری والدہ دن بھر گھر کے کام کاج میں مصروف رہتیں۔ چچا علی حیدر قصباتی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم پانے شہر چلے گئے تھے۔ بس چھٹیوں میں ہی ان کی صورت نظر آتی۔ لے دے کر ایک دادا کا دم تھا جو میرے سنگی ساتھی تھے۔ وہ مجھے روزانہ سونے سے پہلے احادیث مبارکہ، اسلامی و تاریخی واقعات اور اس کے علاوہ نت نئی کہانیاں سنا کر میرا دل بہلاتے۔

دادا کے سنائے قصے کہانیوں کا میں اتنا گرویدہ ہو گیا کہ ان کے بغیر مجھے نیند ہی نہ آتی۔ جب دادا خود کہتے کہ بس بیٹا اب مجھے نیند آ رہی ہے، تم بھی سو جاؤ تو میں چپ سادھ لیتا۔ لیکن ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میری یادداشت میں محفوظ ہو جاتا بلکہ ان جملوں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ایسے تانے بانے بنتا کہ تخیل کی پرواز مجھے نئی دنیا کی سیر کرواتی جہاں صرف میں ہوتا اور میری من گھڑت کہانیاں ہوتیں۔ لیکن اپنے خیالات کے موتی میں کاغذ پہ بکھیر پاتا کیونکہ تب مجھے پڑھنا لکھنا آتا ہی نہیں تھا اور نہ میں نے اسکول کی صورت دیکھی تھی۔ میرے والد نے جب

میرا داخلہ قصبے کے اسکول میں کروایا تو میں بہت خوش ہوا۔ یہ میری خوش فہمی تھی کہ میں اسکول میں قدم رکھتے ہی کہانیوں کی کتابیں پڑھنے لگوں گا۔ ایسا کچھ نہ ہوا تو میں دادا سے ضد کرتا کہ چچا شہر سے جو کتابیں، رسائل اور اخبارات لاتے ہیں، مجھے پڑھ کر سنائیے۔ دادا جواب دیتے، "بیٹا میرے لیے تو کالا اکشر بھینس برابر۔ میں کیا جانوں پڑھنا لکھنا۔ ہاں تو اسکول جانے لگا ہے۔ تو اگر مجھے لکھنا پڑھنا سکھا دے تو میں بھی پڑھاکو بن جاؤں گا۔ پھر تجھے یہ ساری کتابیں پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔" میں دادا کی باتیں حیرانی سے سنتا اور استعجاب انگیز لہجے میں دریافت کرتا۔ "دادا آپ کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تو پھر آپ مجھے روزانہ اتنے اچھے واقعات اور کہانیاں کس طرح سناتے ہیں؟" دادا ہنس کر جواب دیتے، "ارے بچے میں نے اپنے بڑوں سے جو کچھ سنا، وہ تجھے سنا دیتا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔" میں ان سے کہتا، "دادا میرے اساتذہ جو مجھے اسکول میں پڑھاتے ہیں نا، وہی سبق اسکول سے آ کر میں آپ کو پڑھایا کروں گا۔" دادا استفسار کرتے۔ "تو مجھے کیا پڑھائے گا؟" میں جواب دیتا، "اردو کا قاعدہ، بغدادی قاعدہ، تختی، پہاڑے، بس جب بھی آپ کو پڑھنا لکھنا آیا تو پھر کتابیں آپ مجھے پڑھ کر سنائیے گا۔ پھر کتابیں میں آپ کو پڑھ کر سناؤں گا۔" دادا میری باتوں پر خوب ہنستے۔ پہلے پہل تو وہ میری باتوں کو میری نادانی اور معصومیت پر ہی محمول کرتے رہے۔ لیکن میں نے ضد پکڑ لی کہ دادا آپ کو مجھ سے پڑھنا ہی ہو گا۔ ورنہ میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ آپ کی اور میری کٹی۔" میرا دھمکی آمیز لہجہ سن کر وہ فوراً کہتے، "نہ میرے بچے ناراض نہیں ہوتے۔ جو تیری خوشی وہ میری۔ تیری خفگی اور ناراضی میں برداشت نہیں کر سکتا۔" یوں میں اپنے دادا کا استاد بنا اور وہ میرے شاگردِ رشید بن گئے۔ جب میں نے انھیں پڑھانا شروع کیا تو وہ اسے میری بچکانا حرکت سمجھ کر مسکراتے رہتے۔ لیکن پھر انھیں خود پڑھنے لکھنے میں مزہ آنے لگا۔ واحد استاد اور واحد طالب علم پر مشتمل یہ اسکول نہایت خاموشی کے ساتھ کھیت کھلیانوں میں درختوں کے سائے تلے جاری و ساری رہا۔ میرا پڑھانا اور دادا کا پڑھنا ابھی تک صیغۂ راز میں تھا۔ کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ کچھ دادا میں طلبِ علم کی کشش، کچھ میری محنت ایسی رنگ لائی کہ وہ ٹھیک ٹھاک لکھنے پڑھنے لگے۔ قرآن پاک کا درس لیتا تو وہ کبھی نہ بھولتے۔ تختی، پہاڑے اور حساب میں بھی انھوں نے کافی تیزی دکھائی۔ البتہ املا میں وہ مار کھا جاتے۔ خصوصاً نقطوں میں اتنی گڑبڑ کرتے کہ سچ مجھے طیش اور غصہ آ جاتا جیسے کسی محنتی استاد کو اپنے کند ذہن شاگرد پر آتا ہے۔ املا میں غلطیاں کرنا ان کی کمزوری تھی۔ اسکول میں میرا درجہ تبدیل ہوتا تو میں دادا کا درجہ بھی تبدیل کر دیتا۔ نصاب کی وہی کتابیں انھیں پڑھاتا جو میں اسکول میں پڑھتا۔ دادا ہر سال خوش ہو کر کہتے، "علی بیٹا ہم دونوں پنجم جماعت پاس کر کے ششم میں آ گئے ہیں۔" ہم دونوں دادا پوتے کا موضوع ہی تعلیم اور کتابیں تھا۔ دادا پڑھ لکھ سکتے ہیں، یہ راز اس وقت فاش ہوا جب دادا قرآن خوانی کی مجالس میں شرکت کرنے لگے۔ اس کے علاوہ میرے چچا جو اب شہر میں برسرِ روزگار ہو گئے تھے وہ اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ دادا کے نام منی آرڈر کر دیتے۔ منی آرڈر فارم پر دادا بجائے انگوٹھا لگانے کے اپنے دستخط کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ یوں بڑھاپے میں تعلیم پا کر انھوں نے ثابت کر دیا کہ حصولِ علم کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ انسان علم کی دولت عمر کے کسی حصے میں بھی حاصل کر سکتا ہے۔ بستی کے اکلوتے ڈاکیے دین محمد نے یہ بات سارے علاقے میں پھیلا

دی کہ میرے دادا پڑھنا لکھنا جان چکے اور یہ انھوں نے مجھ سے سیکھا ہے۔ مجھے تو اس امر کو بہت سراہا۔ جب کہ کچھ دل جلوں نے یہ پھبتی کسی کہ "باسی کڑھی میں اُبال آگیا"۔ لیکن دادا اور میں نے کسی کی پروا نہیں کی۔ دادا پھر ضخیم کتب کا مطالعہ کرنے لگے۔ بیٹے کے بھیجے ہوئے پیسوں کی گنتی اور حساب کتاب بھی وہ بآسانی کر لیتے۔ لیکن لکھتے وقت ہجوں میں غلطی کر بیٹھتے۔ تب تک میں بھی میٹرک میں پہنچ چکا تھا۔ ان ہی دنوں اپنی تخلیقی قوت بروئے کار لا کر میں بچوں کے لیے ننھی منی کہانیاں لکھنے لگا۔ ان کہانیوں کو خوب پذیرائی ملی۔ لکھتے لکھتے حسنِ تحریر نکھرتا چلا گیا۔ پھر میں نے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں میرے چچا نے میری کافی مدد کی اور دادا...... دادا نے ہی دراصل میری مضمون نگاری اور کہانی نویسی کے فن کو جلا بخشی۔ انھوں نے میرے تخیل کی ایسی زرخیز آبیاری کی کہ میں روزمرہ کے مشاہدات اور آس پاس رونما ہونے والے واقعات کو واقعاتی تسلسل دے کر انھیں قصے کہانیوں کے قالب میں ڈھالتا اور الفاظ کے موتی کاغذ پر بکھیر دیتا۔ میں نے پھر کئی اہم موضوعات پر قلم اٹھایا اور وقت و حالات کی پروا کیے بغیر اپنی تحریروں کو خواص و عوام تک پہنچایا۔ قلم کو دولت کمانے یا تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ تحریر کے ذریعے تعمیر کی کوششیں کیں۔ اب یہ آپ لوگ بتائیں گے کہ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا۔"

انٹرویو کرنے والے صحافی نے بے ساختہ کہا، "سر! آپ نے اپنے دادا کا جو واقعہ سنایا ہے اسے سن کر مجھے شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا ایک مصرعہ یاد آگیا

ع جوانوں کو پیروں کا استاد کر

"لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ جو شہرت و عزت آپ کو قلم کے ذریعے اور دادا کی وجہ سے ملی، وہ اسے دیکھ پائے یا نہیں؟"

پروفیسر نے ایک سرد آہ بھری اور مغموم لہجے میں کہا، "جب میں نے میٹرک پاس کیا تو میری نمایاں کامیابی سے دادا بہت خوش تھے۔ میرے والد نے مجھے میرے چچا کے حوالے کر دیا جو مجھے شہر لے آئے۔ میری تعلیم میں ان کی مالی معاونت بھی شامل رہی۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت دادا اور والدین سے جدائی بہت شاق گزری۔ میں نے آنسو پیتے ہوئے اپنی آٹوگراف بک دادا کے سامنے رکھ دی۔ دادا نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس پر لکھا

ع علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

اس وقت بھی انھوں نے لفظ "مجھ" کی جگہ "مجحو" کر دیا۔ لیکن دادا کی یہ غلطی مجھے دعا بن کر ایسی لگی کہ قلم، کاغذ اور کتاب سے میرا رشتہ مزید گہرا اور مضبوط ہو گیا۔ میرے شہر آنے کے چند ماہ بعد ہی وہ دنیا سے کوچ کر گئے۔ اب ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے چلتے میری زندگی کی بھی شام ہو چکی۔ صحافی اور اس کے بھی ساتھی پروفیسر علی احمد کی داستان سے بہت متاثر ہوئے۔ زبانیں سب کی خاموش تھیں لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ان کا یہ انٹرویو آنے والی نسلوں کے لیے سنگِ میل ثابت ہوگا۔

■■■

مصنف کا اپنے بارے میں کہنا ہے کہ انھیں کہانیاں لکھنے کا شوق بچپن سے تھا، لیکن تواتر سے لکھ نہیں پائیں۔ اگر لکھتی تو تہذیب کا شکار رہتی اور پیرو ڈاک نہ بھیجتی۔ ان کا تعلق امراؤتی (مہاراشٹر) بھارت سے ہے۔ سسرال حیدرآباد پاکستان میں ہیں۔ حریم (لکھنؤ)، بانو (دہلی) اور اردو ڈائجسٹ (لاہور) میں چھپنے کا اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔ بہت کم لکھا اس لیے ابھی تک شناخت کا سفر جاری ہے۔

کالا بابا

نورالحسن

کالے بابے کی اجلی اور نکھری یادیں جو ماضی کے جھروکوں سے جھانکتی ہیں

"بہت یاد آئیں گے وہ دن
ہمیں تڑپائیں گے وہ دن
صنم تیری قسم"

جانے کس خوبصورت قلم کا مدھر گیت ہے۔ ذکر ہے بچھڑوں کا اور ان کی یاد کا! یاد کیا ہے؟ بچپن میں یاد لفظ کا استعمال ہمیشہ پہاڑوں اور (Tables) کے ساتھ سنا۔ ہاں اور کون ایسا ہے جس نے زندگی میں سبق یاد نہ کیا ہو یا یاد کر کے بھول نہ گیا ہو۔ "ہمیں تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔" بچپن سے لے کر ازدواجی زندگی اور محبت کے معاملات میں بے تحاشا استعمال ہونے والا ایک تاریخی جملہ ہے۔

پرویز مہدی صاحب سے سنا

"میریاں گلاں یاد کریں گی
فیر میں تینوں یاد آواں گا"

ملکۂ ترنم کی آواز میں ماسٹر عبداللہ کی یہ دھن جس کی یاد کو گزشتہ برسوں میں سجاد علی نے تازہ کیا، کون بھول سکتا ہے۔

"سینوں تیری یاد ستاندی نیندر نہیں آوندی"

اور نصرت فتح علی خان نے کیا کہنے۔

"یاداں وچھڑے سجن دیاں آئیاں
اکھیاں وچ مینہ وسدا"

لیجیے میں بھی یادوں میں کھو گیا۔ بے شمار ایسے ہیں جن کی خوب صورت، دکھ، سکھ یا درد بھری یادوں سے کوئی گیت نہ جڑا ہو۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ دھن یا گیت سنائی دے تو آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی ہیں یا آنسوؤں سے دھکنے لگتی ہیں۔ پہاڑوں اور سبق کو چھوڑیں یہ کسی کے دور ہونے، بچھڑنے یا جدا ہونے پر وجود میں آتی ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"یاد تو اُسے کیا جاتا ہے جسے آپ بھول جائیں۔"

اور بھولنے پر بھی کسی نے خوب کہا

روز کہتا ہوں بھول جاؤں تجھے
روز یہ بات بھول جاتا ہوں

آج کل Memories سے زیادہ Memory card یا USB پر زور ہے۔ اگر یاد کی تعریف ڈھونڈی جائے تو کسی بڑے سے ضرور مل جائے گی۔ آج میں یاد کے پیچھے پڑا ہوں یا یاد میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ بات اسی کمبل کی مانند ہے۔ آج میں کئی برسوں کے بعد کالے بابے کو یاد کر رہا ہوں۔

کالا بابا رنگ کا بھی کالا تھا۔ چھوٹی سی سلوٹوں بھری قمیص اور ایک چیک والی چھوٹی دھوتی میں ملبوس میں نے ہمیشہ کالے بابے کو دیکھا۔ ہاں عید پر بہتر دھوتی اور استری شدہ قمیص ہوتی۔ کالا بابا ہمارے محلے کے رہنے والوں کی ٹور کا ذمہ دار تھا۔ کپڑوں کو استری کیا کرتا تھا اور خوب حقہ پیا کرتا۔ انگاروں اور کوئلوں بھری استری

اور کالے بابے کے مزاج میں کوئی فرق نہ تھا۔ میں نے کالے بابے کو دل سے بہت کم ہی مسکراتے دیکھا۔ وہ کسی ایسی شہزادی کی مانند تھا جسے ہنسانے والے کی شادی بادشاہ خوشی سے شہزادی سے کر دیتا۔ غضب کے کپڑے استری کیا کرتا تھا کالا بابا۔ آج سوچتا ہوں کہ میں کبھی ہمت کر کے کالے بابے کا نام ہی پوچھ لیتا۔ مجھے لگتا ہے اسے بہت گلہ تھا کہ اس سے روزانہ سیکڑوں کپڑے استری کرائے جاتے ہیں اور کوئی اس کے آرام کا خیال نہیں رکھتا۔ سب کو اپنی اور اپنے کپڑوں کی پڑی ہے۔ شاید ایسا ہی تھا بلکہ یقیناً ایسا ہی تھا۔ بابا بعض اوقات بخار میں پھنکتا رہتا اور درد سے کراہتا رہتا۔ کالے بابے کے خاندان کی کوئی بھی بات یاد نہیں، ہاں ایک دکان تھی جہاں بابا استری اور کپڑے لٹکانے والے اسٹینڈ رکھ سکتے تھے۔ بس اکالے بابے کی دکان کے عقب میں خاندان آباد تھا۔ جس کے بچوں کو بابا خوب گالیاں بھی دیتا لیکن وہ سب بابے کا حتی المقدور خیال بھی رکھتے۔

سستے دور میں بھی سب کو ایسا ہی لگتا جیسے کالے بابے کو فی کپڑا زیادہ پیسے دے جاتے ہیں۔ لیکن جانے انسانوں کی نسبت مشینوں کو پیسے دینا اچھا لگتا ہے۔ کیا بھاری وزنی کوئلے والی استری تھی کالے بابے کی۔ خود تو انگاروں میں دہکتی رہتی لیکن پوشاکوں کی شکنیں اس طرح نکال دیا کرتی جیسے تھیں ہی نہیں۔ غرض کالا بابا وقت کے گزرنے کے ساتھ کمزور بھی ہوتا جا رہا تھا۔ حقے کے کش لگانے سے زیادہ تو کالا بابا کھانسنے لگا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ شاید کالا بابا کسی زمانے میں باقاعدہ دھوبی بھی رہا ہو۔ میری بچپن کی یادوں کا واحد دھوبی کالا بابا ہی تھا۔ میں اکثر اس کی کٹیا کے پاس کوئی کتا دیکھنے جاتا جسے کوئی کہے تو گھر کا تھا نہ گھاٹ کا۔

کالے بابے کا ہمارے گھر سے خوب تعلق رہا۔ اجرت، شکایتیں، جھاڑیں، ہمدردی، پیار، مدد سب تھوڑا تھوڑا ایک زندگی میں شخصیت کے نکھار اور رب سے پیار کے لیے ایک کالا بابا بہت ضروری ہے۔ استری کتنی گرم ہو کہ کمال کی کریز بن جائے، خالص لوہے کی وزنی استری کو کیسے کرارلی پوشاک پر پھیرا جائے کہ ایک ایک شکن نکل جائے۔ میرے ابا جی ہمیشہ کہتے کہ سچا آدمی کڑوا ہوا کرتا ہے۔ شاید اس بات کی بدولت ہی میں کڑوے سچ کی مٹھاس سے آشنا ہوا۔ کالا بابا بھی ایسا ہی تھا۔ بڑبڑانے والا، جھگڑالو لیکن اپنے کام کا ماہر۔ آپ اسے پسند کریں یا نہ کریں، اس کے ہنر اور کام کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سو کوئی تو ہو، جو ذہن کی، دل کی شکنیں نکال دے۔ بنا دے، اجلا کر دے، داغ نکال دے، جو ڈیٹرجنٹ چاہے استعمال کرے۔ جو نیل چاہے ملا دے، جو صابن چاہے منتخب کرے۔ بس میرے داغ نکال دے جب کپڑے کی صفائی مقصود ہو تو حوالگی بہت ضروری ہے۔ خوب جوش دیے جاتے ہیں، ڈنڈے برسائے جاتے، پانی میں بھگویا جاتا اور بالآخر دھویا جاتا ہے۔ خیر ہو داغ نکالنے والوں کی، خیر ہو نیل دے کرنے والوں کی، بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ چند مت بچوں کو گرد آلود کیچڑ بھرے کپڑوں پر ڈانٹتے اور پھر اس کے بعد ان کپڑوں کی صفائی کی ذمہ داری لے لیتے ہیں اور جت جاتے ہیں انھیں دھونے میں۔ سوچو تو ساری زندگی ملتے رہتے ہیں، کوئی کسر نہیں چھوڑتے اور کچھ دھوبی کی طرح صفائی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

کالا بابا رنگ کا بھی کالا تھا۔ لیکن اس کا کام روشن بھی تھا اور اجلا بھی۔ واہ! کالا بابا آپ کی تو یادیں بھی اجلی ہیں۔ اللہ آپ کو غریق رحمت کرے۔ آپ نے سب کی خوب خدمت کی، لیکن ہم ویسی خدمت نہ کر سکے کیونکہ ہم تو بس ایسے ہی تھے، کالے بابے تو آپ تھے!

■■■

بنگالی وفا شعاروں کے لیے نئی آزمائش

ڈھاکا میں تہذیبوں کا تصادم

سلام ان وفاشعاروں پر جو ڈھاکا ٹوٹنے کے بعد پاکستان اور اسلام سے محبت کی سزا پا رہے ہیں

اسلم خان

یہ ڈھاکا میں کیا ہو رہا ہے، دونوں کے لیے سیاسی کشمکش، نظریاتی تنازع یا پھر تہذیبوں کے تصادم کا نیا محاذ کھل گیا ہے..... نام نہاد شاہ باغ تحریک خونی لڑائی میں بدل چکی ہے۔ 60 سے زائد سیاسی کارکن تشدد کی لہر کا نشانہ بن کر لقمہ اجل ہوئے۔ بنگلہ دیش میں پاکستان کے خلاف شاہ باغ تحریک کسی اچانک اور وقتی ردعمل کا شاخسانہ نہیں سوچی سمجھی سیاسی چال ہے۔

بنگلہ دیش میں عام انتخابات جنوری 2014ء میں ہوں گے جس کے لیے بیگم حسینہ واجد نے شاہ باغ تحریک کے ڈرامے سے 5 فروری کو اپنی انتخابی مہم کا غیر رسمی آغاز کیا ہے۔ بظاہر تو شاہ باغ دھرنے کا واحد مقصد 1971ء کے دوران 9 ماہ کی جنگ آزادی یا وفاق پاکستان سے بغاوت کے دوران ہونے والے مبینہ جنگی جرائم کے مجرموں کو موت کی سزا دلوانا تھا۔ جس کا نشانہ بیگم خالدہ ضیاء کی پارٹی کے چند رہنما اور جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے بعض موجودہ اور سابق رہنما بنے ہوئے ہیں۔ حسینہ واجد جذباتی ہیجان پیدا کر کے جنوری 2014ء میں اپنا ووٹ بینک مضبوط کرنا چاہتی ہیں۔ جب کہ "ہمارا پیارا بھارت" جس کے درشن دیدار کے لیے ہم مرے جا

رہے ہیں، شاہ باغ دھرنے کی آڑ میں پاک فوج کو ہدف بنائے ہوئے ہے۔ 23 مارچ سے 16 دسمبر 1971ء کے نو ماہ کے دوران 30 لاکھ بنگالیوں کے قتل عام کا بے ہودہ اور لغو الزام دوبارہ بڑی شدت سے پاک فوج کے سر تھوپا جا رہا ہے جسے خود عوامی لیگ اور مجیب کے حامی دانشور بھی احمقانہ داستان طرازی قرار دے کر مسترد کر چکے ہیں۔

شیخ مجیب مرحوم کے ایک قریبی ساتھی نے حساب کر کے بتایا تھا کہ اگر روزانہ گیارہ ہزار افراد مارے جائیں تو 30 لاکھ افراد کی تعداد پوری ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دو لاکھ خواتین کی آبرو ریزی کا افسانہ گھڑا گیا جسے برصغیر کی جنگ آزادی کے ہیرو نیتاجی سبھاش چندر بوس کی پوتی ڈاکٹر شرمیلا بوس نے یکسر مسترد کر دیا ہے۔ 1971ء کی جنگ اور بنگلہ دیش کی آزادی پر ان کی شاندار کتاب (Dead Reckoning Memories of the 1971 Bangladesh War) کو عالمی درسگاہوں میں بڑی پذیرائی ملی ہے۔

افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ باضمیر بنگالی پاک فوج کے خلاف اس لغو، بے ہودہ پراپیگنڈے کو ٹھوس حقائق کی روشنی میں جھٹلا رہے ہیں لیکن پاکستان کے حکمران اور ہمارا "فارن آفس" دفتر خارجہ اور وزارت خارجہ منہ میں گھگھنیاں ڈالے خاموش بیٹھے ہیں۔ وفائے وطن کے جرم میں 40 سال بعد ایک بار پھر کٹہرے میں کھڑے بنگالی وفاشعاروں کے لیے تو ہماری زبانیں گنگ ہیں لیکن پرویز ہود بھائی جیسے دانشوروں کو ڈھاکہ کے شاہ باغ میں رچایا جانے والا ڈراما "بہار عرب" کی طرح انقلاب کی نوید لگ رہا ہے جس کا واحد مقصد پاک ... کے خلاف مہم چلا کر عوامی لیگ کے ووٹ بینک کو ... کے ساتھ بھارت کے اشارے پر ہمارے اُجلے دامن کو داغ دار کرنا ہے۔ ہم تو نجانے کیوں اُن جرم کیے بغیر شرمندہ شرمندہ ہیں ورنہ خود بنگالی دانشور 25 مارچ 1971ء کے فوجی ایکشن کا جواز پیش کرتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمن کے حکم پر عوامی لیگ نے تمام فوجی چھاؤنیوں کا گھیراؤ کر کے مکمل محاصرہ کر لیا تھا اور ہر قسم کے سامان خورد و نوش کی سپلائی بند کر دی تھی۔ اس وقت کی عوامی لیگی قیادت برملا یہ اعلان کر رہی تھی کہ ہم پاکستانی فوج کو بھوکا مار کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے جو کہ فوج کے خلاف مسلح اقدام تھا۔ اس کے باوجود پاکستان کی مسلح افواج نے صبر و تحمل کا ثبوت دیا اور ہر قسم کی زیادتی کو برداشت کیا۔ باغی بنگالیوں کے خلاف فوجی کارروائی ناگزیر تھی جسے کسی طور پر بھی غیر قانونی یا ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کہتے ہیں کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ ڈھاکا ڈرامے پر پاکستان حکمرانوں کی خاموشی ہماری اجتماعی بے حسی کا ثبوت تھا لیکن مظلوم بنگالیوں کے لیے غیر متوقع طور پر ترکی سے توانا آواز بلند ہوئی۔ کوئی اور نہیں ترکی کے صدر جناب عبداللہ گل پاک فوج اور پاکستان کی حمایت کے لیے لڑنے والے بنگالیوں کے لیے میدان میں آ گئے۔ ترک صدر نے اپنے ہم منصب بنگلہ دیشی صدر ظل الرحمن اور وزیراعظم حسینہ واجد کے نام الگ الگ خطوط میں درخواست کی ہے کہ پاکستان کی حمایت میں غیر ملکی جارحیت کا مقابلہ کرنے والے سیاسی رہنماؤں کو قید یا موت کی سزا دینے سے گریز کیا جائے، اس سے بنگلہ دیش میں تشدد بڑھے گا اور معاشرہ خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔ ترک صدر نے پروفیسر غلام اعظم کی پیرانہ سالی کا حوالہ دیتے ہوئے وزیراعظم حسینہ واجد اور بنگلہ

"امن کی آشا کے نقاروں میں دم توڑتی آوازوں میں عبداللہ گل کی بلند آواز، پاکستان کے ساتھ عہد وفا نبھانے والوں کے لیے کیا خوب کلمہ خیر ہے"

دیش کے صدر ظل الرحمن سے دانش مندی اور صلح جوئی کی اپیل بھی کی تھی۔ بنگلہ دیشی حکومت نے ترک صدر عبداللہ گل کے خط کو بنگلہ دیش کے اندرونی معاملات میں مداخلت قرار دے کر مسترد کر دیا اور ڈھاکا میں ترکی کے سفیر محمد وقار اوزکل (Mehmer varurerkul) کو دفتر خارجہ طلب کر کے عبداللہ گل کے خط پر شدید احتجاج کیا جس پر باغیرت ترک خاموش نہیں رہے۔ ترک دفتر خارجہ نے جواباً انقرہ میں بنگلہ دیشی سفیر ذوالفقار رحمن کو طلب کر کے صدر عبداللہ گل کے خط پر توہین آمیز تبصرے کرنے پر احتجاج ریکارڈ کرایا۔

بنگلہ دیشی وزارت خارجہ نے ترکی کی دو این جی اوز کے چودہ رکنی وفد کی ڈھاکا میں مشکوک سرگرمیوں پر احتجاج کرتے ہوئے انھیں بنگلہ دیش بدر کرنے کی دھمکی بھی دی تھی جو ترکی کے شدید ردعمل کے پیش نظر واپس لے لی گئی۔ ڈھاکا میں ترکی کے سفیر پر الزام عائد کیا گیا کہ این جی اوز کے وفد نے آمد پر ویزے کی سہولت کا ناجائز فائدہ اٹھایا کہ اس وفد نے نام نہاد عالمی جرائم ٹریبونل میں سماعت کی کارروائی کیوں دیکھی۔ اسی طرح ترک سفارت خانے نے حزب اختلاف کی رہنما بیگم خالدہ ضیاء اور جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے رہنماؤں سے ملاقاتوں کو کیوں اخفا میں رکھا۔ جب کہ ترکی اور بنگلہ دیش کے درمیان سفارتی کشیدگی عروج پر تھی تو پاکستانی وزارت خارجہ اور حکمران "خاموشی" سے غیر جانبداری کے مزے لوٹ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ ضمیر نام کی چیز انفرادی طور پر شخصی کردار کے بناؤ بگاڑ میں بڑی اہم ہوتی ہے جب کہ اجتماعی ضمیر قوموں کی ہیئت ترکیبی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم شاید انفرادی اور قومی سطح پر ضمیر سے محروم ہو چکے ہیں۔

جناب عبداللہ گل..... آپ کا شکریہ کہ مشکل حالات میں پاکستان کے ساتھ عہد وفا نبھانے والے بنگالیوں کے لیے کلمہ خیر کہا کہ ہماری آوازیں تو "امن کی آشا" کے نقاروں میں دم توڑ چکی ہیں۔ اے خدائے بزرگ و برتر ہمیں بھی عبداللہ گل جیسا غیرت مند اور روشن ضمیر رہنما عطا فرما جو حق کا ساتھ دے سکے۔ اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کر سکے جسے خاموشی سے غیر جانبدار رہنے کا شوق نہ ہو۔

ڈھاکا کا میدان جنگ

جنگی جرائم کی آڑ میں عالمی جرائم کی خود ساختہ عدالتیں پاکستان سے وفا کے جرم میں تین سرکردہ بنگالی رہنماؤں کو سزائے موت سنا چکی ہیں۔ جناب دلاور حسین سعیدی کو سزائے موت کے اعلان کے ... سارے ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑے ...

پچاس سے زائد افراد مارے جا چکے ہیں۔ حسینہ واجد کا بنیادی ہدف جماعت اسلامی بنگلہ دیش کی قیادت ہے۔ چار دہائیوں کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی نے صرف ووٹوں کی سیاست کے لیے نفرت کے کھیل کو ہوا دے دے کر شعلہ جوالا بنا دیا ہے جس کی آگ نے اب سارے بنگلہ دیش کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

ڈھاکا کی یہ "ڈراما" عدالتیں 23 مارچ 1971ء سے 16 دسمبر 1971ء کی خانہ جنگی کے دوران ہونے والے مبینہ جرائم کے مقدمات چلانے کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ 9 ماہ کے دوران بنگال کے سبزہ زاروں میں بے گناہوں کا لہو بہایا گیا۔ چار دہائیوں کے بعد اب ان جرائم کے خلاف مقدمات چلانا نفرت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دینا ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے 16 دسمبر 1971ء کو جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد جنگ ختم ہو گئی تھی۔ لیکن وفائے پاکستان کے جرم میں آج بھی عشق پیشہ بنگالی موت کی سزائیں سن و بھگت رہے ہیں۔ ہماری اشرافیہ تو مشرقی پاکستان کا باب کب کا بند کر چکی ہے۔ ہماری نئی نسلوں کو سونار بنگلہ، مسجد بیت المکرم اور ان ساحلوں اور سمندروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن پاکستان کے وفا شعار بنگالیوں کی دوسری اور تیسری نسل آج بھی جرم وفا کی سزا بھگت رہی ہیں اور یہ خیال باطل ثابت ہوا کہ دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق ہو گیا تھا۔ نہیں جناب بالکل نہیں، دو قومی نظریہ آج بھی پوری شدت سے بروئے کار ہے، اسی لیے تو بھارت نواز بنگالی شاہ باغ میں پاکستان کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھے ہیں جس کے پس پردہ قوت متحرکہ عوامی لیگ کی قیادت اور شیخ مجیب الرحمٰن کی صاحبزادی حسینہ واجد ہے۔

دو قومی نظریے کی سچائی کی نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے

مطیع الرحمٰن نظامی

16 دسمبر 1971ء کے بعد بنگلہ دیشی حکومت نے سازباز ایکٹ کے تحت ہزاروں بنگالیوں کو انتہائی مدت تک قید رکھا تھا۔ مختلف ادوار میں دفاع پاکستان کے لیے جارح بھارتی افواج اور مکتی باہنی کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار دم توڑ گئے تھے جن میں شہید پاکستان قومی اسمبلی کے آخری اسپیکر فضل القادر چودھری بھی شامل تھے۔ اب ابوالکلام آزاد، عبدالقادر ملا کے بعد دلاور حسین سعیدی کو ان جرائم ٹریبونلز سے موت کی سزا سنوائی گئی ہے جن کا قیام ہی متنازع اور آئین سے متصادم ہے۔

16 دسمبر 1971ء تک مشرقی پاکستان، وفاق پاکستان کا حصہ اور خود مختار ریاست تھا جس کا دفاع اس کے تمام باشندوں پر فرض لازم تھا۔ اس وقت پاکستان

کے بنگالی باشندوں کو آج چار دہائیوں کے بعد اپنے وطن کے دفاع کے مقدس جرم میں موت کی سزائیں دی جا رہی ہیں جو انصاف کے تقاضوں اور عالمی نظائر سے متصادم ہیں۔ نام نہاد انٹرنیشنل کرائمز ٹریبونل ارکی کورٹ نمبر 1 میں جسٹس اے ٹی ایم فضل کبیر نے دلاور حسین سعیدی کو سزائے موت سنانے کا اعلان کرنے سے پہلے بڑے ڈرامائی انداز میں خطبہ دیا:

"فیصلے کا اعلان کرنے سے پہلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کمرہ عدالت میں سکوت مرگ طاری تھا۔ ہمارا ملزم کوئی عالم دین نہیں ہے، نہ ہی وہ دو بار پارلیمنٹ کا رکن رہا ہے، وہ جماعت اسلامی بنگلہ دیش کا نائب امیر بھی نہیں ہے۔" پھر جسٹس فضل کبیر ڈرامائی رنگ بھرنے کے لیے خود سے سوال کرتا ہے: "کیا ہم کسی عالم دین پر مقدمہ چلا رہے ہیں.....؟" "نہیں" "کیا ہم جماعت اسلامی کے نائب امیر پر مقدمہ چلا رہے ہیں.....؟" "نہیں" "کیا ہم دو مرتبہ رکن پارلیمنٹ منتخب ہونے والے معزز شخص پر مقدمہ چلا رہے ہیں؟" "نہیں"

"نہیں جناب، ایسا نہیں ہے۔" ہمیں اپنے ملزم کی شناخت کے لیے چالیس سال پیچھے جانا ہوگا۔ ہمارا ملزم پیروزپور کا رہائشی تیس سالہ نوجوان "دلیا" تھا۔ ایک بچے کا باپ وہ 1971ء میں عام آدمی تھا۔

دلاور حسین سعیدی، رواں روانی سے اردو بولنے والا نوجوان جس نے پاک فوج کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دوران نو ماہ میں بنگالی عوام کے خلاف جنگ کی۔

اس مکالمہ بازی کے بعد 120 صفحات پر مشتمل فیصلے کا اعلان کیا گیا جس کے مطابق جرائم ثابت ہونے پر سزائے موت سنائی گئی۔ انھوں نے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اس مقدمے کا اہم ترین پہلو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہم کسی سابق رکن پارلیمان یا نائب امیر جماعت اسلامی علامہ دلاور حسین سعیدی کے خلاف فیصلہ سنانے نہیں جا رہے جن کے دینی خطبات سننے کے لیے ملک بھر سے ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ حالات و واقعات اور شواہد کے مطابق ہمارا ملزم دلاور حسین سعیدی کسی قسم کی سیاسی یا سماجی حیثیت نہیں رکھتا، ہمارا ملزم تو ایک کریانہ فروش دلاور حسین سعیدی ہے جس نے مقامی امن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے انسانیت کے خلاف جرائم کا ارتکاب کیا تھا جو بنگلہ دیش کی جنگ آزادی سے لڑنے والی پاک فوج کا وفادار تھا۔

فیصلے میں کہا گیا ہے کہ وکیل صفائی نے موقف اختیار کیا ہے کہ رضاکار دلاور حسین ملک خانہ جنگی کے دوران مارا جا چکا ہے۔ اب بدنیتی کی بنا پر دلاور حسین ملک کے جرائم کی سزا علامہ دلاور حسین سعیدی کو دی جا رہی ہے اور ہمارے ہاں بھی ان مظلوموں کے حوالے سے اپنی پسند کی تاریخ لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے مخالف اور پاک فوج کے ملٹری ڈاکٹرائن کے ناقد ہیں۔ پاکستان کے وفادار بنگالیوں کو جرم محبت پر سزا کی خوشخبری سن کر ڈھاکا کے گلی کوچوں میں رقص برپا ہے۔ لیکن آفرین ہے ان بنگالی نوجوانوں پر جو آج بھی اپنے لہو سے انھی گلی کوچوں میں دو قومی نظریے کی ابدی سچائی سنہری تاریخ لکھ رہے ہیں۔ ہمارے لیے ڈھاکا ڈوب گیا ہوگا۔ لیکن ان کے لیے آج بھی اسلام کا فلسفہ حیات سربلند ہے جس کے لیے وہ بلا خوف و خطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے جا رہے ہیں۔ سلام ہے ان وفا شعاروں پر۔

(مصنف معروف کالم نگار اور ایک نیوز ایجنسی کے سربراہ ہیں)

■■■

عوام کی رام لیلا

[illegible]

حامد ستار [illegible]

عوام کا نام سامنے آتے ہی ذہن میں صابر و شاکر اور دکھ درد سہنے والے انسانوں کی تصویر آ جاتی ہے۔ انسانوں کا نام عوام کیسے پڑ گیا، یہ تو معلوم نہیں تاہم پروفیسر فتر بود کا خیال ہے کہ پہلے پہل جب انسان صرف انسان تھے تو خواص ان پر قسم قسم کے تجربات کرنے لگے۔ بے چارے انسان ''ہائے ہائے'' کرتے اور رفتہ رفتہ زمانے کے سرد گرم تھپیڑے کھا کر ''آہ واہ'' کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اسی آہ واہ سے عوام کا لفظ وجود میں آیا۔

مغرب میں خواص نے کافی غور و خوض اور مغز ماری کے بعد اپنے ''کمیوں'' کو (Folk) کا نام دیا۔ یہ ''Folk'' یعنی ریوڑ سے متاثر ہو کر انھیں دیا گیا، کیوں کہ بھیڑ بکریاں مالک کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں، جب چاہے انھیں ہانکو، جب چاہے مارو۔ یہی حالت عوام کی ہوتی ہے۔ اسی لیے انھیں یہ نام پسند آیا۔ بعد میں جب مغربی زبانوں نے ترقی کی تو ''عوام'' کے لیے ''Mass'' اور ''Public'' جیسے ''مہذب'' الفاظ استعمال ہونے لگے۔ ہندوستان میں عوام کو ''جنتا'' کہتے ہیں۔

''عوام'' کی تعریف مختلف دانشوروں اور مفکروں نے کی ہے۔ پروفیسر بابدار نے لکھا ''عوام بی کیٹگری کے بی کلاس لوگ ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ان کے ساتھ کچھ بھی کرنا ممکن ہے۔ وہ ہر رشتے میں فٹ ہو سکتے ہیں۔'' ایک اور مشرقی مفکر، الف ب جمال نے اپنی کتاب ''عوام بننا سیکھیے'' میں لکھا ہے ''عوام وہ سستی لوگ ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں۔'' پس خلاصہ یہ ہے کہ ''عوام'' بہت ہی معمولی قسم کی مخلوق ہے۔

ہر اسم کی ایک ضد ہوتی ہے اور ''عوام'' کی ضد ''خواص'' ہے۔ دونوں میں مریخ اور آسمان کا فرق ہے۔ زیادہ تو ہو سکتا ہے لیکن کم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام وہ کچھ کرتے ہیں، وہ خواص نہیں کرنا چاہتے۔ جو کچھ خواص کرتے ہیں، وہ عوام کے بس کی بات نہیں۔ عوام کام کرتے ہیں جیسے کھیتی باڑی کرنا، ہائے ہائے کرنا، آنسو بہانا اور محنت وغیرہ کرنا۔ خواص خاص کام کرتے ہیں جیسے حکومت کرنا اور حکومت چلانا۔ حکومت چلانے کی خاطر تیل عوام کے جسموں سے نکالا جاتا ہے۔

عامی ہوں یا خاص، دونوں کے لیے حیوانی تشبیہات مستعمل ہیں۔ مثلاً ''خواص'' کو عموماً ''مگرمچھ'' کہا جاتا ہے۔ عوام کے لیے ''اونٹ'' استعمال ہوتا ہے۔ اونٹ اور عوام میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں بلبلاتے ہیں۔ اونٹ غصے سے بلبلاتا ہے جب کہ آئے روز ہم اخبارات کی شہ سرخیاں پڑھتے ہیں کہ ''عوام لوڈشیڈنگ یا گرمی سے بلبلا اٹھے۔'' ریگستان میں اونٹ کو جہاز کہتے ہیں اور پاکستان میں عوام کو اونٹ۔ اونٹ کبھی کبھی بے مہار ہو جاتا ہے لیکن ''عوام'' بے مہار نہیں ہوتے۔ ان کی مہار ہمیشہ خواص (حکمرانوں) کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور وہ عوام پر سوار ہو کر اقتدار کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ عموماً یہ سفر پانچ سال کا ہوتا ہے لیکن کمی و بیشی ہونا ممکن ہے۔ سب سے لمبا سفر گیارہ برس کا ہوا ہے۔ کبھی کبھی یہ سفر وقفے کی صورت بھی ہوتا ہے تاکہ اقتدار کے شہسوار کچھ دیر آرام کر سکیں۔ یہ سفر عرف عام میں ''حکمران سفر'' کہلاتا ہے۔

عوام اور خواص میں بھول جانا قدر مشترک ہے۔ عوام آزمائے ہوئے کو بھول جاتے ہیں کہ سواری کا بوجھ کتنا بھاری تھا۔ چنانچہ بہ موقع انتخابات پھر سواری کے واسطے منتخب کرتے ہیں۔ اسی طرح خواص جیتنے یا ہارنے کے بعد عوام کو بھول جاتے ہیں یا پھر اس طرح غائب ہوتے ہیں جیسے گرمیوں میں بجلی۔ عوام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خواص کے لیے بے تابانہ نعرے لگاتے ہیں، خاص کر الیکشن کے دنوں میں۔ ہمارے علاقے میں دو امیدوار آمنے سامنے ہوئے۔ ایک کو گینڈا نشان الاٹ ہوا اور دوسرے کو گدھا۔ عوام سارا دن نعرے لگاتے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ ایک گروہ کا نعرہ تھا ''جیتے گا بھئی جیتے گا گینڈا ہمارا جیتے گا۔'' دوسرے گروہ نعرہ لگاتے ''جیتے گا بھئی جیتے گا، گدھے والا جیتے گا۔'' گدھے والا جیتے گا اور واقعی ''گدھے والا'' جیت گیا۔

لیکن دونوں میں ایک فرق بھی نظر آتا ہے، یہ کہ خواص عوام میں گھل مل جاتے اور خطاب بھی کر سکتے ہیں۔ جیسے عید کے روز ''وزیراعظم'' کا عوام میں گھل مل جانا، عوامی اجتماع سے خطاب کرنا، عوام کے مسائل سننا۔ اس کے برعکس عوام خواص سے نہیں گھل مل پاتے اور نہ خطاب کر سکتے ہیں۔ خدانخواستہ کوئی ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اس کی خیر نہیں ہوتی۔ پولیس پھر اسے اپنا مہمان بناتی ہے اور ''عجائبات عالم'' کی سیر کراتی ہے۔ بدروحیں مختلف شکلوں میں ان پر نازل ہوتی ہیں، کبھی حوالدار، کبھی تھانیدار اور کبھی سنتری کی صورت میں۔

خواص عوام کے لیے جو بھی کریں، وہ ہمیشہ فعل ''مستقبل'' میں کرتے ہیں۔ عوام ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے ہیں۔ مثلاً اخبار کی چند سرخیاں

ملاحظہ فرمائیے:

☆دسمبر تک بجلی کی لوڈشیڈنگ ختم کر دی جائے گی۔ (سال کا پتا نہیں، غربت کی شرح کو کم کیا جائے گا۔ کس صدی میں۔ پتا نہیں)

☆ملک سے بیروزگاری کا خاتمہ کیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

☆عوام اور خواص میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ عوام ''چیلے'' بن جاتے ہیں اور خواص ''لیڈر'' تاہم چیلوں کو پیٹ اور لیڈر کو پارٹی کی فکر ہوتی ہے۔ عوام کو اگر پیٹ بھرنے کی خاطر نہ ملے تو وہ اللہ کو پیارے ہو سکتے ہیں۔ ہاں خواص کے لیے متبادل موجود ہے...... دوسری پارٹی۔ ایک سے دوسری سیاسی جماعت میں جانا۔

☆سادہ زبان میں ''لوٹا پن'' کہلاتا ہے۔ شائستہ زبان میں اسے ''لوٹا کریسی'' اور ''لوٹا ازم'' کہتے ہیں۔ شاید یہ اصطلاحیں درست نہیں کیونکہ پارٹی بدلنے سے کوئی شخص لوٹا نہیں بلکہ ''لوٹ'' بن جاتا ہے اور وہ بھی ڈالر کا!

عوام اور خواص کے درمیان کھانے پینے میں بھی کافی فرق ہے۔ خواص کھانے کے بجائے ہڑپ کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں، جیسے سرکاری فنڈ ہڑپ کرنا، پلاٹ غائب کرنا، ملکی و غیر ملکی امداد کھا لینا وغیرہ۔ جب کہ بے چارے عوام دھکے کھاتے، جھڑکیاں پیتے اور گالیاں ہضم کرتے ہیں۔

خواص کے مقابلے میں عوام کی تعداد خاصی ہے۔ دن بہ دن ان کی تعداد میں پیٹرول کی قیمت کے مانند اضافہ ہوتا ہے لیکن کوئی بات نہیں، سو تربوزوں کے لیے ایک ہی چاقو کافی ہے۔ خواص بہرحال ان پر مہنگائی کے حملے کرتے ہیں، یوں عوام کی تعداد میں کچھ کمی ہو رہی ہے۔ اگرچہ عوام خواص کی طرح بے اتفاق نہیں جو تقسیم ہو جائیں، جیسے مسلم لیگ دھڑوں میں تقسیم ہو چکی۔ عوام دکھ درد سہنے، برداشت کرنے کے لیے متحد ہیں۔

خواص یہ نہیں چاہتے کہ عوام کی حالت بدل جائے کیونکہ ان کی حالت بدلی تو پھر خواص کے حالات بدل جائیں گے۔ تاہم خواص کو یقین ہوتا ہے کہ عوام کی بے لوث خدمت کریں گے اور عموماً انہیں مایوس نہیں ہوتی۔ عوام کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن ان کا ووٹ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ یہ ووٹ ہی ہے جو خواص کو خاص بناتا ہے۔ اسی لیے خواص عوام کو بہلا پھسلا کر ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ ہماری پاکستانی قوم سے استدعا ہے کہ بے شک آپ کچھ نہ بنیں مگر خواص کے بہتر مستقبل کی طرح اچھے عوام ضرور بنیں کیونکہ ان کے بغیر یہ ملک چل نہیں سکتا۔

■■■

حکمت کے ہیرے

☆دنیا کی قیمتی ترین چیز عزت ہے۔

☆وقت ایسا انمول ہیرا ہے جسے کھو کر پانا ناممکن ہے۔

☆فضول بحث بہترین دوست سے جدا کر دیتی ہے۔

☆جب عقل پاگل ہو جائے تو گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔

☆اپنا راز محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو خود سے بھی چھپاؤ۔

☆معمولی نیکی بھی مغفرت کا سبب بن سکتی ہے۔

☆خاموشی گفتگو کا سب سے بڑا فن ہے۔

(نورین جالب۔ قلعہ دیدار سنگھ، گوجرانوالہ)

چندن خان عرف چاقو

بیچارہ شاعر استاد

ایک نواب صاحب کا تذکرہ انہوں نے ایک شاعر کو استاد رکھ لیا تھا

عین اُس وقت جب بیروزگاری سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ نمائش میں ایک اسٹال لے کر چاٹ کی دکان کھول لیں اور دہی بھلے بیچ کر کسی طرح پیٹ تو پالیں، محبوب سبحانی صاحب نے آ کر ملازمت کا مشورہ دیا۔ سوکھے دھانوں پانی برسا۔ جی چاہا کہ محبوب سبحانی کے قدموں پر گر کر مارے شکر گزاری کے جان دے دیں۔

کہاں ملتے ہیں کسی کو ایسے دوست جو بد بختی میں بھی ساتھ نہ چھوڑیں اور وقت پہ یوں کام آئیں۔ ایک شاندار ملازمت ڈھونڈھی پانچ ہزار روپے ماہوار تنخواہ، کھانا نواب صاحب کے ساتھ، ان ہی کے دستر خوان پر، رہنے کو مکان سواری میں موٹر، خدمت کے لیے نواب صاحب کے بے شمار خدمت گار موجود اور کام صرف یہ کہ نواب صاحب کے کلام پر اصلاح دے دیا کریں۔ گویا استاد شہ جس سے غالب کی بھی یہ تاب، یہ مجال اور یہ طاقت نہ تھی کہ پرخاش کا خیال کرتے۔ دیر تک تو یہ یقین ہی نہ آیا کہ سبحانی صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ سچ ہے اور جب یقین آیا اور ان کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار نظر آئے۔

یعنی عجیب منحوس ہو۔ میں نواب صاحب سے کہہ کر آیا ہوں کہ ابھی لا رہا ہوں تم کو اور تم ہو کہ منہ اٹھائے بیٹھے ہو بُغد کی طرح۔ کپڑے پہن کر چلو میرے ساتھ پھر ان کے حرم سرا میں جانے کا وقت آ جائے گا۔

جلدی جلدی کپڑے بدلے اور ہر چند کہ سو پشت سے آباء کا پیشہ کچھ سپہ گری ہی کی قسم کا تھا مگر آج چونکہ شاعری ذریعہ عزت بن رہی تھی لہٰذا اپنے کو اپنے نزدیک بڑا استاد السلطان بنا کر سبحانی کے ساتھ ہو لیے۔

راستہ بھر سبحانی آداب دربار سمجھاتے رہے اور بار بار یہ اصرار کہ ذرا لیے دیے رہنا، اپنے کو گرا پڑا ثابت نہ کرنا۔ کلام کی فرمائش ہو تو ذرا کوئی ٹھاٹھ دار چیز سنانا اور پڑھنے کا انداز ایسا ہو کہ جھوم ہی تو جائیں سب۔ ہم ایک ایک بات گرہ میں باندھتے ہوئے آخر نواب صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر جا پہنچے۔ یہاں سبحانی نے آخری مرتبہ ہم کو سر سے پیر تک دیکھا اور ہر طرح کا اطمینان کرنے کے بعد آخری بات سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر اتفاق سے خود نواب صاحب بہادر اپنا کلام سنانے بیٹھ جائیں تو خواہ وہ کتنا ہی مہمل ہو، مگر تم داد دینے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دینا اور اس آخری ہدایت کے بعد وہ ہم کو لے کر کوٹھی میں داخل ہو گئے۔

کوٹھی کے سبزہ زار پر اس وقت دربار لگا ہوا تھا۔ کرسیوں پر حاضرین بیٹھے ہوئے تھے اور صدر میں ایک تخت پر ایک بزرگ گاؤ تکیے کا سہارا لیے اپنے شفاف سر پر خدمت گار سے تیل کی مالش کرا رہے تھے کہ سبحانی نے پہنچ کر فرشی سلام کرتے ہوئے کہا، حضور والا! دیکھیے آخر میں لے ہی آیا چاقو صاحب کو۔ شاگردوں کا ایک جم غفیر تھا اور اصلاح دینے کا سلسلہ جاری تھا مگر حضور کا نام لیا تو بیچارے سب کچھ چھوڑ کر چلے آئے۔

ہم نے بھی فرشی سلام کیا۔ نواب صاحب نے بمشکل تمام اپنا بوجھ خود اٹھا کر ذرا سا اُبھرتے ہوئے فرمایا، تشریف رکھیے۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے، آپ کس قسم کے شعر بناتے ہیں؟ ایک دم چکر سا آ گیا کہ یا اللہ! یہ شعر بنانا کیا ہوتا ہے؟ مگر شکر ہے کہ سبحانی صاحب ہماری طرف سے بول رہے تھے۔ حضور مانے ہوئے اُستاد ہیں، ہر قسم کے شعر لاکھوں کی تعداد میں کہہ کہہ کر شاگردوں کو بانٹ چکے ہیں اور خود بھی تین، چار تو دیوان اپنے ہی ہیں۔

نواب نے یکمشت چار، پانچ پان اپنے تنور نما منہ میں ٹھونستے ہوئے فرمایا، بھئی خود ان کو بھی تو بولنے دو کیا بتایا تھا تم نے لقب آپ کا؟

سبحانی نے کہا، حضور لقب نہیں تخلص۔

حاضرین دربار میں سے ایک صاحب بولے: وہ بھی ایک قسم کا لقب ہی ہوتا ہے۔

ہم نے جلدی سے عرض کیا۔ اس خاکسار کو چندن خان عرف چاقو کہتے ہیں۔ نواب صاحب نے اگالدان میں منہ ڈالتے ہوئے فرمایا، چاقو! ٹھیک، مطلب یہ کہ قتل کرتے ہوں گے۔ آپ اپنی چیزیں سُنا سُنا کر لوگوں کو۔ اچھا تو پھر ہو جائے کوئی پھڑکتی ہوئی چیز۔ کیوں بھئی خاور خاں کیا صلاح ہے؟

خاور خاں نے کہا: کوئی حقانی چیز رہے استاد۔

نواب صاحب نے کہا کہ اماں تم تو ہو نرے گھامڑ۔ حقانی چیز کا بھلا کونسا موقع ہے نا چلتے ما القوار۔ استاد آپ تو کوئی عاشقانہ چیز سنائیں کہ طبیعت لوٹ پوٹ ہو کر رہ جائے۔

ایک اور صاحب بولے: ہاں یہ بات کہی ہے سرکار نے تو پھر استاد شروع ہو جائیے۔ ہم ابھی پس و پیش ہی کر رہے تھے کہ محبوب سبحانی نے قہر آلود نگاہوں سے گھورا اور دانت پیس کر اشارہ کیا کہ سناؤ اور یہاں یہ عالم کہ کوئی ایسی چیز سمجھ میں نہ آ رہی تھی جو اس محفل میں سنائی جا سکے آخر سبحانی نے خود ہی کہا، استاد صاحب! اپنی وہ غزل سنائیے جس پر مشاعرے میں آپ کو تمغہ ملا تھا۔

وہ کیا ہے غزل گریباں نہ ہوا بیاباں نہ ہوا۔

جان پہ کھیل کر ہم نے بھی غزل شروع کر دی۔ اب یہ عالم کہ ہم غزل پڑھ رہے ہیں اور ہر شعر پر نواب صاحب "ہے ہے ہے" کر کے نہایت بدتمیزی سے ہنس رہے ہیں یا کبھی کبھی ٹھٹھے پر طبلہ بجانے لگتے ہیں۔ خدا خدا کر کے بمشکل تمام غزل ختم ہوئی۔

نواب صاحب نے داد دیتے ہوئے فرمایا: یار مزا آ گیا۔ کیا مزے کی چیز سنائی ہے۔ اچھا تو اس پر تحفہ ملا تھا؟

سبحانی نے کہا کہ ایک تمغہ کیا۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ جس مشاعرے میں پہنچ گئے بس اپنے سامنے کسی کا چراغ جلنے نہیں دیتے۔

وہ صاحب جن کا نام خاور خاں تھا، جھوم کر بولے: اور آواز بھی اپنی قسم سے بڑی پاٹ دار ہے۔

نواب صاحب نے کہا: تو بھئی سبحانی صاحب تم وہ بات کر لو نا ان سے، بس ذرا یہ سمجھا دینا کہ اپنا ہی گھر سمجھ کر رہیں۔ ایمانداری اصل چیز ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ اس ڈیوڑھی پر جو ایک مرتبہ ملازم ہو گیا۔ پھر مر کر ہی نکلتا ہے۔

سبحانی صاحب نے کہا: ویسے تو میں بات کر چکا ہوں مگر ان کو لے جا کر پھر فیصلہ کیے لیتا ہوں۔ نواب صاحب نے کہا: ہاں ساری بات صاف ہو جائے اور ہاں یہ طے کر لینا کہ پھر کسی اور کو یہ شاگردی میں نہیں لے سکتے۔

سبحانی صاحب نے ہم کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: میں ابھی سب کچھ سمجھائے دیتا ہوں۔ ہم دونوں اٹھ کر جب کوٹھی کے ایک علیحدہ کمرے میں پہنچ گئے تو ہم نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا: بھئی سبحانی صاحب مجھ کو تو سخت وحشت ہو رہی ہے۔ یہاں کس طرح میں نباہ کر سکوں گا ان لوگوں سے۔

سبحانی صاحب نے کھا جانے کے انداز سے کہا۔ کیا مطلب۔ کونسی بات ایسی ہوئی جس سے وحشت ہوئی آپ کو؟

ہم نے حیرت سے کہا: یعنی کمال کرتے ہیں آپ۔ جہاں تخلص کو لقب کہا جائے۔ جہاں شعر کہنے کو شعر بنانا کہا جائے۔ جہاں ایک شاعر سے حقانی اور عاشقانہ چیزیں سننے کی فرمائش ہو، جہاں بدتمیزی سے ہنس ہنس کر شعر سنے جائیں اور سن سن کر ٹھٹھے پر طبلہ بجایا جائے اور جہاں بجائے کلام کے آواز کے پاٹ دار ہونے کی داد دی جائے وہاں آپ کے نزدیک وحشت بھی نہ ہو کسی کو۔

سبحانی صاحب نے بگڑ کر کہا: بس تو پھر جائیے وہ بڑے شاعر بنے پھرتے ہیں۔ وہی مثل کہ گھر میں نہیں دانے اور اماں چلیں بھنانے۔ دو روٹیوں کا سہارا جو نظر آیا تو دماغ میں لگا کیڑا رینگنے۔ تم تو اسی قابل ہو کہ جوتیاں چٹخاتے پھرو مگر کان کھول کر سن لو کہ اب مجھ سے کبھی اپنی بے روزگاری کا رونا رونے نہ بیٹھنا۔ ہم نے خوشامد سے سبحانی کو مناتے ہوئے کہا: بھئی خفا نہ ہو، تم کو کیا معلوم کہ تمھاری اس ہمدردی کا میرے دل پر کتنا اثر ہے۔ مگر میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آخر ان نواب صاحب کے کہیں آس پاس بھی شاعری ہے یا میں اصلاح ہی دوں گا۔ جو شخص تخلص اور لقب تک کی تمیز نہ رکھتا ہو وہ کیوں کر شاعر بن سکتا ہے۔ جس کو شعر سننا نہ آتا ہو وہ شعر کیونکر کہہ سکے گا۔ سبحانی نے ڈانٹا پھر وہی! میں پوچھتا ہوں تم کو آم کھانے سے مطلب ہے یا تم پیڑ گننے آئے ہو؟ تمھاری بلا سے وہ شاعر بنیں یا نہیں بنیں۔ کھیل تو تمھارا یہی ہے کہ تم ان کو اسی مغالطہ میں

رکھو کہ وہ شاعر بن گئے۔ بھائی تم نوکری کرنے آئے ہو، کچھ نہ کچھ تو قیمت دینا ہی پڑتی ہے آخر۔ اب اگر اس نازک مزاجی سے کام لو گے تو کر چکے تم نوکری۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عیش کرو گے عیش یہاں۔ اور اگر ذرا عقل مندی سے کام لیا تو یہ سب بے وقوف تمھاری مٹھی میں رہیں گے۔

طبیعت کسی طرح گوارا نہ کرتی تھی مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ روزگار کی اور کوئی صورت بھی نہ تھی۔ ایک طرف اگر یہ صحبت ناجنس تھی تو دوسری طرف بے فیض ہم جنس جن میں سے ہر ایک قحط زدہ فاقہ مست۔ آخر ہم نے سبحانی سے کہلایا کہ اچھا بھئی مقدر آزمائیں گے یہاں بھی، جاؤ کہہ دو نواب صاحب سے کہ ہم راضی ہیں۔

سبحانی نے پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا: یہ پس و پیش نہایت احمقانہ تھا۔ ظاہر ہے کہ بے وقوف تو ہوتے ہی ہیں یہ لوگ، اور خوش نصیب ہے وہ جس کو بنے بنائے پھلکے مل جائیں۔ تم کو تو چاہیے کہ نواب کو ایسا اپنے شیشہ میں اتارو کہ پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں۔ آؤ بس یہ ٹھیک ہے اور میں نے بھی کچھ سمجھ کر ہی یہ صورت پیدا کی ہے۔

سبحانی صاحب نے اسی وقت نواب صاحب سے جا کر کہلایا کہ تمام معاملات طے پا گئے اور چاتو صاحب اسی وقت سے اب آپ کے یہاں رہیں گے۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب نے خدمت گار کو مٹھائی اور پھول پان لانے کا حکم دیا تا کہ شاگردی استادی کی رسم ادا ہو جائے اور ہم سے کہا: استاد اب کوئی اچھا سا۔ وہی کیا نام اس کا تلقب۔ سبحانی صاحب نے بات کاٹ کر کہا: آپ کا مطلب ہے تخلص، استاد صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ نواب صاحب کے لیے تخلص سلیم اچھا رہے گا۔

نواب صاحب نے چونک کر کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہماری چھوٹے بھائی کے بیٹے کا نام ہے۔

ہم نے کہا: دیوان حافظ سے تخلص نکالا جائے آپ کے لیے؟

نواب صاحب نے تعجب سے پوچھا، کون سے دیوانے حافظ؟ حافظ عبدالشکور تو نہیں۔ وہ تو آج کل باہر ہیں۔

سبحانی صاحب نے کہا: کیوں استاد صاحب، جام کیسا رہے گا؟

نواب صاحب نے اچھل کر کہا: بھئی یہ ٹھیک ہے۔ کیوں استاد یہ بڑا بانکا تخلص ہے: جام

ہم نے عرض کیا: بالکل ٹھیک نہایت اچھا تخلص ہے اور بڑا مبارک ہے۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا کہ تو اب ہمارا پورا نام ہوا نواب زادہ جہانگیر خاں جام، مزا آ گیا یار۔

اس عرصہ میں ملازم مٹھائی اور پھولوں کے ہار لے کر آ گیا۔ نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہمارے گلے میں ہار ڈالا اور ہم نے اپنے ہاتھ سے نواب صاحب کو مٹھائی اور قند دیتے ہوئے کہا: خدا آپ کو شیریں کلام بنائے۔

حاضرین نے "آمین" کا نعرہ کورس میں بلند کیا اور سب نے نواب صاحب کو مبارک باد دی۔ نواب صاحب نے اسی وقت اپنے گلے سے سونے کا ہار اتار کر ہماری خدمت میں پیش کر دیا ساتھ میں ایک قلمدان بھی مرحمت فرمایا اور کہا: لو استاد یہ استادی کا قلمدان۔ اب ہم شاگرد اور تم استاد۔ اب لگے ہاتھ ایک مشاعرہ تو کرا ڈالو جلدی سے جیسا نواب صادق خاں عباسی کے یہاں ہوا کرتا ہے۔

اب سمجھ میں آئی اس شاعری کے شوق کی وجہ کہ یہ

سب کچھ نواب صاحب صادق خاں عباسی کی چوٹ پر ہو رہا ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا صاحب ذوق رئیس دن رات اس کے یہاں یہی علمی ادبی چرچے۔ اچھا خاصا شعر وہ خود کہتا ہے آپ چلے ہیں، اس کی نقل اتارنے۔ مگر اب تو کرنا ہی تھا مشاعرہ۔ اخراجات کی منظوری لی جو نہایت دریا دلی سے دی گئی۔ طرح مقرر کی۔ دعوت نامے چھپوائے۔ شعرائے کرام سے وعدے لیے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے نواب صاحب کے لیے بھرپور غزل کہی۔ مگر خدا جانتا ہے کہ غزل کہنے میں اتنی محنت نہیں پڑی جتنی محنت نواب صاحب کو پڑھنے کی مشق کرانے میں کی۔ ضد یہ تھی کہ گا کر پڑھوں گا اور عالم یہ کہ ایسے بے سُرے سے بھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

بمشکل تمام ایک ہفتہ تک شب و روز محنت کر کے موزونیت، تلفظ اور لے کی طرف سے تو تھوڑا بہت اطمینان ہو گیا مگر آواز تو ظاہر ہے کہ جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ اس ایک ہفتہ میں معلوم یہ ہوتا تھا کہ اچھے خاصے بینڈ ماسٹر ہو کر رہ گئے ہیں۔ نواب صاحب غزل پڑھ رہے ہیں اور ہم ان کے سامنے کھڑے ہوئے اتار چڑھاؤ سمجھا رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے مشاعرے کی رات آئی۔ نواب صاحب کی کوٹھی پر جشن کا سماں تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب دولہا بنے بیٹھے ہیں۔

شہر کے تمام اعلیٰ حکام، رؤسا اور شعراء میں سے تمام نامی گرامی شاعر محفل میں موجود تھے۔ مشاعرہ شروع ہو گیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ اُس وقت تک جاری رہا جب تک شمع محفل نواب صاحب کے سامنے نہیں آئی۔ اب جو ہمارے خداوند نعمت کی باری آئی تو ایک تو جناب کی قطع اُس پر سے گھبراہٹ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ طرز بھول گئے جو صاحب پہلے

کیا زندگی انتظار ہے!

شاید زندگی کے گزر جانے یا موت کے آنے تک ہر شخص انتظار میں ہے۔ کوئی خوشی کے انتظار میں اور کوئی دکھ کے انتظار میں، کوئی کامیابی کی راہ دیکھتا ہے اور کوئی ناکامی کے اندیشے میں انتظار کی صعوبت برداشت کر رہا ہے۔ کوئی اپنے منصوبوں کے مکمل ہونے کے انتظار میں ہے اور کوئی دوسروں کے منصوبوں پر پانی پھیرنے کے۔ کہیں بارش کا انتظار ہے اور کہیں اس کے رک جانے کا، کہیں دھوپ نکلنے کا اور کہیں بادل چھا جانے کا، کہیں انتظار دن کے طلوع کا ہے اور کہیں اس کے ڈھل جانے کا، کوئی گھر سے باہر نکلنے کو بے تاب ہے اور کہیں کوئی داخل ہونے کی تلاش میں، کوئی ملازمت مل جانے کے انتظار میں ہے اور کوئی اس سے الگ ہونے کو تیار......

ہر ہر لمحہ محنت ہے، کوشش ہے، جدوجہد ہے اور پھر اس کے نتیجے کا انتظار...... اگر محنت اور کوشش نہ ہو تو انتظار بھی ختم ہو جاتا ہے اور محنت و کوشش کا نہ ہونا جمود کی علامت ہے اور جمود موت ہے...... زندگی کے لیے حرکت چاہیے، ہر شے مصروف عمل ہے، سرگرداں ہے، تلاش میں ہے، انتظار میں ہے...... اپنی منزل کے کنارے کے، اپنے ساحل کے، اپنی بلندی کے، اپنی کامیابی کے انتظار میں۔ منزل تب ہی ملتی ہے جب اپنا آپ فنا کر دیا جائے، جب قطرہ سمندر میں مل جائے اور ذرہ ریت کا ہمسفر ہو جائے۔ اپنا آپ مٹا کر انتظار شوق کی آگ میں جلے اس مقام تک جا پہنچیں جو "مقام عبودیت" ہے۔ بندہ ہونے کا حق ادا ہو جائے اور پھر انسان اپنے ہر انتظار سے آزاد ہو جائے۔

(نبیلہ اقبال)

پڑھ رہے تھے، اُن ہی کی دھن میں شروع ہو گئے اور وہ بھیانک آواز نکالی ہے کہ لاکھ ضبط سے کام لیا پھر بھی لڑکوں کی ہنسی نہ رکی۔ بمشکل تمام اس طوفان کو رکوایا تو کسی بدتمیز سخن فہم نے داد دیتے ہوئے کہہ دیا کہ کیا کہنا ہے چچا تو صاحب، رنگ چھپائے نہیں چھپتا۔ لاکھ عقل کے نیلام کنندہ سہی مگر یہ چوٹ سمجھ گئے اور بگڑ گئے۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ بحیثیت استاد کے آخر میں جو غزل ہم نے پڑھی تو وہ اتفاق سے خوب چلی چھتیں اڑ گئیں۔ دھویں پار ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مشاعرہ تو خیر ختم ہو گیا مگر شامت آئی ہماری۔ فوراً طلبی ہوئی اور اب جو دیکھتے ہیں تو نواب صاحب پھولے سوجے بیٹھے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی برس پڑے، کیوں صاحب یہی ہے آپ کی وفاداری کہ آپ نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔

آپ کا قصور نہیں یہ خطا ہے میرے نمک کی، میرا مذاق اڑوایا۔ لوگوں سے کہتے پھرے کہ میں نے غزل لکھ کر دی ہے۔

عرض کیا: توبہ توبہ! بھلا یہ کیونکر ممکن تھا مجھ سے یہ آپ سے کس نے کہا۔

نواب صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا: کہتا کون! میں نے خود سنا کہ لوگ آپ سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ رنگ چھپائے نہیں چھپتا۔ اس کا کیا مطلب تھا، آخر پھر یہ کہ اپنی غزل ایسی عمدہ بنائی اور میری ایسی پھسپھسی۔

عرض کیا: یہ بھی حضور والا کا خیال ہے کسی سخن فہم کے سامنے دونوں غزلیں رکھ دیجیے کہ کون سی غزل اچھی ہے۔ میں نے تو خود غزل کے اچھے اچھے شعر آپ کے لیے نکال دیے تھے اور کمزور شعر اپنے لیے رکھ لیے تھے۔

نواب صاحب نے کہا: یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، یہ بات ہوتی تو آپ کی غزل کیوں اُچھلتی اس قدر اور میری غزل کا کیوں مذاق اڑتا اتنا؟

اب یہ بات نواب صاحب کو کیونکر سمجھائی جا سکتی تھی کہ مذاق غزل کا نہیں بلکہ خود آپ کا اڑا ہے۔ آخر عاجز آ کر عرض کیا، بہر حال آئندہ سے میں خود مشاعرے میں غزل نہ پڑھوں گا۔

غالباً نواب صاحب یہی چاہتے تھے، سمجھاتے ہوئے بولے اب دیکھیے نا آپ کو تنخواہ اسی بات کی تو ملتی ہے کہ ہم نے آپ کی شاعری کو گویا خرید لیا ہے۔ آپ نے کسی درزی کا کام کرنے والے کو یہ نہ دیکھا ہوگا کہ وہ خود درزی کا لباس پہنے۔ آپ نے کسی دھوبی کو نہ دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے کپڑوں پر استری کر کے پہنے اور گاہکوں کے کپڑے رہنے دے۔ آپ نے کسی بڑھئی کو نہ دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے لیے میز کرسیاں بنائے۔ یہ سب کچھ وہ بناتے ضرور ہیں مگر بیچنے کے لیے، اسی طرح کے آپ بھی کاریگر ہیں۔ آپ بھی شعر بنائیے مگر اپنے لیے نہیں۔ اب خود اپنا شاعر ہونا بھول جائیے۔

نتیجہ یہ کہ اب ہم کو شعر گوئی کی قطعاً اجازت نہیں جو کچھ کہیں وہ سب نواب صاحب کا۔ گویا ہم استادی اداکاری کرتے کرتے اپنی شاعری سے ہی گئے۔

ہمیں خود نہ کسی مشاعرے میں شرکت کی اجازت ہے نہ کسی رسالے میں کلام بھیجنے کا اختیار۔ البتہ شعر ہم کہتے رہتے ہیں دن رات اور خدا کے فضل سے نواب صاحب کا چوتھا دیوان آج کل پریس میں ہے۔ اس دیوان کے ہر مصرعہ کے اعداد نکالنے سے ہماری تاریخ وفات نکلتی ہے، ویسے خدا نے ہمیں یہیں جنت نصیب کر رکھی ہے۔

■■■

مشورہ حاضر ہے

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صفیرہ بانو شیریں

چہرے کے مسام

میرے چہرے کا یہ مسئلہ ہے کہ مسام کھلے ہیں۔ اس کی وجہ سے چہرہ عجیب سا لگتا ہے۔ پتا نہیں یہ مسام کیوں پھیل جاتے ہیں؟ اس کے بارے میں بتائیں۔

(مہناز اسلم)

چہرے کی صفائی کی طرف لاپرواہی برتنے سے یہ مسئلہ پیش آتا ہے۔ خواتین میک اپ کرتی ہیں مگر رات کو وہ منہ دھو کر چہرہ صاف کر کے نہیں سوتیں۔ اسی طرح کچھ لڑکیوں کو اخبار میں اشتہار پڑھ کر نت نئی کریمیں آزمانے کا شوق ہوتا ہے۔ رنگ گورا کرنے، داغ دھبے دور کرنے، حسن قائم رکھنے کے لیے وہ تجربے کرتی رہتی ہیں۔ گرمی کا موسم ہو یا سردی کا۔ آپ جب بھی میک اپ کریں، اسے بعد میں صاف کرنا نہ بھولیں۔ کچھ خواتین چکنائی کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔ تیل، گھی، چکنی چیزیں، مقدار میں کم سے کم استعمال کریں۔ چہرے پر میک اپ کریے، مگر زیادہ مقدار میں نہ تھوپیے۔ اسی طرح زیادہ فیس پاؤڈر لگانے سے بھی مسام پھیل جاتے ہیں۔ جب بھی کسی پارٹی یا دعوت سے گھر آئیں تو کپڑے بدلنے کے بعد سب سے پہلے میک اپ اتاریے۔ منہ دھوئیے۔ آپ کی یہ چھوٹی چھوٹی احتیاطیں مسام پھیلنے نہیں دیں گی۔

فریج میں کھیرا رکھیے، اس کا چھوٹا ٹکڑا کاٹ کر کدوکش کر لیجیے۔ اس میں چھ قطرے لیموں کا رس ملائیے اور چہرے پر لگا کر پندرہ منٹ کے لیے لیٹ جائیے۔ کھیرے کا رس چہرے کی جلد میں آہستہ آہستہ جذب ہو گا اور لیموں کا رس اچھی طرح صفائی کرنے میں معاون ثابت ہو گا۔ کھلے مسام بند ہوں گے۔

چہرے کا مسئلہ

میرے چہرے پر دانے ہیں۔ کوئی بھی کریم استعمال نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے بتائیں۔ اصل میں یہ دانے بھی کریموں کے استعمال سے نکلے ہیں اور اب یہ حال ہے کہ میں چہرے پر کچھ نہیں لگا سکتی۔

(شاہینہ رحمان)

تھوڑا سا دہی لے کر چہرے پر لگائیں دس منٹ بعد منہ دھو لیجیے۔ کافی فرق پڑے گا۔ تین دن کے بعد ٹماٹر کا قتلہ باریک کاٹ کر چہرے پر لگائیے۔ ٹماٹر سرخ ہونا چاہیے۔ ٹماٹر کیل مہاسوں داغ دھبوں کو دور کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ آپ ہمدرد مطب کی صافی منگا کر دو تین بوتلیں پی لیجیے تاکہ خون صاف ہو اور آئندہ دانے نہ نکلیں۔ کسی طرح کی اشتہاری کریم استعمال نہ کریں۔

ابٹن

میری بہن کا رنگ ذرا سانولا ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ کوئی آسان سا ٹوٹکہ بتائیں جسے ہم گھریلو طور پر استعمال کر سکیں اور مہنگا بھی نہ ہو۔

(سعدیہ ناز)

کینو کے چھلکے سکھا کر پیس لیں۔ آٹھ کینو کے چھلکے ہوں تو آپ اسی میں چار لیموں کے چھلکے بھی سکھا کر پیس لیں۔ چمچ بھر سفوف آپ گلاب کے عرق میں بھگو دیں۔ جب پھول جائے اس میں تھوڑا سا بیسن ملا کر چہرے پر اچھی طرح ملیں۔ آپ کی جلد خشک ہے تو اس میں تھوڑا سا بادام یا زیتون کا تیل ملا لیں اور دو تین قطرے شہد کے، آپ اسے اچھی طرح مل کر خشک کر کے اتار لیں۔ اسی طرح اگر آپ ایک مٹھی بھنے چنے کی دال اور دو بادام رات کو دودھ میں بھگو دیں۔ صبح اس میں کینو والا سفوف آدھا چمچ ملا کر پیس کر چہرے پر لگائیں۔ ابٹن کی طرح مل کر اتار دیں جب بھی فائدہ ہو گا۔

جئی کا دلیہ

میری بہن کا آپریشن ہوا ہے۔ وہ بہت چڑچڑی ہو گئی ہے۔ اس کی غذا میں کیا شامل ہو جس سے اس کا غصہ اور چڑچڑاپن دور ہو جائے۔

(ارم کنول)

آپریشن کے بعد جئی کا دلیہ صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ دودھ میں بنا کر ایک چمچ شہد ڈال کر ناشتے میں روز دیں اور دو کیلے ان کی غذا میں شامل کریں۔ جئی کا دلیہ ان کے مزاج میں تبدیلی لائے گا اور کیلے ان کو طاقت توانائی دیں گے۔ آپریشن کی وجہ سے خون کی کمی کی وجہ سے بھی جسم میں جو کمی محسوس ہوتی ہے وہ بھی دور ہو جاتی ہے۔

تیل

بالوں کے لیے کون سا تیل اچھا ہے۔ سرسوں کا تیل، زیتون کا تیل یا کوئی اور تیل؟

(احسان رشید)

سرسوں کا تیل بالوں میں لگایا جائے تو بال دیر تک رہتے اور گھنے ہوتے ہیں۔ سرسوں کا تیل غذائیت بھی دیتا اور کولیسٹرول کو بھی قابو میں رکھتا ہے۔ زیتون کا تیل مہنگا ہے، اس لیے عام لوگ اسے

خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ بنگال میں ناریل کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ بالوں میں تیل ضرور لگانا چاہیے۔ اس سے بال مضبوط اور سیاہ رہتے ہیں۔ خشکی، سکری بھی نہیں ہوتی۔ آپ کو سرسوں کا تیل مل جائے تو وہ ضرور استعمال کریں۔

منہ کی بدبو

میری بہن ماؤتھ واش بھی کرتی ہے پھر بھی منہ سے گندی سی بدبو آنے کا احساس رہتا ہے۔
(سعیدہ)

قبض کی وجہ سے بعض دفعہ یہ مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اپنی بہن سے کہیے کہ وہ ایسی چیزیں کھائے جس سے قبض نہ ہو۔ شلجم پالک، مولی پالک، سرسوں کا ساگ اور گاجر جیسی ریشہ دار غذا کھائیں۔ تلی ہوئی اور بیکری کی چیزوں سے پرہیز کریں۔ میدے کی بنی ہوئی چیزوں سے بھی پرہیز کریں۔ انجیر کھانے سے بھی قبض دور ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ہونے والی تکالیف بھی دور ہو جاتی ہیں۔ میتھی دانہ جسے میتھرے کہتے ہیں، چائے کا ایک چمچ بھر کر پانی میں پکائیں۔ میتھی دانے کی چائے پینے سے منہ کی بدبو دور ہو جاتی ہے۔ چھوٹی الائچی، بھنی ہوئی سونف، ہلکا سا بھونا ہوا ناریل کاٹ کر ملا کر رکھ لیں۔ اس میں تھوڑی سی چینی ملا دیں۔ اس کے کھانے سے بھی منہ کی بدبو کم ہو جاتی ہے۔ کھانے کے بعد برش ضرور کریے تا کہ کھانے کے ذرات دانتوں میں نہ پھنسے رہیں اور بدبو پیدا نہ ہو۔

ہیئر کلر سے خارش

میں اپنے بالوں کو رنگتی ہوں۔ دو تین ماہ سے میرے سر میں خارش ہو رہی ہے۔ بالوں کے رنگنے کے بعد یہ بڑھ جاتی ہے۔ خارش کر کے میرے ماتھے پر بھی نشان پڑ جاتے ہیں۔ جو بہت برے لگتے ہیں۔ کیا کرنا چاہیے؟
(شاکرہ نسیم)

آج کل ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ جو ہیئر کلر خرید رہی ہیں وہ بھی جعلی ہو۔ اچھی طرح چیک کریے اور کسی اچھی دکان سے خریدیے۔ دوسری بات یہ کہ سر کے بالوں میں تیل ضرور لگایے اور اپنی غذا کا جائزہ لیجیے۔ دوپہر ایک بڑی پلیٹ سلاد کی ضرور کھائیں۔ اس میں سیب اور بند گوبھی، کھیرا، گاجر سلاد کے پتے، شملہ مرچ کاٹ کر ملایے اور پانی دن میں زیادہ سے زیادہ پینے کی کوشش کریں۔ جب بھی کلر لگائیں، پیشانی پر ہلکا سا تیل یا کریم ضرور لگائیں تا کہ ہیئر کلر پیشانی پر رنگ کے داغ نہ ڈالے اور خارش بھی نہ ہو۔ اسی طرح زیادہ ہیئر ڈرائر استعمال کرنے سے بھی بال خشک ہوتے ہیں۔ خارش ہونے لگتی ہے۔ تیز دھوپ سے گرد و غبار سے چولھے کی تپش سے بھی بالوں میں خارش ہوتی ہے۔ بالوں کو دوپٹے سے اسکارف سے ڈھانک کر رکھیں۔ باورچی خانہ میں بھی آپ بال باندھ کر دوپٹہ یا اسکارف لے سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کے بال گرمی سے محفوظ رہیں گے۔

■■■

ستار طاہر کو گئے 20 سال بیت گئے

دوستوں نے بھلا دیا پڑھنے والوں نے یاد رکھا

سید اسحاق کاظمی

ستار طاہر اردو ادب اور صحافت کا ایک بڑا نام ہے۔ ادب اور خصوصاً صحافت کے ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے رہے سے مجھے ستار طاہر کے کام سے یک گونہ دلچسپی رہی ہے۔ تاہم ستار طاہر کو میں نے دیکھا نہیں، میری ان سے شناسائی ان کی تخلیق کردہ تحریروں کے ذریعے سے ہے۔ جن کی تاثیر نے مجھے ان کا گرویدہ بنا لیا۔ میری ان سے پہلی غائبانہ ملاقات "دنیا کی سو عظیم کتابیں" کے توسط سے ہوئی جو ان کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد تو گویا مجھ پر آگاہی و شعور کے کئی دریچے کھلتے چلے گئے۔

یہ بات بلاخوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر اردو میں لکھے گئے ترقی پسند ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے 250 کتابیں تصنیف کیں جن میں مارشل لا کا وائٹ پیپر، اگر مجھے قتل کیا گیا، زندہ بھٹو مردہ بھٹو، آخری بیان، عشق اور پھیکا، اپنا قائداعظم ایک، پاکستان کا مستقبل، غریب کی جورو اور سیرت النبی ﷺ پر مبنی کتاب "اک عالم ہے ثناخواں آپ ﷺ کا" شامل ہیں جب کہ پنجابی زبان میں ان کا ناول "سیر پکا دل" بے حد مقبول ہوا۔ ستار طاہر نے شخصی کردار نگاری کے مجموعے سمیت کئی فلموں کی کہانیاں بھی پھر قلم کیں۔ جیسے وعدے کی زنجیر، انسان اور گدھا اور میرا نام ہے محبت مشہور ہیں۔ ستار طاہر نے مترجم اور محقق کی حیثیت سے اپنی امتیازی شناخت قائم کی۔ ستار طاہر نے اپنی تحریروں میں انسانی اقدار کی سربلندی و سرخروئی، احترام آدمی، حق آزادی رائے و حق تحریر و تقریر، انسان کی عزت اور معاشرے کی ناہمواریوں کو موضوع بنا کر اجتماعی اور انفرادی انسانی صورت حال کے جس قدر حقیقت پسندانہ تجزیے کیے ہیں وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ ستار طاہر ایسے ایسے حقائق منظر عام پر لائے جن کے ذکر تک سے زبان قلم پر آبلے پڑ جاتے تھے۔

مجھے ستار طاہر کا ایک فن بہت نمایاں نظر آیا۔ ان کے ترجمہ کرنے کا کمال تھا، جس روانی، خوبصورتی اور بہترین الفاظ کے چناؤ کے ساتھ وہ ترجمہ کرتے تھے کہ پڑھنے والے کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی اور زبان کی کتاب کا لطف اٹھا رہا ہے۔ مجھ میں تجسس کا جذبہ موجود ہے سو میں ستار طاہر کی شخصیت کے متعلق مزید جاننے اور اپنی معلومات میں اضافے کے لیے ان کے

قریبی رفقاء سے ملا جن میں ڈاکٹر کنول فیروز، ڈاکٹر سلیم اختر، اعتزاز احسن، افتخار عارف، مجیب الرحمن شامی اور ڈاکٹر مبشر حسن شامل ہیں۔ کسی نے ستار طاہر کو قلم کا مزدور، کسی نے جینیئس (Genius) کسی نے آئنس برگ سے ان کو موسوم کیا۔ جب کہ ان کے کئی چاہنے والوں نے اس قلق کا بھی برملا اظہار کیا کہ ستار طاہر کی قدر ان کی پسندیدہ پارٹی کے احباب نے بھی کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ اس کی یادداشت بہت غضب کی تھی۔ ہم مشکل سے مشکل چیز یا پرانی سے پرانی بات پوچھ کر اس کی یادداشت اور ذہانت کو آزمایا کرتے تھے۔ اعتزاز احسن نے کہا کہ ستار طاہر اپنے قلم کا وفادار تھا۔ اس نے سچ لکھا اور اپنی مرضی سے لکھا، کسی غرض کے بغیر لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں کئی مرتبہ مشکلوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کلمہ حق کہنا جاری رکھا۔ ستار طاہر نے جمہوریت کا علم بلند کرنے کے لیے پیپلز پارٹی کو اپنے قلم کے ذریعے اعتماد بخشا اور حریف رہنماؤں سے ملنے والی کئی پرکشش آفرز کو سختی سے مسترد کر دیا۔ ستار طاہر نے بیشتر رسائل و جرائد کی ادارت بھی کی جن کا مطالعہ کرنے سے مجھ پر آشکار ہوا کہ ستار طاہر کے دور ادارت میں یہ رسائل و جرائد اپنی مقبولیت کے عروج پر رہے۔ ان میں سیارہ ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ، ویمن ڈائجسٹ، حکایت، کتاب، قافلہ اور قومی ڈائجسٹ سمیت کئی دوسرے شامل ہیں۔ مجھے ستار طاہر کے گھر جانے اور ان کے اہل خانہ سے ملنے کا بھی اتفاق ہوتا ہے۔ ستار طاہر کے گھر میں آج بھی ان کی لائبریری موجود ہے جس میں ان کی جمع کردہ ان گنت کتابیں کسی انمول خزانہ کی طرح محفوظ ہیں۔

مسز ستار طاہر بتاتی ہیں کہ بیس سال گزر جانے کے بعد بھی لائبریری میں ہر کتاب اور ہر چیز اسی حالت میں موجود ہے جیسی ستار طاہر چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کی رائٹنگ ٹیبل، رائٹنگ پیڈ، ان کا قلم، ان کی عینک، ان کی تسبیح اور کلائی کی گھڑی حتیٰ کہ ایش ٹرے میں سگریٹ ویسے ہی پڑے ہیں۔ لکھنا پڑھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، کتابیں خریدنا ہی ان کی شاپنگ ہوتی تھی۔ زمانے کی گرد کے 20 برس بعد بھی لائبریری میں قرینے سے سجی دنیا بھر کے ادب سے مزین یہ کتابیں ستار طاہر مرحوم کی حقیقی کتاب دوستی اور لکھے لفظوں سے عشق اور ان کی اہلیہ کی اپنی شوہر سے عقیدت اور کتاب سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہی لائبریری ان کی جان لینے کا بھی باعث بنی۔ ان کی بڑی بیٹی کی شادی کے موقع پر وسائل کی کمی آڑے آئی تو انھوں نے کوئی راہ نہ پا کر اپنی قیمتی ترین کتابوں کا ایک قابل قدر حصہ فروخت کر دیا۔ یہی صدمہ جان لیوا ثابت ہوا اور دل کے دورے سے جاں بر نہ ہو سکے۔ انہوں نے بھی کیا قسمت پائی دوستوں نے بھلا دیا پڑھنے والوں نے یاد رکھا۔

■■■

سید اسحاق کاظمی پیشے کے لحاظ سے الیکٹریکل انجینیئر ہیں اور روشن ہیکر، میں کام کرتے ہیں۔ ستار طاہر کی تحریروں کی محبت نے انھیں اسی گھر کا حصہ بنا دیا۔ ان کی تحریر ایک قاری کا ایک لکھاری کو خراج تحسین ہے، نہ کہ کسی داماد کے لئے سسر کو یاد کرنے کا بہانہ جسے دیکھا بھی نہ ہو۔

حوالہ میری پسند کا

انٹرویو: نوید غازی

آج کے مہمان شاعر

نوید رضا

میں 4 فروری 1970ء کو شیخوپورہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم شیخوپورہ سے ہی حاصل کی اور ساری زندگی وہیں رہا۔ 198 میں فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کیا۔ 1985ء میں ٹک بندی شروع کر دی تھی جبکہ 1987ء سے شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا اور شاعری کی نشستوں اور حلقوں میں آنا جانا شروع کیا۔ 1990ء میں کالج کے زمانے میں "نقوشِ ادب" کے نام سے تنظیم بنائی جس کا نام 1996ء میں تبدیل ہو کر "نور پنچھ" کر دیا گیا جو اب تک شیخوپورہ کی سب سے فعال ادبی تنظیم ہے۔ 1995ء میں ایم اے اردو کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پہلے جی پی او شیخوپورہ میں 1990ء سے 200 تک ملازمت کی اور بعد ازاں ملازمت کے سلسلے میں لاہور آیا اور یہیں کا ہو رہا۔ 2006ء میں لاہور سیکرٹریٹ میں جونیئر کلرک آیا اور بعد ازاں بطور سیکشن اسسٹنٹ کے طور پر مختلف محکموں میں رہا اور آج کل محکمہ ہائر ایجوکیشن میں ہوں۔ حال ایک ہی کتاب "گرہ میں شام" کے عنوان سے چھپی ہے جو 2001ء میں منظر عام پر آئی۔ میں نے بہت سے ملکی مشاعروں میں شرکت کی اور بہت داد سمیٹی۔

مجھے بہت مشکل زندگی ملی ہے۔ شاعرانہ مزاج ایک بہت بڑی دشواری ہوئی ہے۔ ان پہ بہت سے مسائل نے زندگی کو گھیرے رکھا ہے اور فزیکلی ہینڈی کیپڈ ہونے کی وجہ سے مسائل اور دو چند ہوتے چلے گئے۔ زندگی میں غربت بہت دیکھی ہے۔ زندگی کو اگر ایک لفظ میں بیان کروں تو یہ صرف ایک جدوجہد کا نام ہے جس میں میں ابھی تک لگا ہوا ہوں۔ شاعری نے اس قابل بنایا کہ اپنا سامنا کر سکوں۔

جدا ہوئے تو جدائی میں یہ کمال بھی تھا
کہ اس سے رابطہ ٹوٹا بھی تھا بحال بھی تھا

وہ جانے والا ہمیں کس طرح بھلائے گا
ہمارے پیشِ نظر ایک یہ سوال بھی تھا

یہ اب جو دیکھ رہے ہو یہ کچھ نیا تو نہیں
یہ زندگی کا تماشا گزشتہ سال بھی تھا

یہ داغ لکھا تھا سیلاب کے مقدر میں
مرا مکان تو پہلے سے خستہ حال بھی تھا

نوید ترکِ تعلق پہ خوش تو تھے لیکن
جو سچ کہیں تو طبیعت میں کچھ ملال بھی تھا

ویسے تو شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے جن سے ایک گہرا لگاؤ ہے مگر میں جن شاعروں سے بہت متاثر ہوا ان کا کچھ تعارف اور کلام حسب ذیل ہے۔

مرزا اسد اللہ خان غالب کا انداز اور اشعار اس قدر منفرد ہیں کہ آج تک ایسا شاعر کہیں ابھر ہی نہیں سکا۔ غالب کے مصرعے میں غالب ہی کے اسلوب کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ غالب سب پر غالب ہے۔ غالب مجھے بہت پسند ہے۔ ذیل میں غالب کی ایک پسندیدہ غزل پیش خدمت ہے۔

ناصر کاظمی اداسی کا شاعر ہے۔ اداس رتوں سے اداسی کشید کر کے شعروں میں بھرنے کا ہنر ناصر کاظمی سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ ناصر کاظمی نے غزل کے پیکر کو وہ روپ عطا کی ہے جس سے اس کا وجود بہت روشن اور دلکش دکھائی دینے لگا ہے۔ جدائی کے استعارے ہوں یا ہجر کی کہکشاں، ناصر کاظمی کے ہاں جذبات کی حدت اتنی ہے کہ اشعار سیدھے قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بہ دم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرہ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ غالب! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

نیت شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں
آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں
نہ ملا کر اداس لوگوں سے
حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں
آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں
جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں
آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصر
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

منیر نیازی طلسماتی اور پراسرار شاعر ہیں۔ ان کی کیفیات مجھے بہت جکڑتی ہیں میں بہت دیر تک بے بسی کے عالم میں ان میں کھویا رہتا ہوں۔ منیر نیازی کے ہاں جو کیفیات ملتی ہیں ان میں ایک عجیب طلسم ہوتا ہے اور بہت زور دار اثر کے ساتھ قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔ منیر نیازی واقعی بہت بڑے شاعر ہیں۔

مسعود عثمانی کا دور حاضر کے نمائندہ شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے ہاں زبان کی خوبصورتی، نفاست اور سلیقہ ہے جو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ دوسری بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ ان کے مضامین میں بہت انفرادیت ہے۔ ان کا اسلوب جدید تقاضوں کے ساتھ ساتھ کلاسیکل انداز فکر لئے ہوئے ہے۔

سفر میں ہے جو ازل سے یہ وہ بلا ہی نہ ہو
کواڑ کھول کے دیکھو کہیں ہوا ہی نہ ہو
نگاہ آئینہ معلوم، عکس نامعلوم
دکھائی دیتا ہے جو اصل میں چھپا ہی نہ ہو
زمیں کے گرد بھی پانی، زمیں کی تہ میں بھی
یہ شہر جم کے کھڑا ہے جو تیرتا ہی نہ ہو
نہ جا کہ اس سے پرے دشت مرگ ہو شاید
پلٹنا چاہیں وہاں سے تو راستہ ہی نہ ہو
میں اس خیال سے جا ہی نہیں وطن کی طرف
کہ مجھ کو دیکھ کے اس بت کا جی برا ہی نہ ہو
کٹی ہے جس کے خیالوں میں عمر اپنی منیر
مزا تو جب ہے کہ اس شوخ کو پتا ہی نہ ہو

اب بھی وہ ہمیں ملا کہاں ہے
دیوار وصال درمیاں ہے
یہ شہر بلندیوں سے دیکھو
دریائے رواں رواں رواں ہے
دل بات کرے تو لب نہ بولیں
یہ کیسا عذاب جسم و جاں ہے
الفاظ بھی زخم بن چکے ہیں
اظہار بھی تیغ بے اماں ہے
اک عمر تری تلاش کے بعد
میں ہوں، مری عمر رائیگاں ہے
ہر سو تجھے ڈھونڈتی ہیں آنکھیں
تو ہے تو کہیں، مگر کہاں ہے
دل سے تری یاد اتر رہی ہے
سیلاب کے بعد کا سماں ہے
اب آگ یہ [illegible] جم چلی ہے
یہ وقت سخن کا امتحاں ہے
صحرائے سکوت جاں کے اس پار
آواز کا شہر بیکراں ہے

شاہین عباس کا شمار بھی دورِ حاضر کے اہم نوجوان شعرا میں ہوتا ہے۔ شاہین کا اسلوب اس قدر جدا ہے کہ یہ بالکل الگ نظر آجاتے ہیں۔ ان کے کلام کی زرخیزی اور معنویت اور ان کا خاص اسلوب مجھے بہت متاثر کرتا ہے۔

اکبر معصوم سانگھڑ سے تعلق رکھنے والے بہت ہی خوبصورت شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں گہرا احساسِ زندگی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ آپ بھی پڑھئے ان کے گھر سے بہت دور پائیں گے۔

کچھ بھی نہ دکھائی دے تب دیکھتا ہوں میں
پھر بھی یہ خوف سا ہے کہ سب دیکھتا ہوں میں
آنکھیں تمہارے ہاتھ پہ رکھ کر میں چل دیا
اب تم پہ منحصر ہے کہ کب دیکھتا ہوں میں
آہٹ عقب سے آئی اور آگے نکل گئی
جو پہلے دیکھتا تھا وہ اب دیکھتا ہوں میں
یہ وقت بھی بتاتا ہے، آدابِ وقت بھی
اس ٹوٹتے ستارے کو جب دیکھتا ہوں میں
اب یاں سے کون دے مری چشمِ طلب کو داد
جس فاصلے سے داوِ طلب دیکھتا ہوں میں
ان چہروں کا قرض چکاتا ہوں کیا کروں
جس دل سے دل ملاتا ہوں جب دیکھتا ہوں میں
ناکامِ عشق ہوں، سو مرا دیکھنا بھی دیکھ
کم دیکھتا ہوں اور غضب دیکھتا ہوں میں

ہے اب گواہ مری خاک پر لہو میرا
کہ میرے بعد نہیں ہے کوئی عدو میرا
یہیں کہیں ہے کسی پھول میں شراب مری
یہیں کہیں ہے اسی خاک میں سبو میرا
ذرا تو دیر سے آیا ہے آبیاری کو
جلا چکا ہے مجھے شعلۂ نمو میرا
وہی چراغ سے جلتے ہیں ہر طرف میرے
وہی غبار سا اڑتا ہے چار سو میرا
بکھر گیا ہے کہیں مجھ میں میرے خواب کا رنگ
چھلک گیا ہے کہیں مجھ میں ہی سبو میرا
تجھے خبر ہی نہیں جیسا چاہتا تھا میں
تو کر چکا ہے وہی حال ہو بہو میرا

■ ■ ■

مطالعہ کو روح کی غذا کہا گیا ہے۔ اچھی کتابیں شخصیت میں نکھار لاتی ہیں اور ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرتی ہیں۔ یہ "ادب" ہی ہے جو ہمیں مہذب بناتا ہے۔ دنیا کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے، جو ہمیں سوچنا اور خواب دیکھنا سکھاتا ہے۔ نوجوانوں میں مطالعہ کے شوق کو بیدار کرنا ہمیں اپنا قومی مشن بنا لینا

اللہ کعبہ اور بندہ

ڈاکٹر آصف محمود جاہ اپنی سماجی خدمات کے حوالے سے کافی معروف ہیں۔ اپنے سفرِ حج کی یہ روداد انھوں نے حرمین الشریفین کے سائے میں بیٹھ کر لکھی۔ جس جذب و مستی، سوز و گداز اور وارفتگی و شیفتگی کے عالم میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، یہ چیز ان کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سچی محبت کا مظہر ہے۔

یہ سفرنامہ تقریباً 400 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سفرِ زیارت اور مناسکِ حج کے ساتھ ساتھ وہ تمام تفصیلات بھی دی ہیں جن سے ایک زائر کو سابقہ پیش آ سکتا ہے۔ گویا سفرنامے کے ساتھ یہ ایک گائیڈ بھی ہے۔

اس سفرنامے کی ایک اپنی خوبصورتی اور انداز ہے۔ جس کا ادراک کتاب پڑھ کر ہی ہوتا ہے۔

کتاب کی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ سرِورق بہت خوبصورت ہے اور بڑے سائز میں ہے۔

ناشر: علم و عرفان۔ قیمت: 700 روپے تبصرہ نگار: محمود جمال

راولپنڈی

راجہ محمد خالد جنجوعہ صاحب نے راولپنڈی ڈویژن کی مختصر تاریخ، اہم واقعات اور معلومات ایک جگہ جمع کردی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راولپنڈی برصغیر پاک و ہند کا ایک تاریخی اور اہم علاقہ ہے، اس کے بارے میں کتاب لکھنا قابلِ قدر ہے۔ کتاب دلچسپ ہے اور قاری کے سامنے راولپنڈی ڈویژن کے حوالے سے مختلف موضوعات سامنے لاتی ہے۔ مثلاً راولپنڈی کی وجہ تسمیہ، جغرافیائی اہمیت، اہم

مقامات اور عمارتیں: فیصل مسجد، دروہ مارگلہ، ٹلہ جوگیاں، قلعۂ نندنہ، قلعہ روہتاس، کوہستان نمک، کلر کہار وغیرہ وغیرہ۔

کتاب پر ملنے کا پتہ نہیں دیا گیا ہے۔ مصنف کے خط میں یہ پتہ درج ہے: مکان نمبر 21، گلی نمبر 21، کورنگ ٹاؤن، اسلام آباد ہائی وے، اسلام آباد۔

کتاب کی قیمت 300 روپے

غبارِ کارواں

اشرف صبوحی ایک بہت بڑے ادیب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تحریر میں ایسی جان ڈال دی ہے کہ ان کی تحریریں ہر وقت زندہ و تابندہ ہیں، جتنی دفعہ پڑھیں ایک نیا ہی لطف آتا ہے۔ ان کی تصنیف "غبارِ کارواں" بھی اس بات کی گواہی دے رہی ہے۔

غبارِ کارواں میں دلی کی چند ایسی شخصیتوں کے خاکے پیش کیے گئے ہیں جو دہلی کے مخصوص معاشرتی تہذیبی مزاج کے چلتے پھرتے نقش تھے۔ اس کتاب میں آپ کی ملاقات

پیر جی سنگھ ساز، کالا بچو، مرزا جرکٹ، ملا تیر وغیرہ، خالہ رحمت، پنچھے والے حافظ جی، گوکل زنانہ اور کئی دوسروں سے ہوگی۔

ناشر: الفتح انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

قیمت: 250 روپے

سید مکی مدنی العربی

"لائف آف محمدؐ - دی پرافٹ آف اللہ" کا پہلا ایڈیشن 1918ء میں انگریزی زبان میں ترکی میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب ای این وینے اور سلیمان بن ابراہیم کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ تھی۔ اول الذکر کا تعلق ترکی سے تھا اور موخر الذکر ایک معروف فرانسیسی مصور تھے جو کم و بیش تیس سال تک شمالی افریقہ میں مقیم رہے۔ کتاب کے مصنفین نے قرآن حکیم اور مستند علمائے دین کے مسلمہ نظریات و عقائد پر انحصار کرتے ہوئے یہ
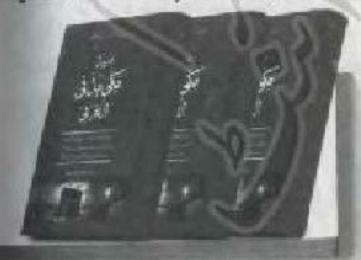
کتاب لکھتے وقت کوشش کی کہ آنحضرت ﷺ کے حیاتِ طیبہ کے حالات و واقعات تحریر کرتے ہوئے اساسی تفصیلات کو محفوظ کر لیا جائے۔

ڈاکٹر تصدق حسین نے بہت خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی غیر ملکی زبان سے ترجمہ ہے۔ کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔

ناشر: رنگل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون 051-5551519

قیمت: 400 روپے

قصہ کوئز، 1

30 رمضان المبارک 256 ہجری کو عظیم محدث کی ازبکستان کے شہر بخارا میں وفات ہوئی۔ آپ کا پورا نام محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ الجوفی ہے۔ سترہ سال کی عمر میں والدہ کے ساتھ حج کرنے گئے تو تحصیل علم کے لیے وہیں اقامت گزین ہو گئے۔ سالوں کی محنت کے بعد ایک ایسی کتاب مرتب کی جس نے آپ کا نام عالم اسلام میں زندہ و تابندہ کر دیا۔ وہ حدیث کی مستند ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ آپ نے اس کتاب کی تدوین و تالیف کے لیے اسلامی دنیا کے متعدد سفر کیے اور تقریباً اسی ہزار اشخاص سے حدیثیں جمع کیں۔ آپ کو چھ لاکھ کے قریب احادیث پورے متن و اسناد سمیت زبانی یاد تھیں۔

1۔ ان محدث کا نام بتائیں وہ کس ملک میں پیدا ہوئے؟
2۔ ان کی کتاب کا نام بتائیں جو قرآن پاک کے بعد دوسری معتبر کتاب مانی جاتی ہے؟

قصہ کوئز، 2

وسطی ایشیا کا اہم ترین اسلامی ملک تقریباً ایک صدی تک روس کے زیر اثر رہنے کے بعد اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور اب ایک آزاد ملک ہے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے بہت سے مراکز اور تاریخی مقامات یہاں واقع ہیں۔ ہندوستان کا پہلا مغل بادشاہ بابر ازبک تھا۔ یہاں کی موجودہ آبادی دو کروڑ 42 لاکھ کے قریب ہے۔ مسلمانوں کی تعداد 88 فیصد ہے جن میں زیادہ ترسنی ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں اس پر سکندر اعظم نے قبضہ کیا۔ آٹھویں صدی کے دوران میں یہاں کے ترک قبائل نے عرب فاتحین کے زیر اثر اسلام قبول کیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں چنگیز خان کی سرکردگی میں منگولوں نے پے در پے حملے کر کے یہ علاقہ کوق ترکوں سے چھین لیا۔ روس نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ان پر بہت حملے کیے، آخر کار انیسویں صدی کے وسط میں روسی افواج نے اس کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

1۔ کون سے ملک کا تذکرہ ہے اور اس کا دارالحکومت کون سا شہر ہے؟
2۔ اس ملک نے روس سے اپنی خود مختاری کا اعلان کب کیا؟

قصہ کوئز، 3

ترکی کا ایک شہر جو براعظم یورپ میں واقع ہے۔ اس کا نام قسطنطین اعظم کے نام پر 11 مئی 330ء کو رکھا گیا تھا۔ اسلامی دور میں اسے قسطنطنیہ کے نام سے پکارا گیا البتہ عثمانی حکمرانوں احمد ثالث سے سلیم ثالث تک سکوں پر اس شہر کا نام لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس شہر پر مسلمانوں کا پہلا حملہ 51ھ/672ء میں یزید بن معاویہ کے ہاتھوں ہوا۔ سات سال کے محاصرے کے بعد وہ ناکام لوٹ گیا۔ اس محاصرے کو اس لحاظ سے شہرت حاصل ہے کہ اس میں حضرت ابوایوب انصاریؓ شہید ہوئے اور شہر کی دیواروں تلے دفن ہوئے۔ 782ء میں خلیفہ المہدی کے فرزند ہارون نے اپنے لشکر کے ہمراہ ایشیائے کوچک سے کوچ کیا اور ملکہ ایرین سے خراج وصول کیا۔ ان نے شہر کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ مگر شہر پر قبضہ کی پہلی کوشش عثمانی سلاطین کے عہد میں ہوئی جب کہ بایزید اول نے 1396ء میں اس شہر کا محاصرہ کیا جو چند ماہ تک جاری رہا تھا۔

1۔ کس شہر کا ذکر ہے اور یہ کس ملک میں واقع ہے؟
2۔ اس شہر میں موجود دو مشہور عجائب گھروں کے نام بتائیں؟

■ ■ ■

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

کچھ باتوں کی درستی ضروری ہے

اردو ڈائجسٹ سے وابستگی بچپن ہی سے ہے لیکن آپ نے اسے جو جدت، تنوع اور خوبصورتی دی ہے اس نے وابستگی کو شوق کے ایک نئے رنگ سے آشنا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کی ٹیم کی تمام کاوشوں کو دو جہاں میں کامیابی کی بنیاد بنا دے۔

محترم قاضی صاحب (جنھیں اب بھی مرحوم نہیں لکھ پاتا)، کے لیے اردو ڈائجسٹ کا گوشہ خاص، واقعی خاص تھا۔ البتہ کچھ منفی پہلوؤں کا ذکر مبالغہ آمیز ہے اور کچھ باتیں واقعاتی طور پر درست نہیں ہیں، ان کی درستی ضروری ہے۔ اگر یہ باتیں شائع نہ ہوتیں تو تحریری طور پر درستی کی جسارت نہ کرتا۔

میرے نام سے شائع شدہ تحریر بنیادی طور پر بیرون ملک سفر کے لیے پابہ رکاب ہوتے ہوئے ایک ادھوری گفتگو تھی۔ اسے تحریر کے بجائے گفتگو ہی کی صورت میں شائع کیا جاتا تو کئی جگہوں پر محسوس ہونے والا تحریری جھول نہ دکھائی دیتا۔

ڈاکٹر کامل الشریف نے سعودی شاہ کی نہیں، شاہ اُردن کی نمائندگی کی تھی۔

صدام حسین کے بارے میں انھوں نے اپنی بات OIC کی سربراہی کانفرنس کے موقع پر نہیں، کویت، عراق جنگ کے موقع پر اسلامی تحریکوں کے مصالحتی وفد کے دورۂ مشرق وسطیٰ کے موقع پر کہی تھی۔ OIC کانفرنس اس کے کئی سال بعد ہوئی تھی اور اس کا ذکر صرف ڈاکٹر کامل الشریف کے تعارف کے ضمن میں آیا تھا۔

محترم قاضی صاحب کے ہمراہ متعدد بار افغانستان جانے کا موقع ملا۔ جس سفر کا ذکر اس ملاقات میں تھا اس

میں ہم جناب حکمت یار صاحب کے مسکن چہار آسیاب گئے تھے۔ گولہ باری ہو رہی تھی، کوئی گولہ یا راکٹ بھی آ سکتا تھا۔ لیکن ہم نہ تو محصور تھے اور نہ گرفتاری کا کوئی امکان تھا۔ قاضی صاحب نے عربی زبان کے طالب علم کی حیثیت سے یقیناً اس ناچیز کی بہت حوصلہ افزائی کی، لیکن یہ کہنا کہ "قاضی صاحب کے ساتھ میرا تعلق عربی زبان بولنے کی وجہ سے تھا" حقیقت کے منافی ہے۔ میں نے ہمیشہ قاضی صاحب کے ساتھ ایک مشفق باپ اور سفر و حضر میں دن رات ساتھ رہنے والے بیٹے جیسے تعلق کی لذت پائی ہے۔

قاضی صاحب نے مجھے کبھی "غفار" کہہ کر نہیں پکارا ہمیشہ عبدالغفار کہتے تھے۔ "غفار" کہنے پر وہ بعض اوقات کہنے والے کو ٹوک بھی دیتے۔ ذرا ہمارا بھائی نور اسلم کے شائع شدہ ارشادات ملاحظہ فرمایئے:

میرے بھائی جمعیت طلبہ عربیہ کا سابق بندہ، جمعیت کا سابق منتظم اعلیٰ ہے، ان کے دروس و خطبہ جات پر ان کی جتنی حوصلہ افزائی محترم قاضی صاحب نے کی، شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ ہمارے وہ ساتھی بعض اوقات اب بھی خطبہ دیتے ہیں اور لگتا ہے خود امیر جماعت بھی سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔

پھر مصری ڈیلی گیشن؟ آپ کو معلوم ہے کہ ذمہ داری کے باعث بیرون ممالک سے آنے والے وفود کا سب سے زیادہ علم راقم کو ہونا چاہیے اور ہوتا ہے۔ کوئی ذرا بتائے یہ کون سا وفد تھا؟ کب آیا؟ کہاں آیا؟ اور کب محترم قاضی صاحب کو ان سے ملنے نہیں دیا گیا؟

معذرت چاہتا ہوں، نور اسلم صاحب بھی میرے عزیز بھائی ہیں لیکن ہمیں ایسی نازک باتیں کرتے اور لکھنے سے پہلے ضرور سوچ لینا چاہیے۔

(عبدالغفار عزیز، ناظم شعبہ امور خارجہ)

قوم کی بیٹی کی ہی سن لیں

جیسے ہی ٹی وی اسکرین پر ہڑتال کی خبر آئی ہمارے بچوں نے ایک ساتھ ہی "یاہو" کا نعرہ لگایا اور سب ہی اگلے دن کی ہونے والی چھٹی پر کرنے کے کام گننے لگ گئے۔ کسی نے ٹی وی پر یہ دیکھنا گوارا تک نہ کیا کہ ہڑتال کی وجہ کیا ہے؟ وہ سانحہ کوئٹہ جس میں متعدد لوگوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں لوگ سڑکوں پر روتے بلبلاتے اپنے پیاروں کو ڈھونڈتے رہے۔ کراچی میں روز لوگ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سب اپنے معمول کے مطابق صبح گھر سے نکلتے ہیں اور شام کو واپس آ جاتے ہیں اور جو نہیں لوٹتے ان کے لیے تھوڑے دن رو کر سوگ منا کر واپس معمول پر آجاتے ہیں۔ فرق پڑتا ہے تو صرف میت کے گھر والوں کو، اس کے بچوں کو اس کی بیوی کو اس کے بوڑھے ماں باپ کو اور بہن بھائیوں کو کہ وہ روتے رہتے ہیں، بددعائیں دیتے رہتے ہیں مگر کوئی ان قاتلوں کو نہیں پکڑتا۔ اگر کوئی پکڑتا ہے تو ہڑتال ہو جاتی ہے اور پھر بھی عوام کا ہی نقصان کیا جاتا ہے۔ توڑ پھوڑ ہوتی ہے، اسکول بند ہو جاتے ہیں، ہفتے میں دو دن تو معمول کے مطابق سرکاری چھٹی ہوتی ہے، تین دن اسکول ہڑتال اور حالات کی خرابی کے باعث بند کرنا پڑتے ہیں اور باقی دو دن جو بچے اسکول کی نذر کرتے ہیں تو ان میں سے ایک دن ٹیچر کا دل نہیں چاہتا پڑھانے کو اور دوسرے دن بچوں کا موڈ نہیں بنتا پڑھنے کو......؟

کاش یہ قتل و غارت کرنے والے، مرنے والوں کے دکھ کا احساس کر سکیں۔ پیچھے رہ جانے والوں کی ووٹوں کو شمار کریں۔ حکمرانوں کا تو اب بیان بھی کم کم آتا ہے۔ قوم کی اس بیٹی کی التجا ہی سن لیں کہ ہم بھی اپنے تعلیمی اداروں اور شہروں میں سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

(قرۃ العین مریم، گلو گھر آباد ملیر کالونی کراچی)

براہ راست سوالات

آپ نے پھر ایک اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ میں نے خود اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے ایک ٹین ایجر کو خودکشی کرنے سے روکا جو کہ اپنی والدہ کی معمولی سی بات کی وجہ سے ایسا قدم اٹھانے لگی تھی۔

چند تجاویز حاضر خدمت ہیں:

اردو ڈائجسٹ کی فہرست، اگر مکمل ترتیب سے اور فونٹ سائز ذرا بڑا کر کے ہر تحریر کی تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ ہو تو مناسب ہوگا۔

اگر آپ اعلان فرما دیں کہ قارئین آپ سے جو سوالات پوچھنا چاہیں پوچھ لیں۔ پھر ان کے جوابات اردو ڈائجسٹ میں شائع کریں تو قارئین کو بہت فائدہ ہوگا۔

(محمد افضل کاسی، کوئٹہ)

(دونوں تجاویز مناسب ہیں۔ فہرست پر اسی شمارے میں عمل ہو گیا۔ سوالات کی دعوت عام ہے۔ جواب میں جو وال دیے ہو سکا حاضر کر دیں گے۔ ویسے ہم نے طے کیا ہے کہ فیس بک پر بھی آپ روزانہ تین بجے سے چار بجے تک براہ راست بات کر سکیں گے)

انڈین پروگرام دکھانے میں چینل والوں کا مقابلہ

کاش! ہمارے چینل والے بھی یہ پڑھ لیں اور جس بے حیائی کا سیلاب ان کی وجہ سے ہماری نوجوان نسل کو بہا کر لے جا رہا ہے اسے روک سکیں۔ "ایکسپریس، جیو، اے آر وائی، اور ہم" تو مقابلے پر انڈیا کے ڈرامے اور فلم شوز، ڈانس کے مقابلے صبح و شام یوں دکھا رہے ہیں جیسے ان چینلز کے قیام کا یہی واحد مقصد تھا۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ پاکستانی ٹی وی اداکاروں نے بھی فلموں والے آئٹم سانگز پر ڈانس شروع کر رکھے ہیں۔

(فرخندہ نزہت، چدو)

ڈاکٹر حسن البنا کے لیے خراج تحسین

مورخہ 19-02-2013 کو صبح ساڑھے سات بجے سینے کی درد کی شدت کی وجہ سے تڑپتا اور بلکتا پنجاب کارڈیالوجی کی ایمرجنسی میں پہنچا۔ وہاں تشخیص ہوئی کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحبان اور عملہ کے دیگر ارکان نے میرے علاج کی طرف جس مستعدی، خوش اسلوبی اور خوش خلقی سے توجہ دی۔ اس پر آپ کی وساطت سے ڈاکٹر حسن البنا سمیت قابل قدر افراد کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بے پناہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔

یہ دیکھ کر میرا دل مطمئن اور سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میرے پیارے ملک کے ایک ادارے کے ذمہ دار افراد اپنے فرائض پوری توجہ سے ادا کر رہے ہیں۔

(حافظ افروغ حسن، اچھرہ لاہور)

گلزار کی ہجرت

گلزار کی ہجرت یقین کیجیے رات آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ جی چاہا اٹھوں اور کچھ لکھ ڈالوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ شاید میں اپنے احساسات تحریر میں سمو نہ سکوں پھر بھی لکھ ڈالا۔

پڑھ لیجیے اگر اچھا لگے تو مجھے بھی اپنے کنبے میں

شامل کر لیجیے۔ حفیظ جالندھری کی ''قلندرانہ کاوشیں'' اپنی مثال آپ تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مجاز، فیض، فانی پر بھی کچھ لکھا جائے۔ یہ شخصیات پر لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے بہت خوبصورت ہے۔

(''قاضی حسین احمد'' کی شخصیت پر بہت عمدہ تحریریں چھپی ہیں) (مسز ثریا خانم۔ لاہور)

سالوں پرانا کوتا ختم ہوا

چند سال قبل میرے اقوال لطیفے وغیرہ ضرور شائع ہو جاتے تھے۔ لیکن اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے کیا وجہ ہے ہر تحریر ردی کی ٹوکری کی نذر کر دی جاتی ہے۔ امید ہے یہ خط بھی اسی سلوک کا مستحق ٹھہرے گا۔

(صباحت صباح، چناری آزاد کشمیر)

(بہنا جی! ہمیں تو یاد نہیں پڑتا، آپ کی کوئی قابلِ اشاعت تحریر حالیہ مہینوں سے ہماری نظر سے گزری ہو۔ آپ عمدہ اقتباسات، لطائف، دلچسپ واقعات ضرور بھجوائیے۔ ہمارے ہاں کتنی تحریریں چھپتی ہیں۔ ان میں اکثر پہلی بار لکھنے والوں کی ہوتی ہیں۔ نوجوانوں کو تو ہم پہلی ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن سالوں پہلے بھیجا ہوا آپ کا ''کوتا'' اب تو ختم ہو چکا ہوگا ناں۔)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ماہر اقبالیات تھے

دسمبر کے شمارہ میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بارے میں ''سیاسی رہنما'' لکھا گیا تھا۔ پنڈت تلوک چند محروم اردو کے معروف شاعر استاد اور ادیب تھے۔ میانوالی کے رہنے والے تھے۔ نور جہاں کے مزار پر ان کی معروف ترین نظم ہم نے بچپن میں پڑھی تھی۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان بھارت چلا گیا۔ انھیں تلوک چند محروم کے صاحبزادے پروفیسر جگن ناتھ آزاد ماہر تعلیم، ماہر اقبالیات ہیں۔ پاک و ہند کے بڑے شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پاکستان کی مرتب، تقاریب میں شرکت کے لیے آ چکے ہیں۔ جب بھی لاہور آتے تھے مزار اقبال پر ضرور حاضری دیتے تھے۔ اب سے تقریباً بائیس برس قبل وفات پا چکے ہیں۔ کئی برس تک وہ مقبوضہ کشمیر کی جموں یونیورسٹی میں قائم اقبال چیئر کے سربراہ پروفیسر تھے اور اقبالیات کا مضمون بھی پڑھاتے تھے۔ فیصل آباد (سابق لائل پور) کی کاٹن ملز میں منعقد ہونے والے آل پاک و ہند مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ ایک مرتبہ علامہ اقبال کے مزار پر حاضری کے دوران ان پر رقت طاری ہو گئی اور اقبال کے حضور ایک معرکۃ الآرا نظم لکھی تھی جس کا ایک مصرع ابھی تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ ''میں آ رہا ہوں مزار دیار غالب سے'' جموں یونیورسٹی میں اقبالیات پڑھانے کے عرصہ کے دوران شہر سے باہر نکل کر سیالکوٹ شہر کی روشنیاں رات کو دیکھا کرتے تھے اور کہا کرتے کہ وہ میرے اقبال کا شہر ہے۔ میں نے بھی ان کی اقبال سے والہانہ وابستگی سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی اور ان کو ارسال کی تھی۔ ایک اخبار کی ادارت کے دوران میں نے ان کو خط لکھا تھا کہ بچوں کے لیے کوئی نظم ارسال کریں۔ کمال شفقت سے انھوں نے سات آٹھ صفحے کی نظم ارسال کی تھی جو شائع کرا دی گئی تھی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا تعارف ہی ماہر اقبالیات اور استاد ادبیات کا ہے۔

(ریاض احمد پرواز، ریڈیو پاکستان۔ فیصل آباد)

مجھ کی ضرورت

جناب ایوب خاور اور وصی شاہ کے گلزار صاحب پر مضامین ''خصوصی گوشہ'' میں پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ دونوں مضامین نہایت دلچسپ، معلوماتی اور وقیع ہیں۔ مذکورہ مضامین میں گلزار کی شخصیت مزید اجاگر ہوتی ہے۔

ایک جگہ تصحیح کی ضرورت ہے جو مہربانی کر کے فرما لیجیے گا۔ صفحہ 179 پر ایوب خاور صاحب کے مضمون میں غلطی سے میرا تعلق ''معروف نوچی گھرانے'' سے کیا گیا ہے۔ دراصل میرا تعلق چنیوٹ کے ایک تاجر گھرانے سے ہے۔ شکریہ (ڈاکٹر ظفر حسن۔ لاہور)

دو تجاویز

اردو ڈائجسٹ کا ہر سلسلہ اور ہر تحریر پُر اثر اور مفید ہوتی ہے۔ ہر مرتبہ اس کا بہترین اور عمدہ گلدستہ تیار کرنے پر آپ اور آپ کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔

دو تجاویز پیش خدمت:

1۔ ختم نبوت کے موضوع پر ایک مستقل سلسلہ یا کم از کم اس موضوع پر محمد بشیر جمعہ کی کتابوں سے مفید اقتباسات ہونے چاہئیں۔

2۔ فن معاملات کے نفسیاتی اصولوں پر مبنی واقعات، سیرت رسول ﷺ سے لے کر شائع کرنے کا ایک مستقل سلسلہ ہونا چاہیے۔ جن میں آپ ﷺ نے یہ اصول عملی طور پر تعلیم فرمائے ہیں۔ جو کہ ڈاکٹری میں، تجارت میں، وعظ میں، دعوت دین میں، غرض ہر شعبہ زندگی میں لوگوں کے دلوں کو جیتنے اور ان کے دلوں میں اپنی محبت ڈالنے میں کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔

(محمد عاطف سلیم چارسدوی، جامعہ دارالعلوم کراچی)

(آپ خود سے ابتدا کریں۔ کوئی عمدہ سی چیز بھجوائیں)

تازہ ترین پول کے نتائج

urdudigest.pk کے نام سے اردو ڈائجسٹ کے ویب پیج پر باقاعدگی سے پول منعقد ہوتے ہیں۔ حالات حاضرہ اور دیگر موضوعات زندگی پر آن لائن ووٹنگ کے ذریعے آپ اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں گزشتہ ماہ کی گئی پولنگ کے نتائج پیش خدمت ہیں۔

کیا آپ میٹرو بس سے مطمئن ہیں؟

اس دفعہ آپ اپنا قیمتی ووٹ کس جماعت کو دیں گے؟
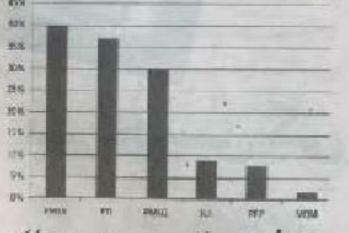
آپ فیس بک پر بھی ہمارے ساتھ رابطہ قائم کر کے دلچسپ سرگرمیوں کا حصہ بن سکتے ہیں۔ روزانہ اپ لوڈ ہونے والی معلومات، اشعار سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

بے حسی کی گہری نیند

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

urdudigest.pk

akhterabas@ymail.com

اس کے ہاتھ اور پاؤں لرز رہے تھے، خوف سے، شرم سے، بے عزتی کے احساس سے یا بے بسی سے، یہ کہنا بے حد مشکل ہے۔ بے شک اس کا باپ اس کے ساتھ تھا۔ ایک ٹیکسٹائل مل میں اعلیٰ عہدے پر فائز باپ جو سیکڑوں ہزاروں لوگوں کا لباس بنوانے کے عمل میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اس لمحے خود بے لباسی کی سی خواری کا مجسم نمونہ بنا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے میرے سامنے جو لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ بچپن کی عمر کب کی عبور کر چکا تھا۔ اسے نوعمر بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور نوجوان بھی نہیں۔ یہ ٹین ایج کے وہ خوبصورت دن تھے جو بدصورتی نے اس کے وجود کو کھا رہے تھے۔ ایسے میں بے پناہ محبت کرنے والا بے خبر باپ، اپنے بیٹے کی مدد کو نہ آتا تو وہ خودکشی کر چکا ہوتا۔ شادمان کے ہائیو کلینک میں ممتاز سائیکیاٹرسٹ پروفیسر ارشد جاوید سے دونوں باپ بیٹے کو ملوانے کے بعد واپسی پر میں سوچ رہا تھا: "کتنے باپ ہوں گے جو اپنے بیٹوں سے تعلق اور محبت کا مطلب جانتے ہوں گے اور کتنے ہوں گے جو اپنے جسم اور جگر کے ٹکڑوں پر آئی اس خوفناک آزمائش سے بے خبری کے باعث ان کی مدد کرنے سے قاصر ہوں گے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے اس باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی کے دو جملے کہنے چاہے تھے اور وہ جو ایک کامیاب بزنس مین تھا، وہ جو اپنی مل میں بیسیوں لوگوں کا افسر تھا اور ان کو سنبھالتا تھا۔ اس کے لیے اپنا آپ سنبھالنا اور اپنے آنسو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔

"یہ مشکل وقت گزر جائے گا۔ ہمت اور حوصلے کے ساتھ دعا اور محبت کو اپنا سہارا بنائیے گا، خدا کا شکر کریں آپ کو خبر ہو گئی اور آپ اس کے علاج اور مدد

کے لیے گھر سے نکل آئے۔ کتنے بے چارے تو اپنے سرپرستوں کی لاپروائی اور بے نیازی کے ہاتھوں اس جہنم کا ایندھن بنے رہنے پر مجبور ہیں۔ وہ جلتے، روتے ہیں اور کوئی انھیں اس آگ سے نکالنے نہیں آتا، یہاں تک کہ وہ اسی کالک کا حصہ بن جاتے ہیں۔"

"فور جوان" ایک مشہور اور مہنگا انگریزی رسالہ ہے اور بزنس سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ لوگوں کے تذکروں سے بھرا ہوتا ہے۔ کئی سال پہلے اس نے لکھا تھا "بچوں پر جنسی تشدد ایک ایسا گناہ ہے، جس کے کئی رخ ہیں۔ یہ گناہ تعلقات کے حوالے سے بھی بے گناہ اور اکثر جنسی گناہ کے مرتکب لوگوں سے سرزد ہوتا ہے اور عام طور پر قریبی لوگ ہی اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔"

دنیا کے معدودے چند ملکوں کو چھوڑ کر جن میں جاپان، روس اور چین شامل ہیں، بچے ہر جگہ اس کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی عزت نفس ہی نہیں، رشتوں پر اعتماد بھی جاتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں 80 سے 95 فیصد تک یہ جرم اپنوں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ اپنے عزیز، خونی رشتہ دار، کزن، جاننے والے، استاد، دینی معلم، ان میں کوئی بھی تو غیر نہیں ہوتا۔

ڈیوڈ فنکلر کی ریسرچ کے مطابق امریکا میں 16 فیصد مرد اور 27 فیصد عورتیں اپنے بچپن میں جنسی تشدد اور بدسلوکی کا زہر چکھتی ہیں۔

چندی گڑھ جو ہندوستان کی دو ریاستوں کا دارالحکومت ہے، کچھ عرصہ قبل وہاں پریس کلب میں بیٹھے ایک صحافی کمل جیت نے (جو Rahi کا ممبر تھا، یہ بھارت میں کام کرنے والی ایک تنظیم Recovering and Healing from incest کا مخفف ہے، جو بے حد متحرک اور موثر ہے) خود بتایا تھا کہ صرف دہلی شہر کی تنظیم نے سائنسی بنیادوں پر ریسرچ کنڈکٹ کی تو پتا چلا کہ کالج پہنچنے والی 78 فیصد لڑکیاں اور 70 فیصد لڑکے اپنے خونی رشتوں کے ہاتھوں بچپن میں اپنے ہی گھروں میں اپنی عزت گنوا بیٹھتے ہیں۔ یعنی چار میں سے تین لڑکیاں اس عذاب میں سے گزرتی ہیں، جن کا ان کے سرپرستوں کو بھی علم نہیں ہوتا۔ ہندو مت کا عقیدہ تو 9 درگاہ کا ہے کہ آپ 9 بچوں کو کھانا کھلا دیں تو بھگوان یا خدا آپ پر رحمت کی برسات کر دے گا، مگر ہمارے لوگ اپنی تہذیب اور دھرم کی تعلیمات کو چھوڑ کر مغرب کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ جیسے جانور بھاگتے ہیں، ان کی فلمیں، ان کے کپڑے، ان کا طرزعمل اور انھوں نے تو بچوں کے ساتھ زیادتی و ظلم کو بھی بزنس کا حصہ بنا لیا ہے۔ بچوں کی غلیظ فلمیں بناتے ہیں، بیچتے ہیں، دیکھنے والے جانور کیوں نہیں بنیں گے۔"

کمل جیت نے جب یہ کہا تو ہم کئی ساتھی حیران ہی رہ گئے کہ "ہمیں خطرہ آپ سے نہیں، مغرب اور اس کی تہذیب سے ہے، جو ہمارے دھرم اور کرم سب کو لپیٹ ڈالے گی۔ آپ ہمارے ساتھ اس معاملے میں کیوں نہیں مل کر چلتے کہ گلوبل ولیج کے نام پر ہر چھوٹے ملک اور تہذیب سے اس کا اپنا سب کچھ چھنتا جا رہا ہے۔ ہر بری چیز بری لگنی بند ہو رہی ہے۔"

بچے کسی بھی ملک اور معاشرے کے ہوں، وہ پھول جیسے ہی ہوتے ہیں، اگر کوئی جنسی درندہ انھیں روندے اور مسل ڈالے تو دکھ اور تکلیف کا احساس آفاقی طور پر نہیں، ذاتی طور پہ ہونا چاہیے۔ تبھی انسان اپنے پیاروں کا سوچتا ہے، ان سے بات کرتا ہے۔ ان کی

حفاظت کا انتظام کرتا ہے۔

اخبارات میں پہلے کبھی کبھار خبر ہوتی تھی، اب روزانہ جنسی زیادتی، اجتماعی زیادتی، بدفعلی کے واقعات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اور یہ بھی وہ واقعات ہوتے ہیں، جو کسی اسکول یا مذہبی تعلیمی ادارے میں رونما ہوتے ہیں اور رپورٹ ہو جاتے ہیں۔ وہ سارے واقعات جو گھروں میں جنم لیتے ہیں، والدین کی بے خبری، بے نیازی اور دانستہ چھپانے کے باعث اسی اندھیرے میں دم توڑ دیتے ہیں اور بچے کو عمر بھر کے لیے بے عزتی، بے توقیری اور بے اعتمادی کی دلدل کا باسی بنا دیتے ہیں۔

ہمارے ہاں عام خیال یہ ہوتا ہے کہ جو واقعات اخبارات یا رسائل میں رپورٹ ہوتے ہیں، وہ چھوٹے شہروں اور غریب بچوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ہمارا یا ہمارے بچوں کا ان سے کیا تعلق کیا واسطہ؟

ہم جانتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو یہ کس قدر ناپسند ہے۔ اس کو غیر فطری اور بدفعلی اور لواطت کا نام دیا گیا ہے۔ ایک نبی کی امت لواطت کے جرم میں زمین میں زندہ گاڑ دی گئی۔ مذہب نے منع کیا۔ ملک اور معاشرے نے بُرا جانا۔ پاکستان کے قوانین کے تحت غیر فطری جنسی فعل پر 25 سال کی سزا ہو سکتی ہے۔ ناجائز تعلقات کے لیے اغوا، جسم فروشی کے لیے بچوں کی خرید و فروخت کی سزا 40 سال ہے۔ اسلامی قوانین کے مطابق بدفعلی کے مجرم کی سزا موت ہی نہیں سنگساری سے موت ہے۔ بے عزتی، رسوائی کے ساتھ اذیت ناک موت کہ ایسا مجرم اتنی ہی سخت سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

سزاؤں سے اگر انسان نے سمجھنا اور سلجھنا ہوتا تو کتنی آسانی ہوتی۔ اس نفسیات اور خطرے کی گہرائی کا اندازہ کیا جائے تو یہی بات ہے۔ راتوں کی نیند اڑ جائے۔

معصوم بچوں سے بدفعلی کے واقعات کی کثرت کے باعث امریکا میں باقاعدہ مہم چلی اور اس بات کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ مائیں تب تک نوکری سے رخصت لیں، جب تک بچہ کم سے کم 5 سال کا نہ ہو جائے اور اچھے بُرے کو کسی حد تک سمجھنے نہ لگے۔

ہمارے ہاں سمجھ دار مائیں اپنے بچوں کے کمروں کے دروازے کھلے رکھواتی ہیں۔ مہمانوں کے آنے جانے پر اپنے بچوں کی ذمہ داری اپنے سر سے اتار کر ان کے سر پر نہیں ڈال دیتیں۔ بڑی عمر کے دوستوں سے، نوکروں، معلموں، کزنوں اور عزیزوں سے ملاقاتوں پر نگاہ رکھتی ہیں اور اپنے بچوں سے اس بارے میں کونسلنگ ہمیشہ سے پڑھے لکھے والدین کا معمول رہا ہے، مگر جب سے بچے نوکروں، گھر میں رکھے گئے عزیزوں، ٹیوٹروں اور معلموں کے حوالے ہوئے ہیں، ان جنسی جرائم کا گراف کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے۔

کیا ہمیں حالات کو جوں کا توں تسلیم کر لینا چاہیے اور اس بدصورتی کا الزام دوسروں کو دے کر اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جانا چاہیے۔ پہلے جنسی زیادتی اور پھر عدم تحفظ کا شکار بچہ کن حالات سے گزرتا ہے۔ کیا اس پر توجہ کی فوری نگاہ نہیں ڈالنی چاہیے؟ اس بے چارے کو جنسی مجرموں کی دھمکیوں کا اکیلے سامنا کرنے اور بے بسی کی دلدل میں دھنسا رہنے دیا جائے۔ اپنی مدد اور محبت سے اس کو اس عذاب سے نہیں نکالنا چاہیے؟

کیا خاموشی، پردہ پوشی اور بچے کو ڈانٹ ڈپٹ ہی اس کا آسان حل ہے یا اپنے پھول سے بچوں کی نگہداشت، نگرانی، کونسلنگ اور سرپرستی کا مضبوط احساس دلایا جائے، جو انھیں ایسے کسی خطرے میں اکیلا ہونے اور ڈر ڈر کر جینے، بے اعتمادی، بے عزتی کے زخم زخم احساس سے بچا لائے اور حفاظت کے سائے سے سرفراز کرے۔

بچے کی تنہائی، والدین کی بے خبری اور خبر نہ دینے کا احساس مجرموں کی وہ مضبوط پناہ گاہیں ہیں۔ جس کو والد کی توجہ اور سمجھ دار نگاہ ہی توڑ سکتی ہے۔ جن کے لیے عمر بھر کماتے ہیں، وہ کمائی ہی لٹ گئی تو دولت کے ڈھیر کس کام کے؟

وہ بچہ جو اپنے باپ کے ساتھ میرے پاس آیا تھا، نفسیاتی مریض بن کر ایک دوسری عذاب بھری زندگی شروع کرنے والا تھا کہ اس کے والد نے اپنے بچے کی ویران نگاہوں اور خوف زدہ شناسوں کو محسوس کیا۔ وہ بے چارہ گھر کے ملازم کے ہاتھوں ہی نہیں لٹا، اپنے والد کے ایک قریبی عزیز کی ہوس کا شکار بھی بنا، جو اسی گھر میں نوکری کی تلاش میں آ کر ٹھہرا ہوا تھا۔ ساری رات گندی فلمیں دیکھتا، مفت کی کھاتا اور بدلے میں بچے کو پڑھانے کی ڈیوٹی یوں ادا کرتا کہ اس کی عزت سے کھیلتا۔ اسے کبھی جان سے مارنے کی دھمکی دیتا اور کبھی والد کو بتانے کے نام پر دھمکاتا۔ اس بچے نے یہ عذاب کتنی دیر سہا اور گھر میں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ نوکر کو خبر ہوئی اور اس نے بھی وفاداری اور خدمت کے نام کو داغ دار کیا۔ جس روز یہ بات والد کو معلوم ہوئی، اس روز اس اعلیٰ خاندان کے گھٹیا مہمان نے اپنے ایک جاننے والے کو اسی سلسلے میں مدعو کیا ہوا تھا۔

ایسے واقعات غریب بستیوں میں نہیں پوش علاقوں میں کثرت سے ہو رہے ہیں کہ ماں اور باپ دونوں کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں اور بچے نوکروں یا قریبی عزیزوں اور ٹیوٹروں کے حوالے رہتے ہیں جہاں وہ بے چارے ان جنسی درندوں کا آسان شکار ثابت ہوتے ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بحیثیت قوم ہی اس جرم کی موجودگی کو نظر انداز کرنے کے مجرم بن رہے ہیں، کیونکہ یہی بات مجرموں کو ہمت اور تقویت دیتی ہے۔ پردہ پوشی اور کسی سزا کے بغیر معافی، مجرموں کو مزید جرم پر اکساتی ہے اور نئے مجرم بناتی ہے۔

مذہب اس مسئلے کو بہت کھل کر ایڈریس کرتا ہے، مگر ہماری تہذیب اور معاشرت ہمیں اس پر بات کرنے سے روکتی ہے۔ ہم کیسے مہذب اور تہذیب یافتہ ہیں کہ اپنی سب سے قیمتی متاع کو یوں بے امان چھوڑ کر پورے اطمینان سے زندگی جیتے، پیسے کماتے اور ان پر خرچ کرتے ہیں کہ جو ہمارے روپوں سے زیادہ ہماری محبت، توجہ اور احتیاط کے منتظر ہوتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ کمائے گئے روپوں سے عزیزوں، ٹیوٹروں اور نوکروں کو اپنی قیمتی متاع کی حفاظت سونپ کر سمجھ داری اور پدرانہ شفقت کا ثبوت دے چکے ہیں۔

ایک باپ کا رونا اور اس کے خوبصورت اور معصوم بیٹے کا لرزنا، شرمساری سے آنکھیں نہ ملانا، مجھ سے بھلایا نہیں جاتا۔ کتنے والد اتنے سمجھ دار ہوں گے کہ لٹنے کے بعد پھر سے جینے کی آس دلاتے، ہمت بندھاتے، اپنے بے گناہ بچے کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور کونسلنگ اور علاج کے لیے معالج سے مشورہ کرتے ہیں، اپنی محبت اور سرپرستی کا احساس دلاتے ہیں، اسے بے عزتی، بے اعتمادی اور بے توقیری کی دلدل سے نکالتے ہیں۔

چاروں طرف بے حسی کی گہری نیند ہے جاگنا تو ہوگا ہی!

■■■